

# گوشہٴ عافیت

شکفتہ بھٹی



پاکستانی پوائنٹ

# گوشہ عافیت

شگفتہ بی

القریش پبلی کیشنز

سرکسر روڈ چوک اُردو بازار لاہور

فون: 042-37668958 , 042-37652546

www.alquraish.com E.mail: info@alquraish.com

خوب سے خوب تر کتابوں کی اشاعت  
جدت اور معیار کے ساتھ

با اہتمام..... محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول ..... 2012ء

مطبع ..... نیر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ ..... کلائمکس گرافکس

قیمت ..... 350/- روپے

تکلفتہ بھٹی ناول نگاری کی تکنیک سے بخوبی واقف ہیں۔ ناول کے مکالمے، کردار نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری اور واقعات کا اُتار چڑھاؤ تکلفتہ بھٹی کے ناول کے فنی رموز سے واقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ناول لکھنا محنت طلب کام ہے اور گوشہٴ عافیت، تکلفتہ بھٹی کی محنت کا امین ہے۔ اس ناول کے ذریعے سے ناول نگار نے معاشرے میں موجود تضادات کو بیان کیا ہے۔ یہ ناول عورت کی ایک مرد (جو اس کا شوہر بھی ہو) سے محبت اور اس کے مزاج کا عکاس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ناول بھی تکلفتہ بھٹی کے دیگر ناولوں کی طرح خواتین میں خوب مقبول ہوگا۔

یہ ناول دلچسپ تو ہے ہی، ساتھ ساتھ زبان کے اعتبار سے بھی اچھا تاثر قائم کرتا ہے۔ اس کے بیان میں روانی اور زبان میں سلاست ہے۔ ملتان کے لکھاریوں میں اگرچہ ناول نگار مردوں کی کمی ہے مگر خواتین نے یہ کام خوب انجام دیا ہے اور اس کی کوپورا کر دیا ہے۔ ان میں ایک نام ”تکلفتہ بھٹی“ کا ہے۔ ان کا تازہ ناول ”گوشہٴ عافیت“ موضوع، کہانی اور ناول کی تکنیک کے اعتبار سے ایک قابلِ ذکر اور بہترین ناول ہے۔ یہ ناول اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تکلفتہ بھٹی کا اسلوب دراصل قاری کو پوری طرح سے جکڑے رکھتا ہے اور یہی اس کے کامیاب اور بہترین ناول ہونے کی دلیل ہے۔

”گوشہٴ عافیت“ اپنے اصل معنوں میں قاری کے سامنے یوں آتا ہے کہ اس کے احساسات پر ثبت ہو کر رہ جاتا ہے کہ حقیقی خوشی اور سکون اور اطمینان قلب صرف ذکرِ الہی اور عشقِ نبی ﷺ میں ہی ہے۔ ناول کا انجام اصلاحی ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین بھی اسے دلچسپی سے پڑھیں اور پسند کریں گے۔

ڈاکٹر پروفیسر محمد امین

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی۔ ملتان

شام کے پانچ بجنے کو تھے۔ جنوری کے آخری ایام تھے۔ سردی اپنے عروج پر کبھی ایک دم سے بادل کھر جاتے تو کبھی بارش برسے لگتی، اور کبھی تیز ہوا چلتی، اور بادلوں کا منہ ادھر ادھر کر کے دھوپ کا منہ دکھا دیتی ہے۔ اس آنکھ پھولی میں ہی سارا دن بیت گیا ایک اور اداس اور بے رنگ دن۔

میں اپنی کتابیں سمیٹ کر کھڑکی میں آگئی۔ ہمیشہ کی طرح میں نے اپنی دونوں کہنیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھیں اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں پر رکھا کر آسمان کو ہنسنے لگی۔ اب بارش بند ہو چکی تھی، مگر آسمان پر پھر بھی بدیلیوں کے ٹکڑے ادھر ادھر مٹھلا رہے تھے۔ اور سورج بھی جیسے ٹھنڈا اور ٹھنڈا ہوا دکھائی دے رہا تھا، جیسے سرد ہوا سے بچ کر مشرب کے لحاف میں دبک رہا ہو۔ زرد زرد سا ٹھنڈا سورج.....

میں اسے غور سے دیکھنے لگی، مجھے یہ اچھا لگتا تھا، اداس اور خاموش بالکل اپنی طرح..... اور اس کی اور میری روش بھی تو ایک جیسی تھی، ایک ہی ڈگر پر چلنا اور اسی کے آخر پر تھک ہار کے منہ چھپا کے سو جانا، کتنے یکساں تھے ہم دونوں۔

میرا اداس دل اور بھی ملد رہا ہو گیا اور میں اپنی آنکھوں میں اُمڈ آنے والی بارش کو بالکل نہ روک سکی۔

”کیا ہوں میں اور میری زندگی..... یوں نہ کرو یوں نہ کہو ایسے نہ پہنؤ ایسے نہ رہو، بس ماما جان کی نصیحتیں سنؤ اور پھر دل چاہے نہ چاہے ان پر عمل بھی کرو..... بس ایک ہی راستہ ہے اس پر چل کر گھر سے باہر جاؤ اور ٹھیک اسی راستے سے واپس گھر میں آ جاؤ..... اس سورج کی طرح.....

میں نے اپنی آنکھوں کی دھند کو ہتھیلیوں سے مٹ کر صاف کیا اور سامنے زمین میں دھنستے سورج کو دیکھا جیسے وہ بھی دکھی ہو اور کہہ رہا ہو۔

”تم سچ کہتی ہو عصمہ۔“ میں عصمہ ممتاز الحسن اس الوداع کہتے سورج کی طرف لپکتا چاہتی تھی تاکہ اس سے گلے کر خوب روؤں اتنا کہ میرا دل اور اس کا ملگجا چہرہ دونوں صاف ہو جائیں۔ میرا دل چاہتا تھا کاش میں کوئی پرندہ ہوتی اور پھر سے اس کھڑکی سے اڑ کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاتی۔ اوپر اور بہت ہی اوپر جہاں سے مجھے نہ زمین نظر آتی اور نہ میرا گھر.....

مجھے اپنے گھر سے فرار چاہیے تھا..... وہ گھر کہاں تھا اک قید خانہ تھا۔ اور..... اور ماما اس کی جیلر تھیں..... ”ہاں میری ماما!“ میں اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگی..... وہ ہر ایک سے اتنی اچھی تھیں۔ اتنی نرم خو، درگزر کرنے والی۔ مگر میرے بارے میں وہ بے حد سخت تھیں، محبت بھی کرتیں تو بس ناپ تول کر اور جب میں ان کے سخت رویوں پر احتجاج کرتی تو وہ کہتیں۔

”یہ تمہاری تربیت کے لیے ضروری ہے۔ آخر کو تمہیں پرانے گھر جانا ہے۔“ اور میں تڑپ کے کہتی۔

”پرانے گھر بھیجنے کے لیے آپ تو پرائی مت بنیں۔“ تب وہ مسکرا کر کہتیں۔

”تم نہیں سمجھو گی۔“ پھر مجھے اپنے ساتھ لگا کر میرا ماتھا چومتیں۔

”ماں بنو گی تو جانو گی بیٹی جنو گی تو مانو گی کہ میں جو کہتی اور جو کرتی تھی وہی درست تھا۔“ مگر میں ان کے انداز فکر سے چڑ جاتی اور باقاعدہ رونے لگتی۔ ضد کرتی، تب بھی وہ اکثر اپنے فیصلوں پر ٹس سے مس نہ ہوتیں۔ انہوں نے مجھے سہیلیوں کے ساتھ تہا ان کے گھروں میں رات بتانے کی اجازت نہ دی، تب بھی نہیں جب فاریحہ کے گھر پر نیا تیر پارٹی تھی اور تب بھی نہیں جب رومانہ کی مہندی تھی، کتنا مس کیا تھا میں نے ان دونوں فنکشنز کو۔ میں پچھلے برس کی باتیں یاد کر کے پھر سے رونے لگی۔

”ماما اپنا حکم مجھ پر کیوں چلاتی ہیں؟“ میری سوچ بے بس ہو کر مچلنے لگی اور دل بے اختیار چاہنے لگا کہ میرے پر کھل آئیں اور میں پرواز کر جاؤں۔ میں نے پھر سے آسمان کی طرف دیکھا، اور بلند اور وسیع آسمان، تا حد نگاہ پھیلا ہوا۔ اوپر پرندوں کی اک قطار دکھائی دے رہی تھی چھوٹے چھوٹے پندے ایک ساتھ ایک ہی سمت پرواز کرتے ہوئے بہت ہی بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ”کاش ان میں سے ایک میں ہوتی۔“ میں نے شدت سے خواہش کی..... میں نے نادانستہ طور پر اپنی کہنیوں کو کھڑکی سے ہٹایا اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں۔

”یا اللہ مجھے پر عطا کر دے تاکہ میں اڑ جاؤں اور اڑ کر اس آسمان میں کھو جاؤں۔“ آنسو

گرنے لگے۔ جیسے میں خود ہی جانتی تھی کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہو سکتی..... میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

سامنے آسمان تاریک ہو رہا تھا، پرندوں کا وہ غول شاید اپنے گھر پہنچ چکا تھا..... اور زرد 'ٹھنڈا اور اداس سورج بھی رات کے لحاف میں منہ دے چکا تھا..... ٹھہری ہوائ نے انگڑائی لے کر پھر سے چلنا شروع کر دیا تھا، اب اس کے مزاج میں تندگی اور خشکی اور بڑھ چکی تھی۔ میں نے اپنے پھیلے ہوئے بازو سینے، ایک نظر تاریک آسمان پر ڈالی۔ میری پرواز کی خواہش اس کی تاریکی اور بڑھتی ہوئی ہیبت دیکھ کر سہم گئی اور میں نے جلدی سے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے۔

”میں کہیں نہیں جاسکتی میرے پر تو نکلنے سے پہلے ہی کٹ جاتے ہیں۔ میں پرواز کر کے کروں گی بھی کیا، کہ آسمان کی وسعتیں میرے لیے تو نہیں ہیں میرا ٹھکانہ تو یہی دیواریں ہیں آج اس گھر کی توکل کسی اور گھر کی۔“

کسی اور گھر کا خیال آتے ہی میرا دل گیلی لکڑی کی مانند سلگنے لگا۔

”نہیں، میں ماما کی یہ بات نہیں مانوں گی۔“

مجھے یاد آگیا کہ میرا دل آج کل اس قدر اداس اور مایوس کیوں تھا۔ ماما نے ایک دم سے گھر میں ایک محاذ کھول لیا تھا میری شادی کرنے کا خیال تو جیسے برسوں سے ان کے دماغ میں ہل رہا تھا، جیسے ہی میں اپنے ایم اے فائنل انیئر کے امتحانات سے فارغ ہوئی، انہوں نے ارشاد فرمادیا کہ وہ میری شادی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں اور انہوں نے میرے لیے لڑکا بھی پسند کر لیا تھا مجھ سے پوچھ بھگت اور مجھے شامل فیصلہ کیے بغیر اور تب سے میں اور ماما آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میرا اس سلسلے میں ان سے کل باقاعدہ جھگڑا ہو گیا تھا.....!

”ماما! آپ خواہ مخواہ ہی اپنی ضد پراڑی ہیں۔ اور دیکھ لیجئے گا یہ ضد آپ کو مہنگی پڑے گی۔“ میں جو سدا کی منہ پھٹ اور قدرے بدتمیز واقع ہوئی تھی، اپنی پیاری ماما کے ساتھ پوری پوری بحث کر رہی تھی۔

”آپ..... آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔“ میں ان کی طرف سے مسلسل ایک ہی جواب پا کر بہت پارے لگی تو رونے پر آگئی..... بلکہ ماما کی زبان میں اب میں واقعی جذباتی بلیک میلنگ پر اتر آئی تھی۔

”ماما! میں سچ کہتی ہوں میں وہاں ایک روز بھی گزارا نہیں کر سکتی.....“ میں ان کے

سامنے کھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور منت ساجت کرنے لگی۔

”یہ تم آج کہہ رہی ہو مگر مجھے یقین ہے بہت جلد تم وہاں نہ صرف اچھا گزارا کرنے لگو گی بلکہ بے حد خوش و خرم زندگی گزارو گی۔“ انہوں نے بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو کیسے پتا؟ زندگی مجھے گزارنی ہے یا آپ کو؟“ میں پھر بدک گئی اور ترشی سے

بولی۔

”میں نے تمہیں نا صرف جنم دیا ہے بلکہ تم میرے ہی ہاتھوں پل کر جوان ہوئی ہو تو بھلا تمہیں مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔“ وہ سکون سے مسکراتی ہوئی بولیں۔

”اچھا تو یہ آپ کا اٹل فیصلہ ہے؟“ میں نے ان سے گویا آخری بار پوچھا۔

”سو فیصلہ اٹل.....“ وہ پراعتہ دلچہ میں بولیں۔

”تو..... تو..... پھر آپ بھی سن لیں جیسا آپ گمان کر رہی ہیں ویسا ہرگز نہیں ہوگا۔

میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔ تب آپ پچھتا سکیں گی۔“ میں نے بھی اپنے انداز میں اعتماد بھر کے کہا، بلکہ انہیں ایک طرح کا چیلنج دے دیا۔

”ایسا ان شاء اللہ تعالیٰ نہیں ہوگا اور اس کا میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تم وہاں بے حد خوش رہو گی۔“ ماما اپنی آرام کرسی سے اٹھ کر میری قریب آ گئیں، میں جو چند لمحے پہلے ان کے سامنے کھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی تھی، اب غصے سے اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی، تب انہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کے خود سے بھینچ لیا، میں پہلے ہی بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے کھڑی تھی، مزید برداشت نہ کر سکی اور ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”عصمہ! میری جان مجھ پر بھروسہ رکھو میں تمہارا برا نہیں چاہ رہی، دیکھ لینا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ مجھے پیار کرتی اور تسلیاں دیتی تھیں۔ مگر اس وقت مجھے ان کی کسی بات پر اعتبار نہیں آ رہا تھا..... مجھے تو بس یہ لگ رہا تھا کہ میری ماں جان بوجھ کر میری زندگی خراب کرنے لگی ہے۔ انہیں بھی دقیقاً نو سیت کے کسی موڈی جراثیم نے کاٹ لیا ہے اور وہ ایثار و قربانی کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئی ہیں۔

مگر وہ اس بھینٹ مجھے کیوں چڑھانا چاہتی ہیں۔ اپنی اکلوتی اور بے حد نازوں پٹی بیٹی کو؟ یہ بات سمجھ نہ سچھ آ رہی تھی۔ مجھے تو لگ رہا تھا میری ماما پر کسی نے جادو وغیرہ کر دیا ہے۔ کوئی



زبردست عمل کر کے ان پر پھونک مار دی ہے کسی نے۔ جس سے ان کا دماغ پلٹ گیا ہے، پر کس نے؟ کون میری ماما کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے اور کیوں؟ میں خود سے سوال کرنے لگی اور اپنے ارد گرد ایک تنقیدی جائزہ بھی لینے لگی مگر میری ماما سے کسی کو کیا لیتا ہے؟ ماما نے تو کبھی کسی کا برا نہیں جاپا۔

مجھے اپنی ماما کا اچھی طرح سے پتا تھا، وہ اتنے اچھے کردار اور اطوار کی مالک تھیں کہ خاندان کی بُری سی بُری خواتین بھی ان سے محبت کرتیں اور ان کا احترام کرتی تھیں ماما تو خود ہی سب کے کام آتی تھیں پھر میری ماما سے کس کو بیر ہوگا جو ان پر جادو ٹونا کرے.....؟ مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کون ایسا کر سکتا ہے۔

خاتون آپا۔“ اچانک ایک نام میرے ذہن کے پردے پر چمکا۔  
 ”ہاں..... ہاں یہ کام خاتون آپا کا ہی ہے۔“ میں نے جھٹ انہیں مجرم ٹھہرا دیا جانے کیوں مجھے انہیں مورد احترام ٹھہرانے میں ذرا شک نہ گزرا بلکہ سو فیصد یقین بھی تھا کہ وہی ایسا کر سکتی ہیں۔

”مگر کیوں؟ وہ ایسا کریں گی۔“ میرے ذہن میں پھر ایک سوال کلپایا۔  
 ”صاف ظاہر ہے میرا رشتہ لینے کے لیے۔“ میں نے وجہ بیان کرنے میں ذرا تامل نہ کیا۔

”رشتہ.....؟؟“ میرا ذہن ذرا الجھنے میں پڑا..... ”رشتہ لینے کے لیے وہ جادو کیوں کرنے لگیں؟“ میرا دماغ مجھ سے متفق نہ تھا۔

”افوہ ہو بھی.....“ میں اپنی عادت کے مطابق جلد ہی الجھ گئی میں جو صبر اور تحمل میں بالکل ہی کوری تھی ذرا ذرا سی بات پر الجھ جاتی اور گھبرا بلکہ چکرا جایا کرتی تھی۔ میری ماما کہا کرتی تھیں ”عصمہ! بچے! ذرا تو دھیر رج رکھا کر دو کچھ تو سوچا کر دیو بات بے بات الجھنا، جھگڑنا اور پھر بے وقوفوں کی طرح رونا۔ کیا یہ سب عورتوں کو زیب دیتا ہے..... عورت جس پر گھر گریستی کی کڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور جنہیں قدم قدم پر ہزار ہا قسم کے خانگی معاملات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں صبر اور تحمل نہ ہو تو پھر تو سارا خانوادہ ہی بکھر جاتا ہے۔“

”مگر میں اپنی تلون مزاجی اور لا پرواہی طبیعت کے ساتھ کدھے اچکا کر کہتی۔  
 ”جب عورت بنوں گی تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو میں نو جوان لڑکی ہوں اور مجھے لڑکی ہی رہنا ہے فی الحال۔“ ویسے بھی یہ شادی مجھے اس لیے بھی بری لگتی تھی کہ اس کے ہوتے ہی اچھی بھلی

لڑکی خواہ وہ سترہ برس کی ہوتی۔ فوراً عورت کہلانے لگتی تھی..... مجھے اپنے کالج کے باہر لکھا ہوا ”گورنمنٹ کالج برائے خواتین“ بھی سخت زہر لگتا تھا..... بھلا یہ کیا تک بنتی تھی کہ سولہ سے اٹھارہ سال کی لڑکیوں کو ”خواتین“ کہا جانے لگے..... یہ ہماری سرکار بھی ٹھیکائی ہوئی ہوگی جب اس نے ”گرلز“ کی جگہ ”خواتین“ کا صیغہ انتخاب کیا ہوگا؟

میں اپنی سوچ میں کہیں سے کہیں جا نکلی۔ یہ بھی میری ایک خراب عادت تھی کہ میں سوچنے کیا لگتی اور سوچتے سوچتے کہاں جا نکلتی۔ کرنے کا کچھ موڈ ہوتا اور کرنے کچھ اور لگتی۔

اس پر بھی ماما کہتی تھی ”تمہاری شخصیت میں حد درجہ..... لاپرواہی اور غیر ذمہ داری ہے۔ غیر مستقل مزاج ہونے کی وجہ سے تم کچھ بھی نہ ڈھنگ سے کرتی ہو اور نہ کر سکتی ہو محض پلاننگ ہی تمہارا مشغلہ ہے جو بے کار اور احمقانہ سے خیال کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی۔“ ماما کو لگتا تھا میں لاڈ پیار کی زیادتی کی وجہ سے ایسی ہوں اور میری شخصیت کے سارے جھول بلکہ کس بل نکالنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ میری شادی کر دی جائے۔

”شادی.....“ مجھے اس خیال نے کرنٹ مارا۔

”نہیں نہیں مجھے ابھی شادی نہیں کرنی اور اس نصیر احمد سے تو ہرگز نہیں کرنی۔“ میں جو خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی اس حقیقت میں پلٹ آئی جس میں فی الحال کافی تلخی آچکی تھی۔

میں اپنی ماما نے خفا ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو چکی تھی۔ میں نے آج دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا تھا اور جب نوراں ماسی کھانے کی ٹرے کمرے میں لے کر آئی تب بھی میں نے یہ کہہ کر کھانا واپس بھیج دیا تھا کہ ”کھانا زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں جب مجھے زندہ ہی نہیں رہنا تو پھر کھانا کس لیے؟“ میرا خیال تھا کہ کھانے کی ٹرے واپس پا کر تو ماما ضرور پریشان ہو جائیں گی اور مجھے منانے چلی آئیں گی۔ مگر یہ بھی محض میری خوش فہمی تھی.....

پھر نہ ہی ماما میرے پاس آئیں اور نہ ہی کھانا واپس بھیجا، اب مجھے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی، غصے میں میں نے ماسی نوراں کو لوٹا تو دیا تھا، مگر اب پچھتاوا ہو رہا تھا کہ بھلا کھانے سے کیا غصہ؟ مجھے کھانا تو کھالینا چاہیے تھا..... ہائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا.....

اب میں جا کر کھانا نہیں مانگ سکتی تھی کہ اس میں میری اپنی سبکی تھی اور ماما..... ماما تو دوبارہ کھانا بھیجتی نہیں، کھانے کے معاملے میں تو ان کے اپنے ہی اصول تھے جو بے حد سخت تھے۔

وہ بلاشبہ میرے لیے سونے کا نوالہ ہی تیار رکھتیں، مگر اسے کھلاتی وہ شیر کی آنکھ سے تھیں ”اس طرح مت کھاؤ“ ایسے مت بیٹھو، بسم اللہ کر کے کھانا شروع کرو، خواہ تمہیں وہ ڈش پسند ہو یا نہ ہو اور پھر اسے پوری رغبت سے اور احترام سے کھاؤ خواہ تھوڑا سا ہی چمکو۔“ میں اکثر نہیں کہتی۔

”ماما! یہ ٹیبل میز جو آپ فالو کرواتی ہیں اس میں کھانے کو ادب و احترام دینے والی بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کھانا تمیز سے کھانا چاہیے، مگر احترام سے کیا مطلب؟“ جب میں نے یہ سوال کیا تھا تو میری عمر گیارہ بارہ سال ہوئی۔ اس وقت بھی انہوں نے کھانا میرے سامنے سے اٹھالیا تھا اور مجھے کھانے کی میز سے اٹھا دیا تھا کہنے لگیں۔ ”جاؤ جب تمہیں بھوک ستائے گی تو کھانا ملے گا۔“ میں بھوک اٹھ کر آگئی اور سوچنے لگی کہ میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گی.... بلکہ شام کو پاپا آئیں گے تو ماما کی شکایت کروں گی.... وہ یقیناً ماما کو ڈانٹیں گے.... اور مجھے خود کھانا کھلائیں گے.... مگر وہ تین گھنٹے کے بعد ہی میری برداشت جواب دینے لگی، بھوک نے اتنا ستایا کہ میں سب کچھ بھول کر ماما کے پاس چلی آئی۔

”ماما!“ میں سر جھکائے کھڑی تھی۔

”جی میری جان۔“ ماما اپنی وارنگلی و محبت کے ساتھ میری طرف بڑھیں۔

”ماما! مجھے بھوک لگی ہے۔“ میں نے فوراً ہی کہہ دیا۔

”تو چلو کھانے کی میز پر میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔“ انہوں نے میرے ماتھے پہ ہوسہ دیتے ہوئے مجھے ڈائننگ ٹیبل کی طرف بھیجتے ہوئے کہا۔

”ماما!“ میں نے انہیں جانے سے روک لیا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”جی میری جان ماما۔“ وہ مجھ پر فشار تھیں۔

”کھانا گرم نہ کریں مجھے ایسے ہی دے دیں۔“ مجھ سے اب اور صبر نہ ہو رہا تھا ماما نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور مجھے کھانے کی میز کے پاس خود لے کر آئیں اور کھانا میرے سامنے رکھ دیا، وہی دال چاول کی پلیٹ جو میں نے کچھ دیر پہلے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا تھا کہ مجھے تو دال چاول ذرا پسند نہیں میں نہیں کھاؤں گی وہی کھانا اب میں نے بسم اللہ کر کے کھانا شروع کیا اور بڑی رغبت سے کھانے لگی۔ اس روز دال چاول کے ہر نوالے میں، میں نے ایک عجیب ہی لذت محسوس کی تھی.... اور میں بالکل بھول گئی تھی کہ مجھے تو دال چاول پسند نہیں..... جب میں کھانا کھا چکی تھی تو ماما مجھے پیار سے سمجھانے لگیں۔

”عصمہ! کھانے کو اسی طرح سے بسم اللہ کر کے پوری پسندیدگی اور شوق سے کھانا چاہیے۔ اگر پسند نہ بھی ہو تو اس کھانے کی برائی نہیں کرتے۔ بھلے تھوڑا سا کھا کر ہاتھ کھینچ لیں، مگر الحمد للہ کہہ کر اٹھ جائیں یہی ہے کھانے کا ادب احترام اور اس کی عزت، بیٹی! یہ کھانا ہمارا رزق ہے اور اسی کھانے کے لیے انسان اتنی محنت و دھوکہ دیتا ہے اور یاد رکھنا کہ ہر زری روح کو اس کے نصیب اور حصے کا رزق ملتا ہے۔ جو کھانا ہمارے سامنے ہوتا ہے وہی ہمارا نصیب ہوتا ہے..... اپنے نصیب کو اگر ہم برے منہ بنا کر ٹھکرا دیں گے تو وہ دینے والا رب کیا ہم سے ناراض نہ ہوگا؟ ماما نے مجھے اتنے پیارا اور حکمت سے سمجھایا کہ بھر میں نے کبھی کسی کھانے کی برائی نہ کی تھی اور سچ بات ہے کہ جب بھی میں نے بسم اللہ کر کے کھانے کو شوق اور محبت سے کھایا وہ مجھے کبھی بد ذائقہ نہ لگا۔

میں جلدی سے اٹھی اور ہادرچی خانے کی طرف بھاگی یہ بھول کر کہ میں نے آج غصے میں کھانا داپس کیوں کر دیا تھا..... مجھے بس اتنا یاد تھا کہ واپس کیا ہوا کھانا مجھے کوئی بھی دوبارہ کھلانے نہیں آئے گا۔ نہ ماما نہ پاپا میں نے خاموشی سے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور واپس اپنے کمرے میں لے آئی ماما وہیں ہادرچی خانے میں مصروف تھیں میں ان سے نظریں چرا کر چلی آئی تھی، مگر ان کی نرم اور محبت بھری آواز مجھے پیچھے سے سنائی دی تھی وہ کہہ رہی تھیں۔

”تم کھانا کھاؤ میں چائے لے کر آتی ہوں۔“



رات کو ماما میرے پاس ہی لیٹ گئیں۔ وہ مجھے اداس اور مسلسل روتا ہوا دیکھ کر بے حد پریشان تھیں۔ وہ لاکھ اصول پسند تھیں، مگر انہیں مجھ سے محبت بھی تو تھی۔ بے اعذارہ اور بے لوث محبت کہ متا کی گہرائی اور سچائی کو کب کسی پیمانے سے ناپا جاسکتا ہے۔

”عصمہ!“ وہ میرا سراپے زانو پر رکھے میرے بال سنواریتی بولیں۔

”جی ماما۔“ میرا دل بھی اس وقت پانی ہو رہا تھا اور لبریز ہو جانے کو تھا۔

”عصمہ! آخر تمہیں اس رشتے سے انکار کیوں ہے؟“ وہ بڑی نرمی سے پوچھ رہی

تھیں۔

”ماما! مجھے وہ نصیر احمد بالکل پسند نہیں۔“ میں نے بھی صاف کہہ دیا۔

”اسے ناپسند کرنے کی وجہ؟“ وہ مجھ سے وجہ پوچھ رہی تھیں۔

”ماما! بس وہ مجھے پسند نہیں۔“ پتا نہیں کیوں مجھے اپنے انکار کے لیے اس وقت کوئی وجہ نہ مل رہی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ میرے جواب سے مطمئن نہ تھیں۔

”ماما! آپ نے دیکھا نہیں ان کے گھر کا ماحول کیسا ہے؟ ہمارے اور ان کے اسٹیلز میں کتنا فرق ہے؟“ میں نے گویا وجہ تلاش کر رہی لی۔

”وہ بعد میں ڈسکس کریں گے، پہلے تم مجھے نصیر احمد کو ریجیکٹ کرنے کی وجہ بتاؤ۔ اس میں کیا برائی ہے؟“ وہ اپنے پہلے سوال پہ قائم تھیں اس وقت ان کے لہجے میں سختی نہیں تھی، بلکہ وہ بڑی محبت اور رومان سے بات کر رہی تھیں۔

”وہ..... وہ پہلے تو مجھے نصیر احمد کا نام ہی پسند نہیں، کس قدر پرانا نام ہے لگتا ہے کسی دقیا نوسی سے بوڑھے کو پکار لیا ہو۔“ میں نے قدرے بدتمیزی سے نصیر احمد کے نام کا مذاق اڑایا۔

”یہ بھی بڑی احمقانہ وجہ ہے۔ تمہارا بچپنا تمہاری اس بات سے صاف جھلک رہا ہے اور کسی شخص کو محض اس کے نام کی وجہ سے ناپسند کرنا، خود ناپسند کروینے والے کی ذہنی حالت کو مفلکوک کرتا ہے کوئی اور وجہ بتاؤ۔“ ماما نے میری طبیعت صاف کرنا شروع کر دی ان کے پاس اتنے دلائل ہوتے تھے کہ ان سے بچت کرنے کے لیے باقاعدہ معلومات ہونا ضروری ہوتا تھا۔ میں جب اپنا سپاٹ سا چہرہ لے کر بیٹھ گئی تو وہ مسکرائیں اور مجھے اپنے مقابل بٹھا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگیں۔

”اچھا تم میرے سوالات کے صرف دو ٹوک جواب دو۔ میں ذرا الٹ ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے لگتا تھا میری ماما جب اس طرح سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہیں تو وہ مجھے ہینا تانز کر لیتی ہیں اور میں بہت جلد زیر ہو جاتی ہوں، لہذا اس وقت میں نے اپنی آنکھیں ان کی آنکھوں کی گرفت سے چھڑا لیں اور میں اپنے ہاتھوں سے خواہ مخواہ ہی کھیلنے لگی وہ میری اس حرکت کو سمجھ گئیں اور یقیناً مغلوط ہوتی ہوئی پھر میرے سامنے آ گئیں۔

”سچ بات کو کہنے اور اپنا حق منوانے والے نظریں نہیں چراتے۔“ وہ مسکرا کر بولیں، میں گھبرائی۔

”نہیں ماما! ایسی بات تو نہیں ہے۔“

”اچھا نہیں ہے تو پورے اعتماد سے بات کرو مجھے قائل کر لو اور اپنی بات منوالو۔ اگر

تمہاری بات میں دم ہوگا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ نصیر احمد کے رشتے سے ابھی انکار کر دوں گی اور پھر تم جہاں کہو گی میں تمہاری شادی کر دوں گی۔“ انہوں نے مجھے کھلا راستہ دے دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے خود میں اعتماد بھرتے ہوئے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ نصیر احمد کی شکل صورت کیسی ہے؟“ (ہمارے درمیان یہ شرط پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ وہ مجھ سے مشکل سوال نہیں کریں گی اور میں پوری ایمانداری سے انہیں جواب دوں گی۔)

”اچھی ہے۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔ ”یعنی اس کی شکل و صورت پر کوئی اعتراض نہیں؟“

”نن..... نہیں۔“ مجھے ماننا ہی پڑا۔

”چلو شکر ہے.....“ ماما نے ایک پرسکون سانس لی۔

”اچھا۔ کیا وہ برے کردار کا مالک ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں لڑکیوں وغیرہ کے چکر میں رہتا ہو یا کسی کو بری نظر سے دیکھتا ہو۔“ انہوں نے پوری تفصیل سے اپنے سوال کی وضاحت کی..... میں نے ایک لمحے کو نصیر احمد کا خاکہ اپنے ذہن میں بھرا تو اس کی سدا سے جھکی نظریں اور ادب و احترام والا انداز مخاطب.... وہ کسی کو بھی نظر بھر کے نہ دیکھتا تھا اور لڑکیوں کے معاملات میں وہ خاندان تو کیا خاندان سے باہر بھی بڑی اچھی شہرت رکھتا تھا۔

”معصمہ! میں نے کچھ پوچھا ہے؟“ مجھے خاموش دیکھ کر ماما نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔

”جی ماما۔“ میں چونگی اور پھر دھیرے سے بولی۔

”ماما وہ بے حد شریف بندہ ہے۔“ میرا جواب سن کر ان کے چہرے کی مسکراہٹ کچھ اور

گہری ہو گئی۔

”اچھا اس کی تعلیم؟“ اب ماما تفصیل سوالات کے بجائے مختصر پوچھ رہی تھیں۔ تعلیم؟ وہ ایم بی اے تھا اور ایک اچھی فرم میں منیجر کی پوسٹ پر تعینات تھا یہاں بھی مجھے کوئی کمی نظر نہ آئی مجھے اپنی پسپائی نظر آ رہی تھی جو کہ میں ہرگز نہ چاہتی تھی۔

”مگر ماما پھر بھی مجھے۔“

”معصمہ! ابھی میرے سوال باقی ہیں۔“ انہوں نے مجھے بدکتے دیکھ کر ڈانٹا..... کچھ

لمحے وہ چپ رہیں پھر گویا ہوئیں۔

”اچھا ہے۔“ میرے گلے میں سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

نصیر احمد اگرچہ ہمارا دور کا رشتہ دار تھا، لیکن تھا تو ہمارے خاندان سے ہی اس ذات اس خاندانی پس منظر کا حصہ..... جس پر مجھے بڑا فخر رہتا تھا۔ اور اکثر میں اپنی سہیلیوں کو یہ بات بڑا سر اونچا کر کے بتاتی تھی کہ ہمارے آباء بڑے جری اور بہادر تھے اور انہوں نے فلاں فلاں تحریکوں اور جنگوں میں حصہ لیا تھا..... مجھے اپنے عباسی ہونے پر بڑا زعم تھا۔

”اچھا نہیں اعلیٰ کہو.....“ ماما نے میرے ڈھیلے ڈھالے سے ”اچھا“ پر مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

”چلو اب ایک آخری سوال؟“ ماما نے دوبارہ سے وہی نرمی اور مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائی جو ان کی شخصیت کا حسن تھی وہ میرے اور قریب ہو گئیں اور انہوں نے میرا ہاتھ بڑے پیار سے تھام لیا۔

”نصیر! میری جان! دیکھو مجھے تم سے زیادہ دنیا میں کوئی اور انسان ہرگز بھی عزیز نہیں۔“ میں نے بے ساختہ اپنی ماں کی محبت کا اقرار کیا۔

”تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔ اور میں تم سے کبھی کوئی زیادتی نہیں کر سکتی۔ نہ ہی میں زبردستی تمہاری شادی اس جگہ پر کر رہی ہوں.....“ انہوں نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”نصیر! میری بیٹی ایک بات مجھے سچ بتانا بلا خوف و جھجک۔“ وہ جانے کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں اور میں بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”بیٹی! کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟“ ماما نے بڑے ہی دوستانہ انداز میں پوچھا تھا، مگر مجھے لگا میرے سامنے کسی نے ایک بڑا پٹاخا چاکلے ہی پھوڑ دیا ہو، میں اچھل ہی تو پڑی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما؟“ مجھے کچھ اچھانہ لگا تھا۔

”اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو مجھے تو بتا دو میں پہلے اس سے مل لیتی ہوں۔“ وہ میرے

حالت کو نظر انداز کیے رہیں.....

”بیٹی! زمانہ بدل گیا ہے، اس کی ترجیحات کچھ اور ہیں، بچے اپنے بڑوں کی پسند کے بجائے اپنے لیے خود انتخاب کرنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ تم نے بھی اگر کسی کو.....“

”ماما پلیز.....“ میں قدرے بلند آواز میں اپنی ماں کو آگے بولنے سے روک دیا۔ مجھے

ان کی باتوں پر شرم آرہی تھی اور اپنا آپ منکھوک سا لگ رہا تھا۔

”کسی کو پسند کرنا تو بری بات نہیں ہے۔ ہمارے دین اسلام میں بھی لڑکیوں کو اس کا حق حاصل ہے۔“ ان کے ہاتھوں کی ملائمت جو مجھے ہولے ہولے چھو رہی تھی نے مجھے مزید بولنے نہ دیا اور میں ان کی بات کو توجہ سے سنتی رہی وہ کہہ رہی تھیں.....

”جس طرح سے مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شادی بیاہ کے معاملے میں کل کر اپنی پسند بتائے اور رائے دے اسی طرح لڑکی کو بھی یہ حق حاصل ہے..... اس لیے تمہاری پسند کو دیکھنا پرکھنا اور پھر زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے میں تمہاری مدد کرنا یہ میرا اور تمہارے پاپا کا فرض ہے۔ تم اپنی پسند کے بارے میں کہو تو۔“ وہ بڑی کھلی وضاحت کے بعد پھر مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

”ماما! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی قسم ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں رو دینے کو تھی..... مجھے یہ اچھا نہ لگ رہا تھا کہ میری ماں مجھ سے ایسے سوال کرے..... دوسری لڑکیاں اپنے کیا معاملات رکھتی ہیں، اپنی شادیوں کے بارے میں کتنی آزاد خیال ہیں، ان کا کیا نظریہ ہے مجھے اس سے بھی غرض نہ تھی۔

کسی کو پسند کرنا۔ کسی سے محبت کرنا..... بلکہ محبت کا ہو جانا، یقیناً کوئی فطری جذبہ ہوتے ہوں گے۔ یا پھر جو بھی، مگر میرا معاملہ ایسا نہ تھا مجھے یہ سب مناسب نہ لگتا تھا..... مجھے تو شادی ہی عجیب سا معاملہ لگتا تھا..... میں تو بچپن سے ہی مخالف جنس سے گھبراتی تھی، اپنے کزنز کے ساتھ میرے تعلقات سوائے سلام دعا کے کبھی آگے نہ بڑھے تھے، جانے کیوں لڑکوں سے میں اتنا کتراتی تھی..... حالانکہ مجھ میں اعتماد کی کمی نہ تھی۔

”اچھا تو تمہاری اپنی کوئی پسند نہیں؟“ ماما نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا، وہ اپنی تسلی کرنا چاہتی تھیں۔

”ماما! یقین کریں ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے اپنی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں یقین دلایا۔

”تو میری جان پھر تم ہمیں یہ حق دونا کہ ہم تمہارے لیے ایک اچھا شریک حیات منتخب کر سکیں۔“ اب وہ ضد کے بجائے مجھ سے اجازت طلب کر رہی تھیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ بڑی انکساری سے کام لے رہی تھیں مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔

”ماما! آپ یہ حق حاصل.....“ میں نے انہیں اس کا پورا حق دیا۔  
”مگر ماما.....!“ میری سوئی پھر اسی مگر پرانگی تھی۔



”ابھی بھی گھر؟“ ماما نے مجھے پیار سے گھورا۔

”ماما وہ نصیر احمد کے علاوہ کسی اور کو دیکھ لیں۔“

میں نے دبے دبے الفاظ میں کہا۔

”جب تم نے خود اقرار کر لیا کہ اس میں کوئی کمی نہیں تو پھر یہ وہم اور ہراسمان کس لیے۔

عصمہ! وہ تمہارے لیے ہی نہیں کسی بھی لڑکی کے لیے انتہائی موزوں شریک سفر ہے..... بس تمہیں اس کی ابھی سمجھ نہیں، جلد ہی تمہیں سمجھ آ جائے گی کہ نصیر احمد سے بہتر کوئی اور تمہارے لیے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔“ انہوں نے بڑی محبت سے مجھے سمجھایا..... میری پیشانی پر بوسہ دیا اور مجھے دعائیں دیتی ہوئی یہ کہہ کر چلی گئیں ”چلو اب سو جاؤ اور اچھی باتیں سوچا کرو تا کہ خواب ہی نہیں حقیقت بھی خوبصورت ہو۔“

”اما میں کیا کروں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔“ ان کے جانے کے بعد میں بے دم سی

ہو کر اپنے بستر پہ گر گئی۔



رافیہ میری سب سے اچھی اور قریبی دوست تھی..... قریبی اس طرح کہ اس کا گھر بھی

میرے پڑوس میں تھا، میں نے ماما سے رافیہ کے گھر جانے کی اجازت مانگی اور نوراں ماسی کو ساتھ لے کر اس کے گھر آ گئی۔ اس وقت وہ ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھی مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔

”آہا! عصمہ آئی ہے وہ بھی بغیر اطلاع دیے۔“ وہ مجھ سے لپٹے ہوئے بولی۔ میں

چونکہ بہت کم کسی کے ہاں جاتی تھی، حتیٰ کہ اس کی طرف بھی ہمیں نہ آتی تھی، اس لیے اسکی یہ خوشی لازم تھی..... رکھی سلام دعا اور حال چال دریافت کرنے کے بعد وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”خیر تو ہے؟ تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟“ اور میں نے اس کے پوچھنے پر انکار

نہ کر سکی اور بولی۔

”ہاں رافیہ! میں بے حد پریشان ہوں اور تم سے کچھ مشورہ کرنے ہی آئی ہوں۔“

”اچھا تو آؤ نہ اندر چلتے ہیں میرے کمرے میں۔“ اس نے ٹی وی بند کر کے میرا ہاتھ

تھا اور مجھے اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔

”ارے ہاں ماسی نوراں اب آپ جاؤ اور دو گھنٹے کے بعد واپس آ کر مجھے لے جانا۔“ میں نے نوراں ماسی کو گھر واپس جانے کو کہا۔

”جی بیٹا ہم پھر آ جائیں گے۔“ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

”ہاں اب کہو کیا مرحلہ درپیش ہے جو بے خوابی آنکھیں سیاہ کیے دے رہی ہے؟“ رافیہ نے اپنے کمرے میں آ کر گاؤں کے سے ٹپک لگا کر اپنے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر گہرائی سے گڑ گئی تھیں جیسے وہ میرا چہرہ نہیں میرا دل پڑھ رہی ہو۔

”رافیہ! ماما نے میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔“ میں نے ہارے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”ارے واہ! یہ تو خوشی کی خبر ہے مگر تم کیوں منہ لٹکائے ہوئے ہو؟“ وہ خوش ہوتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”میرے لیے یہ خبر خوشی کی نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”وجہ.....؟“ وہ میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئی۔

”بس وہ نصیر احمد مجھے پسند نہیں۔“ میں نے برا سامنہ بنا کر کہا، پتا نہیں کیوں نصیر احمد کا نام لیتے ہی میرے من کو ٹین آ جاتی تھی۔

”دیکھو میری جان! اگر مجھ سے مشورہ لینے آئی ہو تو پہیلیاں مت بھجوانا، صاف صاف کہو بات کیا ہے؟“

مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ بھی دوبارہ سنجیدہ ہو گئی۔

”رافیہ مجھے خود معلوم نہیں کہ کیا بات ہے مگر میں نصیر احمد کے ساتھ خوش نہ رہ سکوں گی وہ مجھے اچھا نہیں لگتا میرا آئیڈیل نہیں ہے۔“ میں رو ہانسی ہو گئی شاید اس لیے کہ اپنی بات اور اپنے احساسات کی وضاحت میں کرنے پاری تھی بالکل اسی طرح جیسے میں ماما کے سامنے بے بس سی رہ جایا کرتی تھی۔

”مجھے اس کے چلیے سے ہی دنیا نویسیت جھٹکی دکھائی دیتی ہے اور پھر وہ خاتون آپا۔“ مجھے کچھ اور سمجھ نہ آئی تو میں اپنے جی کی بھڑاس اس طرح سے نکالنے لگی۔

”مجھے تو حیرت ہے تمہاری ماما نے تمہارے لیے ایسا انتخاب کیوں کیا؟“ رافیہ بھی بالکل

میری ہی طرح سے پریشان ہو کر کہنے لگی۔ اس لمحے مجھے پوری دنیا میں ایک وہی اپنی قلم اور بے لوث ساتھی دکھائی دی، اس کی طرف سے اپنے خیالات کو حوصلہ افزائی پا کر میرے اندر کی جوالہ کشی میں اور بھی اہال آنے لگے۔

”یار! پتا نہیں انہوں نے میری ماما پر کیا جادو کر دیا ہے۔ لگتا ہے ان کی آنکھیں ہی بند کر دی ہیں جو میں انہیں اب نظر نہیں آ رہی۔“ میں توجہ معجز ہی رونے لگی۔

”تو تم صاف انکار کر دو مت مانوان کی بات.....؟“ رافیہ نے کندھے اچکا کر بڑی ہی سہولت سے کہہ دیا۔

”یہ اتنا آسان کام بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ ”انکار“ کے لیے کوئی ٹھوس وجہ مانگ رہی ہیں۔“ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتا دیا۔

”ٹھوس وجہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

”ماما کہتی ہیں یا تو میں اپنی کوئی پسند انہیں بتاؤں، ورنہ ان کی پسند پر آنکھیں بند کر کے ہاں کہہ دوں؟“ میں نے وضاحت کی۔

”تو ٹھیک ہے اپنی پسند بتا دو۔“ اس نے پھر سے کندھے اچکا کر آرام سے کہا۔

”میری پسند؟ مگر میں تو کسی کو پسند نہیں کرتی۔“ میری شکل بدستور قائم تھی۔

”یار تم بھی نہ بالکل اٹو ہو۔ اتنے سارے تمہارے کلاس فیلوز تھے، کسی کو تو تم پسند کرتی ہوگی نا؟“ وہ میرے سارے کلاس فیلوز کے نام دہرائی ہوئی بولی..... ”کسی کا بھی نام لے دو۔ طاہر، سچ، زوہیب، علی، صائم وغیرہ وغیرہ۔“

”پاکل ہوئی ہو بھلا اس طرح سے بھی کسی کو پسند کیا جاتا ہے۔“ مجھے اس کی یہ تجویز سوائے مذاق کے کچھ نہ لگی یہ درست ہے کہ یہ سارے لڑکے بے حد اچھے تھے۔ مگر ہم لوگ صرف کلاس فیلوز تھے، میں نے کبھی کسی کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھا۔

”تو اب سمجھ لو..... اب کون سا صدیاں بیت گئی ہیں ابھی تو صرف فاضل ایئر کے ایگزام ہوئے ہیں، تمہارا تھیسس ابھی باقی ہے۔ ابھی تو تمہارا یونیورسٹی آنا جانا لگا ہی رہے گا۔“ وہ مجھے تجویز دینے کے بعد راستہ بھی دکھا رہی تھی۔

”نا..... نا..... نا..... رہنے دو تم اپنی یہ تجویز..... ایسی بے شرعی مجھ سے نہ ہوگی۔“

مجھے ایک پل میں سوچ کر ہی شرم آ گئی کہ میں پہلے تو اپنے لیے لڑکا پسند کروں اور پھر اس راہ و رسم بھی

بڑھالوں۔

”ٹھیک ہے مت، بوجے شرم اور مظلوم بن کر ساری عمر سختی رہو اپنی ناپسندیدہ زندگی کا عذاب....“ اس نے فوراً ہی اپنی دوستی کا ہاتھ کھینچ لیا۔

”رافیہ! پلیز خفا موت ہو دیکھو بتاؤ نامیں کیا کروں؟“ میں نے پھر اس کی منت کی۔

”بتا تو دیا ہے اب اس سے زیادہ اور کیا بتاؤں۔“ اس کا منہ بتا ہی رہا۔

”مگر یہ تو کئی مناسب بات نہیں ہے۔“ میرا دل پھر بھی اس کے کہے پر چلنے کو آمادہ نہ

تھا۔

”عصمہ! ڈارلنگ! تم نصیر احمد کو دیا نویس مت کہو۔ کیونکہ تم تو خود دیا نویس اور دو قسم کی لڑکی ہو۔ اور تمہارے جیسی لڑکیاں نا صرف اپنے ساتھ زیادتی کیا کرتی ہیں بلکہ دوسری لڑکیوں کے حقوق بھی ان کے وجہ سے پامال ہوتے ہیں۔“ اب وہ بڑی سنجیدگی سے مجھے ڈانٹ رہی تھی۔

”دیکھو یا تو نصیر احمد سے شادی کر لو اور پھر ساری عمر ہونٹ سی کر بسر کو لویا پھر ہمت پکڑو اور ڈٹ کر زمانے کے سامنے کھڑی ہو جاؤ اور یاد رکھو زمانے میں سب سے پہلی قطار خود اپنے گھر والوں کی ہی ہوا کرتی ہے۔“

اس نے میرے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ اور میری آنکھوں پر اپنی نظریں ٹکا تے ہوئے کہا۔ میں دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں بلا کا اعتماد جس کی مجھ میں بے حد کمی تھی۔

”نہیں۔“ وہ حتی اعزاز میں اس طرح بولی جیسے مجھے حکم دے رہی ہو۔

”بیٹا! بیٹا! ہم آگئے۔ نورائیں مجھے آواز دیں دیتی ہوئی آرہی تھیں۔“

”لو بھئی وہ تمہاری شامی ”ماسی جان“ سند یہ لے کر آگئی ہیں۔ ہم آگئے، ہم آگئے، کا واہلا کرتی ہوئیں۔“ نورائیں ماسی کی آواز سن کر رافیہ نے جل کر کہا۔

”واہ یار! تم نے بھی کیا مغلیہ دور کی نشانی سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔“ وہ نورائیں ماسی کی ذات کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہہ رہی تھی اور مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہ لگا۔

”بری بات رافیہ! بڑوں کا مذاق نہیں اڑاتے۔“ میں نے اسے حبیہ کر دی۔

”اوہ گاڈ..... تم اور تمہارے یہ بڑے۔ لگتا ہے آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہے۔“ وہ بدستور اس گستاخانہ لہجے میں بولی۔ اسے سمجھانا بے کار ہی تھا۔

وہ سدا سے ہی ایسی تھی۔ منہ پھٹ اور بدتمیز..... اپنے حقوق کے حصول کے لیے

بزرگوں سے بھی باقاعدہ جھگڑنے والی اور فرائض میں ہمیشہ اپنے لیے رعایتی توقع رکھنے والی جو لینا ہوتا چھین کر لے لیتی کہ ”میرا حق ہے کسی کو کیسے بخش دوں۔“ اور جب دینا ہوتا ہے تو اکثر ہنس کر ٹال بھی جاتی کہ ”خیر ہے اتنی سی بات پر قیامت تو نہیں آجائے گی۔“ اسکول کالج اور اب یونیورسٹی میں بھی بہت کم ہی اس کی کسی کے ساتھ جتنی تھی۔

ایک میں ہی تھی جو بچپن سے آج تک اس کی دوست تھی اور اسے اپنی دوست سمجھتی تھی۔ یہ بھی شاید اسی لیے بدستور ممکن تھا کہ میری طبیعت میں جھگڑا اور بحث دونوں کا فقدان تھا میں بہت جلد اپنا غصہ بھول جاتی تھی، حالانکہ مجھے بھی غصہ تو طوفانی انداز کا آتا تھا۔ مگر میں جتنی جلد کسی کے بارے میں بدگمان ہوتی، اسی طرح خوش گمان بھی ہو جاتی تھی۔ میری اپنی عادات میں ٹھہراؤ نہ تھا، میں بھی بے حد جذباتی تھی..... مگر پھر بھی..... رافیہ میری دوست تھی، حالانکہ بارہا میری اور اس کی لڑائی بھی ہوتی رہتی تھی..... میری ماما کہتی تھیں..... ”تم دونوں میں بہت سی قدریں مشترک ہیں“ اس لیے تم اک دوسرے سے پھر جڑ جاتی ہو۔ حالانکہ دونوں کو ہی بے حد ”اصلاح“ کی ضرورت ہے۔“ وہ ہماری دوستی کو زیادہ پسند بھی نہ کرتی تھیں۔ اس لیے مجھے کم کم ہی رافیہ کے گھر آنے دیتیں..... آج بھی میں خند کر کے آگئی تھی۔

”بیٹا! چلیں گھر پر کچھ مہمان آئے ہیں۔ بیگم کہہ رہی تھیں، ہم آپ کو جلد واپس لے آئیں۔“ ماسی نوران جو پچھلے پانچ منٹ سے مجھے اور رافیہ کو چپ چاپ دیکھ رہی تھیں کہنے لگیں۔

”جی، جی ضرور لے جائیے اپنی اس قیمتی متاع کو اور ہاں ڈھانک چھپا کر لے جائیے گا۔ کہیں کوئی دیکھ کر چرانہ لے۔“

رافیہ نے مجھے چادر اوڑھتے ہوئے میرا ہاتھ نوران ماسی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے اس انداز پر بے اختیار ہنسی آگئی، جبکہ نوران ماسی ذرا سا کھسیا گئیں۔ وہ جانتی تھیں رافیہ ان کا اسی طرح مذاق اڑاتی رہتی ہے۔

”چلیں ماسی۔“ میں نے ان کی حالت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

”اچھا بیو! کیا ارادے ہیں؟ کچھ کر کے دکھانا ہے یا پھر.....“

”ہاں۔ ہاں میں غور کروں گی، آخر مجھے بھی تو اپنا تھیس مکمل کرنا ہے۔“ میں نے جلدی

سے اس کی بات کو درمیان سے ہی اچک کر اپنی بات سے مکمل کر دیا، تاکہ وہ پھر سے کچھ اول فول نہ بک دے اور ماسی صاحبہ گھر جا کر کہہ دیں۔

”چلو یہ تو بہت اچھی خبر ہے کہ اب تم غور کرنے کی عادت ڈالو گی..... اور دیکھ لیتا نتائج بھی پاؤ گی۔ آخر یہ درس ہم نے دیا ہے۔“ وہ پھر بھی باز نہ آئی اور نوراں ماسی کو چڑانے کے لیے خالصتاً لکھنؤ والے انداز میں کہا۔ یہاں تک کہ درازے کی چوکھٹ سے بھی انہیں ہی مخاطب کر کے بولی۔

”اے بی! بی! امان اللہ..... آتی جاتی رہا کیجئے کچھ ہم ناہنجاروں کی اردو بھی بہتر ہوتی رہے گی۔“ جس پر نوراں ماسی نے بھی ادعا فوری چکا دینا ہی مناسب سمجھا۔ مسکرا کر بولیں۔

”اللہ تم کو ہدایت نصیب کرے۔ ہم آئیں نہ آئیں ہماری دعائیں تم پر سایہ فگن رہیں گی۔“ جس پر رانیہ نے کھٹ سے گیٹ کو بند کیا اور میں ان دونوں کی گفتگو سے محفوظ ہوتی گھر واپس آ گئی۔



میں لائبریری میں تھی اور کتابوں کی الماریوں میں کھسی کب سے سرکھپا رہی تھی مجھے اپنے موضوع سے وابستہ کچھ کتابوں کی ضرورت تھی۔ میں جلد از جلد اپنا مقالہ مکمل کرنا چاہتی تھی۔

”ہیلومس عصمہ! ہاؤ آریو.....“ میں نے اس کی بھاری آواز لہجے کو پہچانتے ہوئے سرگھما کر دیکھا۔

یہ وہی تھا۔ وجیہ الدین بھیرزادہ۔ لیوں پر شریر سی مسکراہٹ سجائے۔ اور اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا..... میں ہمیشہ کی طرح نروس ہو گئی اور کتابیں میرے ہاتھ میں سے چھوٹ گئیں۔

”فائن ٹھینک یو۔“ میں نے کتابیں اٹھاتے ہوئے بے مشکل کیا۔

”بٹ لٹلک ناٹ۔“ اس نے کتابیں اٹھانے میں میری مدد کرتے ہوئے پھر شرارت

سے کہا۔

”آئی ایم فائن ری ٹلی۔“ میں نے آج خود میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ آئی سی۔“ اس نے میرے پراعتماد جواب پر مجھے ذرا حیرت سے دیکھا۔

”ٹھینک یو۔“ میں نے کتابیں اس کے ہاتھ سے لے کر شکریہ ادا کیا اور انہیں الیشو

کرانے کے لیے لائبریری کے پاس آ گئی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنے تھیس پر کتنا کام کر لیا۔“ وہ لائبریری سے نکل کر بھی میرے ساتھ ساتھ چلے گا۔

”ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔ یوں سمجھیں کہ بس آغاز ہی کیا ہے۔“ میں نے بھی واجبی سا

جواب دیا۔

رات میں نے رافیلہ کے مشورے پر بہت سوچ بچار کی تھی اور اپنے اندر کچھ اعتماد پیدا کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن پھر بھی لڑکوں سے بے تکلف ہونا میرے لیے جوئے شیر لانا تھا۔

”میں کچھ مدد کر سکتا ہوں آپ کی۔“ اس نے ڈیپارٹمنٹ کی بیڑھیوں پر کھڑے ہو کر

بھراپنی لگا ہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

”جی شکریہ..... ضرورت پڑی تو میں ضرور زحمت دوں گی۔“ میں نے اپنی جان

چھڑانے کے لیے کہا اور اسے وہیں بیڑھیوں پر کھڑا چھوڑ کر بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ حالانکہ

آج میرا ارادہ تھا کہ میں لائبریری میں گھنٹہ گھنٹہ ضرور بیٹھ کر کچھ کام کروں گی، مگر وجیہ الدین کی آمد

نے میرا سارا پروگرام جو پٹ کر دیا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

”پتا نہیں اسے کیا مصیبت ہے، جب دیکھو میرے ہی پیچھے پڑا رہتا ہے۔ مسکرا مسکرا کر

باتیں کرنے کے موقعے تلاش کرتا رہتا ہے اور دیکھتا کیسے ہے۔“ میں دل ہی دل میں جڑ بڑھور ہی

تھی۔

میرے بس اسٹاپ پر پہنچنے ہی مثل آگنی اور میں بغیر کوئی کام کیے گھر واپس آگئی۔ بس

ایک خیال، ایک شبیہ تھی جو میرے ذہن کے ساتھ چپک کر میرے ساتھ ہی آگئی تھی۔ اور پھر وہ دن

بھر میرے ساتھ ساتھ ہی رہی۔ کچھ میرے پاؤں کے تلوؤں سے چٹ جاتی اور میرے پاؤں جل

اٹھتے میں تیز قدموں سے یوں چلنے لگتی کہ تلوے زمین کو چھوتے بھی نہیں اور میں دوسرا قدم اٹھا لیتی۔

میری ہتھیلیوں پر آ جاتی تو میں تقدیر کی لکیروں میں الجھنے لگتی۔ میرے دل و دماغ کی

لکیریں گہری ہو کر یوں گڈ گڈ ہو جاتیں کہ ایک نظر آنے لگتیں۔ آنکھوں میں سا جاتی تو سہانے سے

نرم سے احساس کو خواب بنا دیتی۔ کیف آگیں اور مسرور کر دینے والا خواب اور سماعتوں سے مکرانی تو

چاروں طرف جرس کی گھنٹیاں اپنا ترم بکھیرنے لگتیں جن کی لے پر میرا دل بے خود ہو کر گنگنا تا۔

”وجیہ۔“ اور میں ہڑبڑا کر کہتی۔

”نہیں.....“ میرے ایڑیوں پر گھومتے، پچکتے قدم گرم ریت میں دھنس سے جاتے اور

میں اپنی گڈ لکیروں والی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں مسل ڈالتی وہ نرم اور سہانا خواب اک گھرے سمندر میں غوطے لگانے لگتا اور آنکھوں کے کناروں سے کچھ پانی جھلک جاتا اور میرے پیچھے ہوئے لیوں سے اک سسکی نکل ہی جاتی۔

”ماما! مجھے نصیر احمد سے شادی نہیں کرنی۔“

اس رات میں خود سے لڑتی رہی۔ اپنے وہم و گمان کو لتاڑتی رہی۔ اپنے نفس کو دھکیل دھکیل کر پرے کرتی، اپنی اس خواہش کو سہارا دیتی رہی جو رافہ کے دکھائے ہوئے رستے پر اچانک ہی ”گل بہار“ کی مانند پھیل کر رنگ برنگے پھولوں سے بھر گئی تھی زندگی کی مستی سے اٹے ہوئے رنگ..... سرخ، عنبائی، نارنجی..... ”میں ماما سے بات کروں گی؟“ میں نے فیصلہ کرتے ہوئے سوچا۔

”کیا کہو گی؟“ میرے اندر سے سوال ابھرا۔

”بس کہہ دوں گی کہ وہ نصیر احمد سے شادی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیں۔“  
”اچھا پھر..... جب وہ پوچھیں گی کہ پھر تم اپنی پسند بتاؤ تو!!؟“ وہ سوال ذرا سراٹھا کر

بولاً۔

”تو..... تو کہہ دوں گی وجیہ الدین۔“ میرے لیوں سے بے ساختہ نکلا۔

”اچھا..... واقعی؟“ وہ سوال مجھے عجیب طرح سے گھورنے لگا جیسے میرے اندر سے کچھ کریدنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاں..... واقعی.....“ میں نے اپنا تمام تر اعتماد جمع کر کے کہا۔

”او! بے وقوف لڑکی پہلے اس سے تو پوچھ لو کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے یا نہیں؟“ وہ

سوال ذرا ٹیڑھا ہو کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا جس پر میں بوکھلا گئی۔

”وہ..... وہ مجھے پسند کرتا ہے۔“ جواب خود بخود میرا دل دے رہا تھا۔

”اچھا وہ کیسے؟“ سوال ٹیڑھا ہی تھا۔

”مجھے پتا ہے وہ تو پہلے دن سے مجھے پسند کرتا ہے بلکہ مجھ پر وہ مرتا ہے“ میں نے اسے

کبھی لفٹ نہیں کرائی۔“ میں نے ذرا زعم سے کہا۔

”ہو سکتا ہے تم اس کی فریفتگی کو جائزاری سمجھ بیٹھی ہو؟“ وہ ٹیڑھا ہوا سوال اک بل اور کھا

کر بولا تو مجھے اس پر غصہ آ گیا۔



”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے ٹھک کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ فریضہ تو کوئی بھی تم پر ہو سکتا ہے کہ تم اپنی صنف میں شاہکار کھلانے کی لائق ہو..... مگر جائز رہی وہ ہوتی ہے جسے ”محبت“ کی پاکیزہ کوکھ جنم دیتی ہے..... جو نہایت پوتر اور صاف ہوتی ہے۔ خالص اور شفاف جس میں دنیا داری، بناوٹ اور غرض کا کوئی رنگ نہیں ہوتا جو کسی وجود کی کسی ایک خوبی یا خوبصورتی کی طرف نہیں لگتی بلکہ پورے وجود کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت اپنائے اور اس کا عمر بھر ساتھ بھانے کو تیار ہوتی ہے۔“ اس ٹیڑھے سوال کا بڑا ہی سیدھا اور واضح جواب تھا..... مگر مجھے پھر مشکل لگا۔

”تمہارا کیا تعلق ہے ان ساری باتوں سے۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے ٹھک آ کر اسے اپنے ذہن سے جھٹکا۔

”اگر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے تو میں بھی تمہاری ہی ذات کا حصہ ہوں۔ میرا تم پر حق ہے۔“ میرے ذہن سے گر کر وہ میرے دل میں آجھما، جس سے مجھے بے اختیار ایک کھٹک کا احساس ہونے لگا۔ جیسے کوئی پھانس آگئی ہو۔ اور اب سانسوں کی لرزش سے بھی انک رہی ہو۔

سچ بات تھی کہ مجھے اب تکلیف ہو رہی تھی۔ جب تک وہ میرے ذہن پر چڑھا بیٹھا تھا تو اس کے ٹیڑھے حایض ہونے یا اٹھنے بیٹھنے سے بھی اتنی تکلیف نہیں ہو رہی تھی جتنی اب اس کے ”جی“ میں کھب جانے سے ہو رہی تھی۔

”تم ہوتے کون ہو مجھے سمجھانے والے؟“ میں نے اس کے دیے ہوئے درد سے تھلا کر کہا۔

”میرا نام ”لوامہ“ ہے اور میں تمہارا سب سے قلعہ اور بہترین دوست ہوں۔“ اب اس کا ٹیڑھا پن ایک دم نرمی اور شہاس میں گھل گیا۔

”میرے بہترین دوست؟“ مجھے یقین ہی نہ آیا۔

”ہاں سب قلعہ اور بے لوث۔ مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھو۔“ وہ اپنا ہاتھ پھیلا کر دوستی کی پیش کش کر رہا تھا۔ بھی میرے دل میں سے ایک ہاتھ نکلا جس نے اسے اچانک ہی دیوبچ لیا..... میں ابھی اس کشمکش میں جتلا ہی تھی کہ اچانک یہ کیا افتاد ٹوٹ پڑی..... جب وجیہ الدین اپنے پورے سراپے کے ساتھ میرے دل سے نمودار ہوا اور اک خنار کی طرح میری رگ و پے میں سما گیا..... یہاں تک کہ میرے لب پھر سے بے ساختہ بڑبڑانے لگے۔

”مجھے نصیر احمد سے شادی نہیں کرنی؟“



اگلے روز میں ڈیپارٹمنٹ گئی تو جان بوجھ کر وہیں ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ کل والی لائبریری سے نکلوا کی ہوئی کتابیں میرے پاس فرش پر دھری تھیں اور میں اپنی فائل کو گود میں رکھے اس سے کھیل رہی تھی، یعنی میری انگلیاں فائل کو پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے اور پھر انہیں مٹانے میں مگن تھیں..... یہاں تک کہ وہ بے مقصد کی الٹی ترچھی لکیریں حروف بننے لگیں اور پھر ان حروف کو جوڑ کر میں نے لکھ دیا..... ”وجیہ الدین“

میں نے پہلی بار اپنی دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے جب و۔ ج۔ ی۔ ہ۔ لکھا تو ہر حرف کی ادائیگی میرے دل سے ہوئی..... جیسے وہ چار حرف میری سماعتوں میں بج اٹھے ہوں..... اور چمن..... نن..... نن..... نن..... مجھے یہ اتنا اچھا لگا..... اتنا اچھا کہ پھر میں کتنی دیر حروف کی اس جوڑ توڑ میں کھوئی رہی اور میری سانسوں سے کھٹکھٹکے چمکتے رہے..... مجھے اس کی خبر نہ ہوئی اور جب کسی نے اپنے مخصوص کیمچر لچے میں میرے قریب آ کر کہا۔

”ہیلو مس مصمنہ!“ تو میں اس بار ذرا بھی نہ چونکی کہ اب تو میں خود اس لمحے کی منتظر تھی۔ میری دھڑکنوں نے اس لچے کو اتنی بار دہرایا تھا کہ مجھے اب اس کی حقیقت پر وہم کا گمان گزر رہی نہ سکتا تھا۔

”آئی ایم فائن ٹھینک یو۔“ میں نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ تا صرف جواب دیا بلکہ اس کی جانب دیکھا بھی وہ ”وجیہ الدین پیرزادہ“ آسمانی رنگ کی شرٹ اور سیاہ پینٹ میں اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے میری جانب ذرا سا جھک کر مجھے شرارتی نظروں سے دیکھتا ہوا جیسے حسرت لگا کر میری آنکھوں سے دل میں اتر گیا۔ میں ابھی اسے اپنے اندر کی حالت کا پتا نہ چلنے دینا چاہتی تھی اس لیے ذرا سا کھرا کر نکلنے کی اداکاری کرنے لگی..... میں نے اپنی کتابیں اٹھا کر لائبریری کی طرف قدم بڑھائے۔

”اچھا تو پڑھنے کا ارادہ ہے؟“ وہ میرے ہم قدم ہو گیا۔

”ظاہر ہے یونیورسٹی میں ہم پڑھنے ہی آتے ہیں۔“ میں نے خود پر ذرا سنجیدگی طاری

کی۔

”ہم..... کون..... کون؟“ وہ میرے ”ہم“ کہنے پر شرارت سے بولا۔  
 ”ظاہر ہے میں اپنی بات کر رہی ہوں، لیکن یہاں پر لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لیے  
 ہی آتے ہیں۔ تفریح کرنے تو نہیں۔“ میں بدستور سنجیدہ تھی۔  
 ”او..... ہاں درست، بالکل درست کہا آپ نے۔“

اس نے میری بات سے بظاہر تواثق کیا، مگر اس کی آنکھوں میں شرارت کا عنصر بدستور  
 موجود تھا۔

ہم دونوں ایک ساتھ لائبریری میں داخل ہوئے۔ میں اپنی مخصوص جگہ کی طرف بڑھی جو  
 قدرے کونے میں تھی اور جہاں اکا دکا ہی کوئی بیٹھتا تھا اور وہی بیٹھتا تھا جسے پڑھنا ہوتا تھا میں نے  
 دیکھا کہ وہ بھی میرے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا میں نے آج اسے اپنے ساتھ بیٹھنے پر ذرا  
 بھی نہ ڈانٹا، بلکہ اسے نظرا انداز کرتے ہوئے میں نے کتابوں کو ٹوٹنا شروع کر دیا۔ جیسے میں پڑھنا  
 چاہتی ہوں اس نے بھی چپ چاپ اخبار اٹھایا اور اپنے سامنے پھیلا لیا۔ یعنی وہ مجھے ڈسٹرب نہیں  
 کرنا چاہتا تھا۔

اسے خاموش دیکھ کر جانے کیوں میرا جی گھبرانے لگا، میں تو اس کے منہ سے کچھ سننا  
 چاہتی تھی۔ مجھے ایک ہی دن میں جانے کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا ”اظہار محبت“ میرے  
 لیے بے حد ضروری ہے اور اسے اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ شاید میرے پاس وقت کم تھا  
 ..... اور شاید اس لیے بھی کہ میں نے رافیہ کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل شروع کرتے ہوئے اسے  
 اپنے لیے بیج بچ پسند کر لیا تھا۔ اور اب جیسے ہی وہ مجھے اپنا عندیہ دیتا میں نے ماما کو یہ خبر سنائی تھی کہ  
 ”نصیر احمد سے شادی کی وجہ انکار میرے پاس موجود ہے۔“

”مس خصمہ! کوئی پرابلم ہو تو میں مدد کروں۔“ اس نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر یوں  
 کہا، جیسے وہ اخبار نہیں بلکہ اب تک میرے خیالات ہی پڑھ رہا تھا۔

”مدد..... نن..... میں..... میں کر لوں گی۔“ میں بوکھلائی تو مگنی کہ وہ تو میرے ذہن کو  
 صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔

”ویسے میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ میں واقعی میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں..... بھروسہ کر  
 کے تو دیکھیں۔“

اب وہ اخبار ایک طرف رکھ کر سیدھا میری طرف متوجہ تھا اور میں اس کے سامنے

پریشان ہو کر خوا خواہی لکھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

”لائیں یہ کتاب مجھے دیں۔“ اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور اسے میری طرح الٹ پلٹ کر دیکھنے کی بجائے اس کی فہرست مضامین نکال کر بیٹھ گیا۔

”دیکھیں مس معصمہ! آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے موضوع سے مطابقت رکھتے مضامین کا پہلے بغور مطالعہ کریں اور پھر ان میں سے اہم نکات کو نوٹ کرتی جائیں تاکہ آپ انہیں تحقیقاتی مقالے میں شامل کر سکیں..... مثلاً۔“ اور پھر وہ مجھے سچ بچ بوی سنجیدگی سے گائیڈ کرنے لگا اور میں بھی چپ چاپ اس کے بتائے ہوئے مضامین پر سرخ نشان لگاتی رہی۔

”چلیں آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ ان کا بغور مطالعہ کر لیں، پھر ہم کل اس پر ڈسکس کریں گے۔“ کچھ دیر کے بعد اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”ادراب اگر آپ کو برا نہ لگے تو چل کر ایک پیالی گرم گرم چائے کی پی لیں، قسم سے بڑی طلب ہو رہی ہے۔“ اس کی سنجیدگی پھر ہوا ہو چکی تھی اور آنکھوں میں شرارت کے تارے پھر سے چمک رہے تھے۔ اس کی گہری رات سی سیاہ آنکھیں جن پر خمدار پلکوں کے سائے بالکل ایک ایسی جمیل کا تاثر دیتے تھے جس کے دو کنارے گھنے درختوں میں گھرے ہوں۔

”اے مس! چلیں.....“ مجھے گم سم دیکھ کر اس نے چنگی بجا کر اور بے تکلف ہوئے کہا۔  
 ”چائے..... میں تو بہت کم چائے پیتی ہوں۔“ میں نے اپنی چوری پکڑے جانے پر ذرا شرمندگی سے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو ٹھیک ہے آپ آدمی پیالی پی لیں یا اس سے کم۔“ اس نے میرے کم چائے پینے کے مطلب کو یوں مذاق میں بیان کیا، جس پر مجھے اپنی مسکراہٹ دہانی مشکل ہو گئی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ ایک دم سے بولا۔

”کیا، کیا، کیا، میں نے؟“ میں پھر سے بوکھلا گئی۔

”بھئی ہنسی آرہی ہے تو کھل کر ہنسیں۔ یہ کیا تم لڑکیاں ہر وقت اپنی ذرا ذرا سی خوشیوں کا

بھی قتل کرتی رہتی ہو۔“ اس نے میرے کتابیں خود اٹھا لیں اور مجھے گویا ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”یہ زندگی بذات خود اک زہر ہے۔ تکلیف ہے۔ مسلسل آزمائش کا نام ہے اور اس میں اگر چند لمحے بھولے سکے سے آکر گدگداتے ہوں تو وہی لغت ہیں..... انہیں غنیمت جان کر اس پر

شکر کرنا چاہیے اور پتا ہے شکر کا سب سے بہترین طریقہ کیا ہے؟“

وہ بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا اور میں اس کے ساتھ چلتی ہوئی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اندر سے کیا ہے اور باہر سے کیا؟

”کیا ہے؟“ میں نے اس سے شکر کرنے کا طریقہ پوچھا بندہ ان چند لمحوں کو جکڑ لے اور پھر جینے کا بھرپور لطف انہیں لمحوں میں لے۔ جی کھول کر بنے اور مستی میں آ کر جموے کہ پھر..... پھر جانے وہ لمحے دوبارہ کب ملیں۔ ملیں یا نہ ملیں چنانچہ جیو ہنسو اور جینے کے مزے لوٹو..... جتنے بھی میسر ہوں انہیں دگنا کر لو بلکہ اپنے لیے خوشیوں کو خود مقدر کر لو۔“ وہ بول رہا تھا اور میں اسے سن رہی تھی..... ہم کیسے میرا آ گئے۔

آج میں پہلی بار اس کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ بلکہ میں تو آج پہلی بار کسی لڑکے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔

میرے کل پندرہ کلاس فیلوز لڑکے تھے، جبکہ ہم بارہ لڑکیاں تھیں۔ ان پندرہ لڑکوں کے ساتھ میری بات چیت بہت کم کم ہی ہوتی تھی، بس عام سی سلام دعا تھی ان میں سے کسی کے ساتھ بھی مع اس وجہ الدین کے میں نے کبھی دس منٹ بھی تنہا بات نہ کی تھی، کیسے میرا آنا تو بہت ناممکن بات تھی..... مگر اب جبکہ دو برس انہی سارے کلاس فیلوز کے ساتھ پڑھ کر ہم لوگ اپنی تعلیم سے تقریباً فارغ ہو چکے تھے، اپنے سالانہ امتحانات سے بھی فارغ۔ اب تو ہم لوگ اپنے اپنے تھیس میں جتے ہوئے تھے.... اور اب یونیورسٹی کے الوداعی دنوں میں۔ میں اپنے ایک کلاس فیلو وجیہ الدین کے ساتھ یہاں کیسے میرا میں آئی تھی..... کیسے میرا کے مالک سے لے کر بیروں تک کی نظروں میں مجھے وجیہ الدین کے ساتھ دیکھ کر حیرت تھی اور وہ مجھے نظروں ہی نظروں میں تول رہے تھے۔

”ارے تم کیا سوچ کر پریشان ہو رہی ہو۔ چھوڑو انہیں یہ دنیا ہے.....؟“

وجیہ نے جیسے پھر میرا ذہن پڑھ لیا اور میری اس پریشانی کو بھانپتے ہوئے بولا جو مجھے ان سب کی کھورتی ہوئی آنکھوں سے ہو رہی تھی جواب مجھے جیسے لگی تھیں۔

”اس دنیا کو بڑی فراغت ہے۔ اس کے پاس سوائے اس کے دو جا کوئی کام نہیں کہ یہ دوسروں کو گھورے اور پھر ان پر اٹھیاں اٹھائے۔ انہیں صرف دوسرے گھروں میں جھانکتے کی عادت ہوتی ہے۔ اپنے من کے چچہ پھڑے انہیں دکھائی نہیں دیتے۔“ اس وقت وہ ایسی سنجیدہ گفتگو کرتا ہوا بڑا سمجھ دار بڑا ہی زمانہ شناس دکھائی دے رہا تھا اس کی آنکھیں اب اور گہری اور سیاہ ہو چکی

تھیں۔ جیسے ان میں واقعی ڈھیروں زہر گھلا ہوا ہو۔ اس کی شرارت معدوم ہو چکی تھی اور باتوں میں کڑواہٹ آچکی تھی مجھے جانے کیوں اس کا دکھی ہونا اچھا نہ لگا۔

”ارے چائے کا آرڈر دیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی توجہ اس بیرے کی طرف منتقل کی جو پچھلے تین چار منٹ سے اس کی کرسی کی پشت پر کھڑا تھا اور جس کی میلی میلی آنکھوں میں چھپے کئی ذومعنی سوال مجھ پر اچھل رہے تھے۔

”کیا معاملہ ہے؟“

”تم آج اس کے ساتھ کیوں آئی ہو؟“

”جہیں کیا ہو گیا ہے.....؟“

”ضرور کچھ گڑبڑ ہے..... ہاں..... ہاں تم دونوں کے بیچ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔“

آخر میں وہ سوال خود ہی الزام بن گئے بالکل درست اور حتمی الزام..... اور یہ وہی الزام تھا..... جو یہ لوگ واقعی ہر مرد و عورت کو ایک ساتھ دیکھ کر لگا دیا کرتے ہیں۔ اور جس کی سب سے معمولی سزا رسوائی اور بدنامی ہوا کرتی ہے میرا جی رسوائی کا سوچ کر حلق میں آگیا اور میرے لیے وہاں بیٹھنا مشکل بلکہ بے حد دشوار ہو گیا..... پھر چائے پیتے پیتے جو تھوڑا وقت ہم ساتھ رہے اس میں وہ زمانے اور اس کی ستم ظریفیوں پر بات کرتا رہا اور میں خاموشی سے اپنی چائے ختم کرنے میں لگی رہی۔

”اف! یہ چائے بھی ختم نہ ہو رہی تھی۔ ایک تو یہ اتنی گرم جانے کیوں ہوتی ہے۔“ مجھے چائے پر غصہ آ رہا تھا اور میں تو بس اخلاقا اس کا ساتھ دینے کو چائے پی رہی تھی ورنہ مجھے وہ ”گرم سیال“ کے سوا کچھ نہ لگتی تھی۔

”کمال ہے تمہیں چائے نہیں پسند..... حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی حقیقی کام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“ اس نے پھر میرا ذہن پڑھ لیا اور میں اس کی اس صلاحیت سے خوفزدہ ہو گئی۔

”جانے یہ اور کیا کیا پڑھ چکا ہو گا میرے ذہن سے کہیں..... کہیں اس نے وہ تو نہیں جان لیا۔“ مارے شرمندگی کے میرا برا حال ہو گیا۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ وہ چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے

بولتا۔

”اوئے سنڈی! یہ اٹھا لیتا۔“ وجیہ الدین نے اپنی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال

کر میز پر رکھتے ہوئے سامنے کرتے ہوئے ہیرے کو آواز دے کر کہا۔ سنڈی کہہ کر پکارنے پر جہاں اس غریب ہیرے کے ماتھے پر ناپسندیدگی اور کچھ شرمندگی کی لکیریں نمودار ہوئیں وہیں کیفے میرا میں بیٹھے لڑکے اور لڑکیوں کے قہقہے بھی گونجنے لگے۔

میں نے دیکھا اس لڑکے نے اس کے باوجود وہ پچاس روپے کا نوٹ اٹھاتے ہوئے وجیہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی آنکھوں میں اس پچاس کے نوٹ میں موجود اپنی شپ کو دیکھ کر ایک چمک سی آگئی تھی اور ماتھے پر پڑی ناپسندیدگی کی لکیریں فوراً ہی مٹ گئی تھیں۔ ایک غریب اور ضرورت مند شخص شاید اس سے زیادہ دیر تک اپنی بے عزتی کے احساس کو پال بھی نہیں سکتا کہ اس کے پالنے کے لیے اور بہت کچھ ہوتا ہے۔

”اچھا تو مس عرصہ ممتاز صاحبہ! اب اجازت مجھے ذرا اسپتال میں کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔ البتہ کل ضرور ملاقات ہوگی۔“ اس نے مجھے اللہ حافظ کہتے ہوئے بڑے وثوق سے کل پھر ملنے کا ارادہ ظاہر کر دیا اس اعتماد کے ساتھ کہ میں بھی اس سے کل ضرور ملوں گی۔

”اللہ حافظ اور شاید میں کل یونیورسٹی نہ آؤں؟“ میں نے یونہی بے ساختہ کہہ دیا حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ لمحہ بھر پہلے بھی نہ تھا۔

”اچھا خیریت؟“ وہ مجھ سے نہ آنے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔

”بس یونہی۔“ میرے پاس چونکہ کوئی بہانہ نہ تھا اس لیے میں نے کہہ دیا۔

”اس کا مطلب ہے ہم میں تو بہت سی قدریں مشترک ہیں۔“ اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی۔ اس سے قبل کہ میں اس سے اس کا مطلب پوچھتی وہ خود ہی بولا۔

”یعنی میں بھی ایسا ہی ہوں۔ بے حد موڈی، ٹھہراؤ تو سمجھو میری طبیعت میں ہے ہی نہیں۔“ وہ بڑے فخر سے یوں بولا جیسے اپنی کوئی اعلیٰ صفت بیان کر رہا ہو۔

”خوب گزرے گی جوں بی جوں گے دیوانے دو“ اس نے ذرا سنگتنا کر بڑے اعتماد سے

کہا۔

جس پر میری دھڑکنیں پھر سے کھٹکھٹو بن کر اک دو بے سے ٹکرانے لگیں..... اور میں اپنی اس کیفیت کو اس انٹریامی سے چھپانے کے لیے جھٹ وہاں سے بس اسٹاپ کی طرف چل دی..... اور وہ ہنستا سنگتنا تا ہوا بوائے ہاشل کی طرف۔

ہم دونوں ہی خوش تھے اور دونوں کا ہی کل پھر ملنے کا ارادہ تھا۔

شام کے پانچ بجتے کو تھے..... میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے اپنے روزمرہ والے  
 غسل میں خوتھی..... سورج کی کرنوں پر دیرے دیرے زردی چھا رہی تھی اور اس کی تیز چمک  
 اب آنکھوں کو چند حیا نے کے بجائے قدرے نرم اور ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ آج ہوا بھی بڑی  
 خوشگوار تھی یا مجھے ہی لگ رہی تھی۔ مجھے تو آج سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ میری اداسی اور ناامیدی  
 اب ایک طمانیت میں بدل رہی تھی..... میں خاموشی میں بھی ہمسکام تھی، سوال و جواب جاری  
 تھے..... چپ کہتی تھی اور چپ سنتی بھی تھی..... آج مجھے یوں سوچنا اور سوچتے سوچتے کہیں کھوجانا  
 اچھا لگ رہا تھا..... خلاؤں میں دور ہی دور دیکھنا اور چونک جانا اچھا لگ رہا تھا۔

”وجیہ!“

”مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

”شاید محبت.....“

”محبت.....“ میں یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں معلق ہو گئی۔ ”ہاں بھی محبت.....“  
 دوسری جانب بھر پور یقین تھا۔

”لیکن مجھے تو محبت سے چڑ ہے۔ میں تو اسے دماغ کا وہ خلل سمجھتی ہوں جو انسان سے  
 اس کا شرف چھین لیتا ہے۔ اسے خرد سے بے گانہ کر کے دیوانہ بنا دیتا ہے۔“

”تمہیں محبت سے چڑ نہیں اس کے ہو جانے سے خوف ہے۔“

”میں بزدل نہیں ہوں جو خوف کھاؤں۔“ مجھے اپنے ظرف پر یہ بات بھاری لگی۔

”خوف نہیں تو پھر سامنا کرو۔ جاؤ آئینہ دیکھو۔“ اس نے مجھے دھکیلا۔

”کیا ہے آئینے میں۔ میں ہی تو ہوں عصمہ ممتاز! اور کیا ہے؟“ میں نے آئینے میں سر  
 سے پاؤں تک خود کو دیکھا۔

”غور کرو۔ کیا تمہارا عکس یکتا ہے؟ کہیں منقسم تو نہیں ہو رہا؟“ مجھے کشمکش میں ڈال دیا

گیا۔

”منقسم..... اور میں؟“ میں نے پھر سے غور کیا۔

”نہن..... نہیں تو؟“ میں نے فوراً ہی گھبرا کر نفی کر دی، حالانکہ میرے عکس میں

وضاحت نہیں، وحند لاہٹ تھی۔ تصویر بٹ رہی تھی۔ لکیریں دودھ ہو رہی تھیں۔

”یہی تو ہے آغاز محبت.....“ ان گہری سیاہ آنکھوں میں اعتماد بھرا تھا۔



”اور انجامِ محبت؟“ میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا، کیونکہ جس چیز کے آغاز نے میرے عکس کو منتشر کر دیا تھا..... اس کا انجام تو شاید مجھے نقطوں میں بانٹ دیتا۔ بے حیثیت اور بے معنی نقطے جن کا اہنا وجود تب تک تسلیم نہیں کیا جاتا، جب تک کوئی لکیر انہیں سہارا دے کر ”حرف“ نہ بنا دے۔

”انجام.....؟ اللہ جانے.....“ وہ پھر شرارت سے مسکرایا۔ ”مگر میں تو محبت کرنا نہیں چاہتی۔ نہ ہی مجھے محبت کرنے والی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“ میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”جو لوگ محبت کرتے ہیں انہیں محبت ہو جایا کرتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ وہ جتلائے محبت ہو جایا کرتے ہیں۔“ اب وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا۔  
 ”یعنی؟“ مجھے اس کی یہ فلسفیانہ بات سمجھ نہ آئی۔  
 ”یعنی محبت کرنا تو خوشی کی بات ہے۔“  
 ”اور محبت کا ہو جانا؟“ میں پھر ڈر گئی۔

”ہو جانے والی چیز تو ”بیاری“ ہی ہو سکتی ہے۔ جو سکون تو نہیں دے سکتی۔“ وہ صاف صاف بتا رہا تھا، حالانکہ میری ڈری سہی سی حالت دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے تکلیف دہ.....“ میں نے اس کی پوری بات کو معنی دیے۔  
 ”ہاں کہہ سکتی ہو۔ مگر اس تکلیف میں بھی راحت ہوتی ہے۔ درد میں بھی کیف ہوتا ہے۔ محبت کا کرنا یا ہو جانا۔ دونوں میں زندگی ہے۔“ وہ مجھے چکارنے لگا تھا۔  
 ”تو میں کیا کروں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ میں نے اس سے رائے مانگی اور وہ خوشی سے دمک کر چمک کر بولا۔

”محبت کرو۔ عصمہ بیگم محبت..... کہ محبت ہی تو زندگی ہے۔“ اس نے مجھے جھکی دے کر میری اہت بندھائی۔  
 ”وجہ!“ میں نے اس کی سپردگی میں اپنے دل و دماغ کو دیتے ہوئے اک سرشاری محسوس کی۔

”عصمہ!“ وہ میری سماعت سے روح تک گھل گیا۔  
 سورج کا زرد قتال مغرب کی گود میں اتر رہا تھا۔ شام کے آخری لمحے رات کے پہلے

پلوں میں رچ رہے تھے..... دونوں کے روپ بدل رہے تھے۔ اور تبدیلی کا یہ عمل دراصل تخلیق کا عمل تھا۔ روشنی سے اندھیرے کی تخلیق ایک دن کے خاتمے پر نئی رات کا آغاز اس وقت مجھے رات اچھی لگی۔ شاید اس میں اور وجیہ کی آنکھوں میں سپاہی کی قدر مشترک تھی اس لیے..... میں نے کھڑکی کے پٹ ہاتھ بڑھا کر دیکھنے اور انہیں بند کر کے بستر پر آگئی۔



”ماما! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد میں بڑے اعتماد سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم خود سے مجھے کچھ کہو..... درنہ تو میں خود آج تم سے بات کرنے والی تھی۔“ وہ مجھے اس طرح بات کرتا دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

”آؤ بیٹھو یہاں میرے پاس۔“ ماما نے میرا ہاتھ تمام کے مجھے اپنے قریب بٹھالیا۔ اور پھر بڑی ہی محبت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ ان کے یوں دیکھنے سے مجھے ہمیشہ کی طرح گھبراہٹ ہونے لگی۔ جانے ان کی آنکھوں میں کیا جادو تھا۔ میں ان کی گرفت میں آکر بے بس ہو جایا کرتی تھی۔

”ماما! میں نے اپنے لیے کسی کو پسند کر لیا ہے۔“ ان کی آنکھوں کی گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی میں نے بات شروع کر دی۔

”کس کو؟“ ماما کی نظروں میں محبت کی جگہ کچھ حیرت اور غیر یقینی نے لے لی۔

”وجیہ الدین پیرزادہ.....“ میں نے بغیر انکل کے اس کا پورا نام لیا۔

”یہ کون ہے؟“ اب وہ حیرت سے نکل پریشانی میں داخل ہو گئیں۔

”میرا اکلاں فیلو ہے۔“ میں نے قدرے بدتمیزی سے بتایا۔

”تم نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا..... یہ اچانک؟“ ان کی پریشانی گہری ہو رہی تھی۔

”محبت اچانک ہی ہوتی ہے۔“ بدتمیزی سے میں بے باکی پر اترا آئی۔

”محبت.....“ وہ تو جیسے شا کڈ ہو گئیں۔ ”ہاں محبت ماما! میں وجیہ کے علاوہ کسی اور سے

شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ میں نے انہیں اٹل لہجے میں بتا دیا اور اس لیے بتا دیا کہ وہ نصیر احمد سے میری شادی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیں۔

”اچھا کون لوگ ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کی شہرت کیسی ہے؟ کچھ جانتی بھی ہو تم ان

لوگوں کے بارے میں یا محض اس چار دن کے احساس جس کا نام تم نے ابھی ابھی محبت سے لیا، پر ہی عمر گنوانے کا سوچ لیا ہے۔“

اب کی بار ماما مجھ سے کافی حد تک شاکی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے بحث کر کے بات کو بڑھانا ضروری نہ سمجھا اور بڑے اہل انداز میں یہ کہہ کر وہاں سے چل دی کہ ”جو آپ کی مرضی ہو سمجھ لیں..... مگر میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ وہ میرے پیچھے کیا کہتی رہیں اور ان کے چہرے پر کیسے تاثرات تھے، مجھے ان کی آج پروا بھی نہ تھی اور میں پروا کرتی بھی کیوں، کس کے لیے کرتی؟ زندگی تو میری تھی۔ پھر میں اسے کسی اور کی خوشی پر نثار کیوں کر دیتی۔

اپنے لیے خود سوچ..... جیو اور زندگی کے مزے لو۔ مجھے وجیہ کی اسی نصیحت پر عمل کرنا تھا۔ آج مجھے ماما کے دل دکھنے کا خیال بھی نہ آیا۔ حالانکہ پہلے تو میں جب بھی ماما کے ساتھ بدتمیزی کرتی تھی تو کچھ ہی دیر کے بعد جا کر معذرت بھی کر لیتی تھی۔ میں ان کے ساتھ اختلاف رائے رکھنے کے باوجود کبھی ان کے مخالف نہ ہوتی تھی۔

مگر آج! آج تو میں نام صرف ان کے مخالف جا رہی تھی، بلکہ مجھے اس پر شرمندگی کا احساس تک نہ تھا..... میں تو بس چل پڑی تھی۔ اپنے لیے خوشی اور راحت کو تلاش کرنے..... اور زندگی کو چھینے..... میں اور وجیہ چند دنوں میں ہی ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے..... اتنے کہ ہمیں اک دو بے کی چند گھنٹوں کی جدائی بھی سوہان روح لگنے لگی۔

میں محبت کے نشے میں میں ایسی کھوئی کہ مجھے پلٹ کر یہ دیکھنے کا خیال بھی نہ رہا کہ میری ماما کو میری اس روز کی چرب زبانی نے کتنا زخمی کر دیا تھا..... مجھے تو وجیہ کی محبت نے باقی سب رشتوں سے بے گانہ اور اپنے گرد و پیش سے بالکل ہی غافل کر دیا تھا..... میں صرف اپنے لیے سوچنے لگی تھی اور اسی تک دود میں جت گئی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو میں اپنی منزل کو حاصل کر لوں۔ اب میری ابتدا کو پر لگ گئے تھے اور میری انتہا وجیہ سے شادی تھی..... میرا خیال تھا ہر محبت کی انتہا یہی ہوتی ہے۔

میرا نظریہ محبت بس اتنا محدود ساعی تھا کہ جسے چاہو اسے پالو..... اور پھر باقی کی زندگی ساتھ میں گزار دو..... اسی لیے میں نے وجیہ پر داؤڈا لٹا شروع کر دیا تھا۔ میں جلد از جلد ایسا چاہتی تھی..... مگر کیوں؟ شاید اس لیے بھی کہ نصیر احمد کا خوف ابھی میرے اوسان پر طاری تھا..... وہ نکو ارباب بھی میرے سر پر جوں کی توں لٹک رہی تھی۔ ماما میری اس دن کی بے باکی کے باوجود ابھی

تک وجیہ پر رضامند نہ تھیں، جس کا مطلب تھا کہ ابھی انہوں نے خاتون آپا کو انکار نہیں کیا۔  
 ”وجیہ!“ میں نے اسے ہولے سے پکارا..... اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا مجھ میں محو تھا۔

”ہوں.....“ اس نے آنکھیں جھپکے بغیر کہا۔

”وجیہ! تم نے اپنی امی جان سے بات کی۔“ میں اس کی محویت کو توڑنا تو نہ چاہتی تھی مگر اسے اس معاملے کی طرف متوجہ کرنا بھی بے حد ضروری تھا۔

”ہاں کی ہے۔“ اس نے لمحہ بھر کو اپنی آنکھیں میرے چہرے سے ہٹا کر کہا۔

”تو پھر.....؟“ مجھے اس کا جواب سننے کی جلدی تھی۔

”عصمہ! ابھی وہ میری بات سن تو رہی ہیں مگر.....“ وہ کچھ پریشان لگا۔

”ابھی وہ ماننے کو تیار نہیں ہیں.....“ اس نے صاف کہہ دیا۔

”یعنی وہ ہمارے شادی پر راضی نہیں ہیں۔“ میری آواز مردہ سی ہو گئی اور چند لمحے پہلے ہسکتا..... آنکھیلیاں کرتا دل جیسے خوف زدہ ہو کر سہم سا گیا۔

”وہ تمہارے گھر آ کر رشتہ مانگنے پر تیار نہیں ہو رہی ہیں۔ ورنہ انہیں ہماری شادی پر تو کوئی اعتراض نہیں۔“ مجھے پریشان ہوتا دیکھ کر وجیہ نے میرا ہاتھ پیار سے تھامتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ اگرچہ مجھے حوصلہ بڑھانے کے لیے تھی مگر میرا دل پھر بھی سہا ہوا تھا۔

”عصمی پلیز.....! کیا ہو گیا تمہیں.....“ وہ میرا زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر خفا ہونے لگا۔

”دیکھو میری امی مائیں یا نہ مائیں مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمہیں بھی نہیں پڑتا چاہیے۔“ وہ اپنے انداز میں مجھے سمجھانے لگا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔“ میں نے ذرا غصے سے کہا اور اٹھ کر جانے لگی۔

”دیکھو میری جان! اس طرح ذرا ذرا بات پر خفا ہونا اور منہ بسورنا بالکل بھی اچھا نہیں ہوتا اور مجھے تو ویسے بھی روٹی بسورتی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔“ اس کے لہجے میں نرمی اور پیار ہونے کے باوجود آنکھوں میں ذرا سختی تھی جس پر میں نے وہاں سے جانے کا فیصلہ فوراً ہی ترک کر دیا۔

”تو میں کیا کروں وجیہ! ادھر میری ماما ہیں کہ نصیر احمد پراڑی ہوئی ہیں ادھر تمہارے گھر سے کوئی تیار نہیں اس پر بھی تم اتنے پرسکون.....؟“ میں نے اپنی سوالیہ نگاہیں اس پر جمادیں کہ آخر

کیا ہوگا؟

”ہوگا یہ عصمہ ممتاز! کہ میں اور تم شادی کر لیں گے۔“ اس نے اتنی سہولت سے یہ بات کہہ دی کہ مجھے اس کے نارمل ہونے پر شک گزرنے لگا۔  
 ”یعنی میں اور تم اپنے اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر.....؟“ میں نے شاکی لہجے میں کہا۔

”ہاں میں اور تم اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر.....“ وہ اسی رسان سے بولا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”عصمی ڈارلنگ! مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے محبت ہے اس لیے اب ہمیں کسی اور سے کیا غرض۔ زندگی ہماری ہے مرضی بھی ہماری ہونی چاہیے۔“ اس کا نظریہ زندگی اور محبت کا فلسفہ ایک ہی تھا اور وہ گاہے گاہے اسی کا اظہار اور پرچار کرتا رہتا تھا۔

”مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے ہمارے والدین.....“ مجھے فی الحال اس سے اتفاق نہ تھا۔  
 ”کیا ہمارے والدین.....؟ ہم نے انہیں بتایا تو ہے۔ کہا تو ہے ہماری پسند اور ہماری مرضی یہ ہے اب اور کیا کریں؟“ وہ بھی ذرا غصے میں آ گیا۔

”ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں اپنی خوشی کے لیے منائیں۔“ اب میں نے اسے سمجھانا شروع کیا۔

”کوئی کسی کی خوشی کے لیے راضی نہیں ہوتا..... یہاں ہر ایک کو اپنی غرض ہوتی ہے۔“ وہ اپنے نظریات پر اٹل تھا۔

”کوئی..... تو غیر یا اجنبی لوگ ہوتے ہوں گے۔ یہ تو ہمارے والدین ہیں۔ انہیں ہم یوں نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ میں نے اس کے گرم ہاتھوں پر اپنے نرم ہاتھوں کا دباؤ ڈالا گویا میں اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی جس میں اب بغاوت کا عنصر بھی شامل ہو چکا تھا۔

”ہم والدین کو نظر انداز نہیں کر سکتے، بھلے وہ ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کرتے رہیں۔“ اس کے سوال سے زیادہ اس کی آنکھوں میں چہمن جو کسی پرانے زخم میں ہوتی ہی رہتی ہے خواہ وہ زخم مندمل ہوئے برسوں بیت گئے ہوں۔ ایک ہلکی سی خارش..... ایک مدم سی ٹیس جسے پھر سے کھرچنے کو اپنے ہی ناخنوں میں تحریک چھپاتی ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اسے چھیل لیا جائے۔  
 ”پلیز وجیہ! خود پر قابو رکھو ہم پھر بات کریں گے۔“ میں نے بات کا رخ ہی موڑنا چاہا

تاکہ وہ غصے میں نہ آئے۔ اس کا غصہ اگرچہ زیادہ دیر کا نہیں ہوتا مگر اس کی کیفیت دیر تک اذیت دیتی تھی۔ خود کو بھی اور دوسرے کو بھی۔ مجھے اس کی عادتوں اور کیفیتوں کا اب کافی حد تک اندازہ ہو چکا تھا اس لیے میں اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے ہی دل کا حال پڑھ لیا کرتی تھی۔  
 ”عصمہ! سنو! بات ہم آج کریں یا برسوں بعد..... یہ اسی جگہ اٹل رہے گی۔ ہمیں اگر شادی کرنی ہے تو اپنے والدین کی مرضی کے بغیر ہی کرنی ہوگی۔ ورنہ.....“  
 ”ورنہ کیا وجہ.....“ میں اس کی ادھوری بات کے ”ورنہ“ پر لرز اٹھی۔

”ورنہ ہمیں عمر بھر کے لیے ٹھہر جانے اور پاک دوجے سے دور رہنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔“  
 اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں اک اک حرف پر زور دے کر کہا اور پھر میری طرف نگاہ کیے بغیر ہی اپنا لائٹ اور سگریٹ کیس اٹھا کر چلا گیا میں بھی اسے روکنے کے لیے نہ اٹھی اور نہ ہی لپک کر اس کے ہم قدم ہوئی۔ وہ چلا گیا اور میں اس کی پشت پر خالی نظریں جمائے خالی ذہن بیٹھی رہی۔



”ماما! آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اب تک.....“ شام کو میں نے موقع غنیمت جان کر پھر سے بات شروع کر دی۔ ماما اس وقت لان کی صفائی کروا رہی تھیں میں وہیں ان کے پاس چلی آئی اور رسمی حال چال پوچھنے کے بعد اصل معاملے کی طرف آگئی۔  
 ”کس بات کا جواب.....؟“ انہوں نے قدرے اجنبیت سے پوچھا۔

”ماما! وہ میں وجہ الدین کی بات کر رہی ہوں۔“ مجھے دوبارہ سے ایسا کہنا اچھا نہ لگا۔  
 ”اچھا وہ بات..... میں اس بات کا کیا جواب دوں۔ پھر تم نے مجھے صرف اپنی مرضی بتائی تھی اس پر میری رائے یا مشورہ کب مانگا تھا۔“ وہ یاس بھری آواز میں بولیں۔  
 ”ماما! آپ بھی..... حد کرتی ہیں۔“ مجھے ان کی آواز اور زرد آنکھوں نے بوکھلا دیا۔  
 اف کس قدر مشکل ہے ماما سے نظریں ملانا خواہ وہ خوش ہوں یا اداس مگر سمندر دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے اپنے ڈوبتے دل کو سنجال کر سوچا جوان کی آنکھوں میں غوطہ زن تھا۔  
 ”آؤ بیٹھو..... ایسی باتیں اتنی عام نوعیت کی نہیں ہوتیں کہ چلتے پھرتے یا کھڑے کھڑے ہو جائیں۔“ وہ میرے ساتھ خود بھی بیٹھتی ہوئی بولیں۔

”دیکھو عصمہ!“ ہم دونوں لان میں بھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ میری آنکھیں بے اختیار انھیں اور پھر ان کی آنکھوں سے الجھ گئیں۔

”عصمہ! تم اس وقت اپنی زندگی کے دورا ہے پر کھڑی ہو۔ راستے تمہارے سامنے ہیں۔ دیکھو بیٹی! میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ کون سا راستہ کس سمت میں جاتا ہے اور کس رستے کے اختتام پر کیا ہے؟ اب تم کس راہ پر قدم رکھتی ہو یہ تمہاری مرضی ہے۔“ وہ پیار سے مجھے سمجھانے لگیں۔

”ماما! راستے کا انتخاب تو میں نے کر لیا ہے اور آپ کو میں نے بتا ہی دیا ہے۔“ میں نے ماما کی نصیحتوں سے بچنے کے لیے کہا۔

”عصمہ! تم نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ بھلے آج پھولوں کی راہ گزر دکھائی دے رہا ہو مگر اس کے اختتام پر کوئی منزل نہیں ہے۔“ وہ پھر بھی مجھے سمجھانے لگیں۔

”آپ محض اس لیے میرا حوصلہ گرا رہی ہیں کہ یہ راستہ آپ کو پسند نہیں ہے۔“ میں نے ان کے دبدبو ہونے میں تامل نہ کیا اور انہیں اعتماد سے جواب دینے لگی۔

”تم یہ کیوں نہیں سننا چاہتی ہو کہ وہ راستہ مجھے کیوں پسند نہیں ہے؟“ ماما نے بڑی لجاجت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جانتی ہوں میں..... میں نے لا پرواہی سے کہا۔

”کیا..... کیا جانتی ہو تم.....؟“ ان کے انداز میں بے بسی نظر آنے لگی۔

”یہی کہ آپ نے میرے لیے نصیر احمد کو جن لیا تھا اب اس کے سوا آپ کو کوئی اور نہیں بھائے گا۔“ میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

”یہ درست ہے کہ میں اب بھی نصیر احمد کو تمہارے لیے بہترین شریک حیات سمجھ رہی ہوں مگر وجہ کو تا پسند کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے۔“ وہ بھی اپنا اعتماد بحال کر چکی تھیں۔ ان کے لہجے میں نرمی تو بدستور قائم تھی لیکن لجاجت اور بے بسی معدوم ہو چکی تھی۔

”تو پھر کیا وجہ ہے؟“ میں ان کے منہ سے وجہ سننے کو بے تاب تھی۔

”اس میں تمہارے ساتھ عمر بھر چلنے کی نہ تو صلاحیت ہے نہ ہی سکت اس لیے۔“ انہوں نے بڑے دھوکے سے کہا۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔ آپ اسے اتنی گہرائی سے کیسے جان گئیں جبکہ وہ تو آپ کو

محض ایک بار ہی ملا ہے۔“ مجھے ان کا وجیہ کے بارے میں یہ تجزیہ اچھا نہ لگا۔

میں نے دو روز پہلے ہی وجیہ کو گھر پر بلا کر ماما سے ملوایا تھا۔ وہ تو زیادہ دیر بیٹھا بھی نہ تھا۔ اس نے تو میرے گھر پر ایک کپ چائے بھی نہ پی تھی اور بس آیا ماما کا حال پوچھا اور انہیں اپنے بارے میں مختصر آبتایا اور پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ حالانکہ ماما اسے کھانے پر روکنا چاہتی تھیں مگر اسے اس وقت اپنے گاؤں جانا تھا۔ اس لیے جلدی میں تھا۔ اب اتنی سی دیر میں ماما کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ میرے ساتھ عمر بھر نہ چلے گا۔ میں نے ماما کو شک سے دیکھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ نصیر احمد کے بجائے وجیہ کو میرے ساتھ دیکھ کر شاید اپنے اندر کچھ حسد کے جذبات محسوس کر رہی ہیں اسی لیے کہہ رہی ہیں۔

”یہ عمر ہوتی ہے نا! جو گزارتے ہیں اس کا ہر لمحہ حالات کی بھٹی میں پک کر نکلتا ہے جو ہمیں پرکھنے کی صلاحیت عطا کرے۔ ہم جب خود بہت سے اچھے برے مشاہدات اور تجربات سے گزرتے ہیں نا۔ تو ہی ہماری آنکھیں کسوٹی بنتی ہیں۔“ انہوں نے میرے خیالات کو پڑھ لیا تھا اسی لیے اپنے کہے پر دلیل دیتے لگیں۔

”ماما آپ کو جو لگ رہا ہے مجھے اس کا کچھ خدشہ نہیں۔“ میں نے پھر بھی وجیہ پر ہی اپنا دل ٹکائے رکھا۔

”یعنی بعد میں جو ہو تم اس کے لیے تیار ہو؟“ وہ بھی زیادہ بحث میں نہ گئیں۔

”ہاں میں بالکل تیار ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا کبھی ہو گا نہیں۔“ میں نے وجیہ کی محبت پر آنکھیں بند کرتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

”یہ بھروسہ نہیں خوش فہمی ہے۔“ انہوں نے میرے اعتقاد کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو محض ضرورت ہے۔“

”ضرورت..... وہ بھلا کس بات کی؟“

”جوانی اور آزادی نے تمہارے ان جذبات کو بھڑکا دیا ہے۔ جو تمہاری جبلت تھے۔ اور

اسی کے نتیجے میں تم نے اپنا طب کو ”محبت“ سمجھ لیا ہے۔ ”محبت“ تو ایسی نہیں ہوتی.....؟“ وہ مجھے سر سے پاؤں تک اپنی نظروں میں جکڑے ہوئے تھیں۔

”محبت“ میں غرض نہیں ہوتی..... نہ اپنے لیے..... نہ کسی اور کے لیے محبت تو بے

لوٹ ہوتی ہے۔ ہمیشہ سکھ اور خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کو راحت دیتی



ہے۔“ ماما مجھے ”محبت“ کے موضوع پر درس دیے لگیں۔

میں درس دیکھتے سے دیے ہی چڑتی تھی لہذا وہاں سے اٹھ ہی گئی یہ کہتے ہوئے کہ  
 ”ماما! آپ یہ بات تسلیم کر لیں کہ میری شادی نصیر احمد سے نہیں بلکہ وجیہ الدین سے ہی ہوگی۔“  
 ”اگر میں اور تمہارے پاپا نہ چاہیں تب بھی۔“ انہوں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔  
 ”تب بھی.....“ میں نے ان کی جانب طنز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے انداز میں بغاوت ہے عصمہ! اور بغاوت تو محبت کا شیوہ نہیں ہوتی۔ محبت تو  
 اسیر کرنا جانتی ہے۔ اثر کر کے اپنا آپ منواتی ہے، محبت..... محبت تو بڑی سے بڑی آزمائش سے  
 گزر کر بھی تازہ دم رہتی ہے اور ٹھککتی نہیں، تم تو چار قدم بھی نہیں چلیں اور گھبرا کر پڑاؤ ڈالنے کا سوچ  
 رہی ہو۔“ وہ مسکراتی ہوئی مجھے باقی تولتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور میں اپنے حوصلے کو چھپانے  
 کے لیے پھر وہاں بٹھری نہیں۔

اگلے روز ماما نے مجھے کہا کہ وجیہ سے کہو اپنے والدین کو لے آئے۔

”لیکن ماما اس کے لیے یہ ممکن نہیں۔“ میں نے نظریں چرا تے ہوئے کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ ماما کا چہرہ ا یکدم سے فح ہو گیا۔

”اس کے والدین بھی آپ لوگوں جیسے ہی ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یا پھر تم یوں کہہ لو کہ تم دونوں ہی باغی ہو چکے ہو اور اپنے اپنے والدین کے سامنے ڈٹ

گئے ہو۔“ ماما کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو کھلی، مگر اس میں جان نہ تھی..... پریشانی ان کے چہرے سے  
 لہو کھینچ رہی تھی۔

”تو آپ مان جائیں نا۔“ میں نے لاڈ سے فرمائش کی۔

”تمہارا مطلب ہے میں تمہیں ایک ایسے گھر میں بھیج دوں جہاں صرف دیواریں ہوں

اور چھت نہ ہو۔“ وہ میرے قریب آ گئیں اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

”عصمہ! ایک شادی شدہ عورت کے لیے صرف شوہر کی محبت ہی نہیں بلکہ پورے

سسرال کی چاہت ضروری ہوتی ہے۔ اسے ایک مرد کی نہیں پورے خاندان کی ضرورت ہوتی

ہے..... اور پھر وہ محبت جس کے ساتھ عزت اور وقار نہ ہو وہ بے کار ہے۔“

”ماما! دنیا میں لاتعداد لڑکیوں کو سسرال نہیں ملتے، مگر وہ اچھی زندگی گزارتی ہیں۔“

میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ہاں ایسا بھی ہوتا ہے، لیکن جن کو صرف شوہر ملیں اور شوہر کے گھر والے نہ ملیں، ان کی زندگی میں احساس تحفظ ہوتا ہے احساس خودی..... کبھی کسی ایسی عورت سے مل کر تو دیکھو۔“ وہ مجھے پیار کرنے لگیں۔

”عصمہ! کوئی فیصلہ تم دونوں ایسا نہ کرنا، جس کی وجہ سے ہماری عزت اور تمہاری محبت دونوں تماشاً بن جائیں۔“ وہ میری منت کرنے لگیں..... اور میرا دل انہیں اس طرح منت کرنا دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

”ماما پلیز! ایسا نہ کریں.....“ میں نے لپک کر ان کے وہ ہاتھ تھام لیے جو وہ میرے سامنے باندھنے کو تھیں..... وہ میرے سینے سے لگ کر رو پڑیں اور میں ان کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

”تمہاری ماما خواہ کی ضد کر رہی ہیں اور شرطیں لگا رہی ہیں۔“

وجیہ الدیں کا منہ پچھلے دو روز سے میرے ساتھ اس بات پر پھولا ہوا تھا اور میں اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وجیہ! میری ماما دراصل یہ سب میری محبت میں کر رہی ہیں، انہیں کچھ خدشات ہیں کہ کہیں بعد میں مجھے....“ میں کہتے کہتے رک گئی۔

”بعد میں کیا.... کیا میں دھوکہ باز دکھائی دیتا ہوں یا کسی گرے پڑے خاندان سے ہوں۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ماما تم سے مل چکی ہیں اور تمہارے بارے میں جان گئی ہیں۔“

”کیا جان گئی ہیں، اگر جانتی ہوتیں تو کیا وہ مجھ پر بھروسہ نہ کرتیں؟“ وہ میری بات کو درمیان میں سے اچکتا ہوا اسی ناراضی سے بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ میری اماں جان اگر تمہیں آکر ٹھیک انہیں شرائط پر بیاہ کر لے جاتی ہیں جو تمہاری ماما لگا رہی ہیں اور بعد میں میری تم سے نہیں بنتی، مطلب میں اگر زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں چھوڑنا چاہوں تو کیا میری اماں یا تمہاری ماما اسے روک سکیں گی؟“

”وجیہ نے اتنی تکلیف دہ بات اتنی آسانی سے اور یوں اچانک کہہ دی کہ میں تو ہکا بکا ہی رہ گئی۔ سچ بات ہے میرا تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔

”وجیہ پلیز..... ایسی بری بات تو مت کہو۔ میرے اعتماد کو ابھی سے تو آزمائش کی آگ میں مت جھونکو۔“ میں رونے لگی۔

”دیکھو میں تو صرف ایک مثال دے رہا ہوں، میرا وہ مطلب ہرگز نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔“ وہ اپنے کہے پر شرمندہ ہو رہا تھا، اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔

”یعنی جو تم کہہ رہے ہو، وہ ہو بھی سکتا ہے۔“ میرا جی خدشوں میں گھر گیا، میں پریشان ہو رہی تھی۔

”اچھا چھوڑو، ہم یہ کیا فضول کی باتیں لے بیٹھے۔ آؤ کہیں ڈرائیو پر چلتے ہیں۔“ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر بات ہی بدل دی اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”آؤ نا، اٹھو بھی۔“ مجھے جوں کا توں بیٹھا دیکھ کر وہ میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے اٹھالے گیا، حالانکہ میں اس وقت کہیں جانا نہ چاہ رہی تھی۔

”وجیہ! مجھے گھر ڈراپ کر دو، پلیز۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے کہا۔  
 ”کردوں گا، مگر ہی ڈاپ کروں گا بلکہ آج تو میں تمہاری ماما سے بھی مل کر جاؤں گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ماما سے..... کس لیے.....؟“ میں نے اور بھی پریشانی سے پوچھا۔  
 ”بس مجھے ان سے ایک بات کہنی ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔  
 ”کیا بات.....؟“ پریشانی سے میرا دماغ سائیکس سائیکس کرنے لگا تھا۔

”بس آج فیصلہ ہونا ہی چاہیے۔“ وہ سامنے سڑک پر نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتا ہوا ویسا ہی بے پروا لگ رہا تھا جیسا وہ اکثر معمولی باتوں پر ہوتا تھا یا پھر ان باتوں پر جو اس کے نزدیک کسی اہمیت کی حامل نہ ہوتی تھیں۔

”کیسا فیصلہ وجیہ! مجھے بتا دو، میں زیادہ پریشانی برداشت نہیں کر سکتی۔“ میں نے تقریباً منت کرتے ہوئے کہا۔

”بہی کہ مجھے.....“ وہ گاڑی کے بریک پر پاؤں رکھتا ہوا بات کو ادھورا چھوڑ کر میرے چہرے پر نظریں جماتا ہوا بولا۔ میں اس کی آنکھوں کی عجیب سی گہرائی سے اس وقت واقعی گہرا گئی اور منہ پھیر کے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”اے..... مس عصمہ۔“ اس نے بڑی بے تکلفی سے میرا چہرہ اپنے ہاتھ سے اپنی طرف موڑتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”آج میں تمہاری ماما سے یہ کہنے جا رہا ہوں کہ مجھے ان کی ہر شرط منظور ہے کیونکہ.....“ میرا دھک دھک کرتا دل میرے کانوں میں آ کر دھڑکنا بھول گیا۔ اس کی بات کا اگلا حصہ میرے لیے بہت کچھ تھا۔ میرا غصہ، جھما ہوا دل بلیوں اچھلنے کو تیار کھڑا تھا۔ بس اس کے

”کیونکہ“ سے آگے بڑھنے کا منتظر تھا۔ اس کی نظریں یقیناً اس سے میرے چہرے پر لگی ہوئی تھیں مگر میری پلکیں میری بصارتوں پر پردہ کیے ہوئے تھیں۔

”کیونکہ میں سچ سچ تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تو میرے کانوں میں ہوتی دھک دھک نفاؤں میں پھیل گئی۔ مجھے لگا ہوا کہ پیروں میں کھٹکھٹو بندھ گئے ہوں اور چمن چمن کی صدائیں میرے گرد دھومور ڈالنے لگی ہوں۔

”عصمہ..... ہم بہت جلد شادی کر رہے ہیں۔“ اس کی بھاری بھر کم گنیر آواز نے میری جھکی پلکوں کو مزید جھکا دیا۔ اگلے چند لمحے خاموشی میں اسی ایک آواز کے دائرے بنتے رہے جن کے ساتھ ساتھ میرا دل ہلکورے لیتا رہا۔

وجیہ کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ لباس سے لے کر اس کی کارٹک، ہر چیز اعلیٰ معیار کی تھی۔ موسیقی میں اس کا ذوق لا جواب تھا۔ وہ غزلوں سے لے کر راک اینڈ رول تک بڑی خوبصورت کلکیشن رکھتا تھا۔ وجیہ الدین بلاشبہ ایک وجیہ انسان تھا۔ بس اس کی سگریٹ نوشی کی عادت سے مجھے کبھی کبھی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی سگریٹ سلگائی اور ایک لمبا کش لے کر اس کا دھواں میری جانب اچھال دیا۔

”وجیہ پلیز.....؟“ اس نے میرے چہرے پر لطف لیتے ہوئے شرارت سے پھر دھواں مجھ پر پھینک دیا، تب تو سچ سچ میرا موڈ آف ہو گیا۔

”وجیہ! مجھے سگریٹ کی بدبو سے گھن آتی ہے۔ تم کیوں پیتے ہو۔“

”سگریٹ کی بدبو.....“ وہ میرے انداز سے برا مانا گیا۔

”اور یہ سگریٹ ہی کیا، میں تو اور جانے کیا کیا پیتا ہوں۔ تمہاری تو زندگی اسی طرح گھبرا گھبرا گزر جائیگی بلکہ یہ نہ ہو کہ تم اپنی حساس طبیعت کی بنا پر میرے ساتھ گزارہ ہی نہ کر سکو۔“ میں نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کو دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا مگر وہ تو سنجیدہ تھا۔

”کک..... کیا مطلب؟“ میرا حساس دل خوف زدہ ہو گیا۔ وجیہ سے جذباتی کا خوف

میرا دم گھونٹنے لگا۔

”مطلب یہ کہ اب تمہیں خود کو بدل لینا چاہیے۔“ وہ بغیر میری طرف دیکھے کہہ رہا تھا۔

یہ عجیب آدمی تھا، خفا ہوتا تو اپنی نگاہیں تک مجھ سے پھیر لیتا تھا اور خوش ہوتا تو مجھے سر سے پاؤں تک اپنی آنکھوں کے سحر میں جکڑ لیتا اور میرے لیے دونوں صورتوں میں اپنے جی سے مغر نہ تھی۔ نہ میں اس کا نگاہیں پھیرنا برداشت کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کی نگاہوں کی گرفت۔ اس کے انداز میں ہر طرح سے شدت تھی۔ وہ صحیح معنوں میں شدت پسند تھا۔ وہ اب بھی مجھ سے نگاہیں پھیرے ہوئے تھا۔ اتنے میں میرا گھر آ گیا۔ اس نے گاڑی روکی، ڈرائیونگ سیٹ سے اترا اور دوسری جانب سے گھوم کر میری طرف کا دروازہ کھولا۔ میں مسکراتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

”واہ..... کیا بات ہے..... کچھ لوگ کتنے بھی خفا ہوں، اخلاقیات نہیں بھولتے۔“ میں نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور کچھ لوگ کتنی بھی محبت کرتے ہوں، اپنی خونیں بدلتے۔“

اس نے مجھے دیکھے بغیر میری بات کا جواب دیا اور دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

”اے مسٹر..... واٹ از دس؟“

میں نے فٹ سے دوبارہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے پتا تھا اب اس نے فراٹے سے گاڑی آگے بڑھا دینی تھی۔

”میں جا رہا ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”اور ماما سے ملنے کا وعدہ؟“ میں نے نرمی سے پوچھا۔

”وہ وعدہ نہیں میرا ارادہ تھا۔“ وہ جھک کر گاڑی کا ڈیش بورڈ کھولتا ہوا بولا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میرے ارادے بدلتے رہتے ہیں مگر وعدوں کا پاس میں مرتے دم تک کرتا ہوں۔“

اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”میرے ساتھ تمہارا محض شادی کرنے کا ارادہ ہے یا عمر بھر محبت بھانے کا وعدہ؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے لرزتے دل کو قہار کر پوچھا۔

”مجھے تم سے محبت ہے اور محبت کو بھانے کا میرا ارادہ ضرور ہے۔ اگر تم ہم قدم رہو تو ہو

سکتا ہے یہ عمر بھر کا بھی ہو۔ وعدہ میں نے کوئی نہیں کیا۔“ وہ بلا جھجک بچ بول رہا تھا۔ نیلکھا اور کھر درا بچ جس نے ایک لمحے کو تو میری خودی کو رگید ڈالا۔

”بہتر ہو گا تم کچھ اور وقت سوچنے کو لے لو۔ میں تمہاری ماما سے کسی بھی وقت مل لوں

گا۔“ اس نے جانے کو گاڑی اشارت کی۔  
 ”اور ہاں.....“ اب وہ کھڑکی سے سر نکال کر میری طرف دیکھ رہا تھا، اسی پیار بھری نظر کے ساتھ۔

”میں ایک معشوق اور محبوب ہونے کے ساتھ ساتھ فطرتاً ایک مرد بھی ہوں۔ مرد جس کی زندگی کبھی بھی عورت پر مکمل آشکار نہیں ہوتی۔ میری زندگی کے بہت سے پہلو ابھی بھی تم سے اخفا ہوں گے اور آئندہ بھی رہیں گے۔ لہذا تم کبھی ایسے معاملات پر مجھ سے باز پرس یا گلہ نہیں کرو گی۔ یہ بھی سوچ لیتا۔“ اس نے میٹھی نظروں سے بڑی کیسی بات پھر بھی کہہ دی جو تمک کے گولے کی طرح میرے حلق میں پھنس گئی اور میری آنکھوں میں پانی اترنے لگا۔

”اچھا..... اللہ حافظ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اسے اللہ حافظ کہا اور تیزی سے گیٹ کے اندر ہو گئی۔ اس کی گاڑی کے تیزی سے ریورس ہونے پر ٹائروں کے چرچانے کی آواز آئی اور ایک فرائٹ سے واپس چلی گئی جبکہ میں گیٹ کے ساتھ گلی تھپی دیر تک اپنے بکھرتے ہوئے وجود کو سنبھالتی رہی۔

اگلے دو روز تک میرے اور وجیہ کے درمیان خاموشی رہی۔ نہ کوئی فون نہ ایس ایس ایس۔ ان دونوں میں، میں نے اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کی سوچ سے آزاد رکھا تھا۔ میں نے وجیہ کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا، نہ اچھا نہ برا۔ میں ایسا سوچنے سے جان بوجھ کر گریز کر رہی تھی۔ ان دونوں میں، میں مکمل طور پر عصمہ ممتاز الحسن ہی رہی، وہ عصمہ جو وجیہ سے ملنے سے قبل تھی۔ یہ دو دن میں نے خود کو کمرے میں بند کر کے گزارنے کی بجائے گھر میں بھرپور انداز میں گزارے۔ ماما مجھے یوں دیکھ کر بے حد خوش تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں مجھے عقل آگئی ہے۔ انہوں نے مجھے پوچھے بغیر نصیر احمد کو چائے پر بلا لیا۔ وہ خاتون آپا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا، جب ماما میرے کمرے میں چلی آئیں۔

”عصمی میری جان! ذرا تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں چائے تولے آؤ۔“ وہ بے حد محبت سے مجھ پر ٹٹا رہتی ہوئی بولیں۔

”جی اچھا..... ابھی آتی ہوں۔“ میں نے بھی نہ پوچھا کہ کون آیا ہے۔

”شباباش، جلدی سے۔“ انہوں نے جاتے جاتے بھی مجھے مسکرا کر کہا۔

میں اوندھے منہ لیٹ لی ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ فوراً اٹھی، ڈریسنگ

نیل کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لیا۔

”بس ٹھیک ہی لگ رہی ہوں۔“ میں نے خود کو دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا اور ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”اوہ..... یہ کیا..... ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی سامنے خاتون آپا کے ساتھ نصیر احمد کو دیکھ کر میں ہنسی۔ میرے تیزی سے اندر داخل ہوتے قدم سست پڑ گئے۔“  
 ”ارے میری بیٹی آگئی۔“ مجھے رکتا دیکھ کر خاتون آپا جھٹ سے آگے بڑھیں اور مجھے گلے سے لگالیا۔

”السلام وعلیکم۔“ میں نے بڑے سپاٹ انداز میں انہیں سلام کیا اور مرے مرے قدموں سے ان کے ساتھ چلتی ہوئی جا کر ماما کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

”السلام وعلیکم۔ کیسی ہیں آپ؟“ مجھے دیکھ کر نصیر احمد کھڑا ہو کر مجھے مخاطب ہوا۔

”وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ اتنے میں چائے آگئی۔

”عصمہ! اٹھو چائے بناؤ۔“ ماما نے بڑی محبت سے مجھے کہا۔ میں نے بغیر کسی حیل و حجت کے اٹھ کر چائے بنائی اور سب کو پیش کر دی۔ چائے کے دوران ماما اور خاتون آپا ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں جبکہ میں اور نصیر احمد چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ سوائے اس کے کہ نصیر احمد نے مجھ سے میرے قمیص کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسا ہوا۔ وہ بڑے ڈینٹ انداز میں بیٹھا تھا۔ جانے کیوں اسے میں نے کئی بار کن اکھیوں سے دیکھا تھا۔ گرے دھاری دار سفید شرٹ اور گریے پیٹ میں ملبوس وہ دیکھنے میں اچھا خاصا شخص نظر آ رہا تھا۔ خوبصورت تو نہیں مگر وہ عام سی شکل کے باوجود اپنے لمبے قد کا ٹھہک کی وجہ سے اسارٹ لگتا تھا۔ وہ کم گو تھا مگر جب بولتا تو نہایت تہذیب سے بات کرتا تھا۔

”یقیناً ماما کو اس کی بھی باتیں اچھی لگتی ہوں گی جو وہ ہر وقت مجھے کہتی رہتی ہیں کہ تم اسے ایک بار اس نظر سے دیکھو اور سوچو تو سہی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”یہ شخص کسی بھی لڑکی کے لیے ایک اچھا جیون ساتھ ثابت ہو سکتا ہے۔“ میرے دل

نے جواب دیا۔

”ہاں یقیناً مگر وہ لڑکی میں نہیں ہوں۔“ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔

”یعنی.....؟“ میرا دل اب بھی نصیر احمد کے لیے راضی نہ تھا پھر میں نے اسے دوبارہ کن



آنکھوں سے نہ دیکھا اور کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ گئی۔ یہ کہتی ہوئی کہ مجھے کچھ ضروری کام کرنا ہے، حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا، میں کہہ دوں۔

”مجھے ذرا وجیہ کو فون کرنا ہے۔ پچھلے چار پانچ روز سے میری اس سے بات نہیں ہوئی،

وہ میرے فون کا انتظار کر رہا ہوگا۔“

”بیٹا! کچھ دیر اور بیٹھیں۔“ خاتون آپا نے مجھے روکنا چاہا۔

”جی برا نہ منائیے گا، مجھے کچھ ضروری کام ہے ورنہ میں ضرور بیٹھتی۔“ آج تو میں نے

انہیں بے حد اخلاق اور محبت سے جواب دے کر ماما کو حیران کر دیا، تب ہی تو مجھے یوں آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے، جاؤ جیتی رہو۔“ خاتون آپا نے مجھے پیار سے دعا دیتے ہوئے کہا۔

”جی شکریہ۔“ میں نے مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا اور ڈرائنگ روم سے باہر آگئی۔ آتے

آتے میرے کانوں میں جو بات پڑی، وہ ماما کی تھی، وہ خوش ہوتے ہوئے انہیں کہہ رہی تھیں۔

”آپا! آپ تیاری کریں، اللہ خیر کرے گا۔ ہم کوئی خواہ مخواہ کی رسوم نہیں کریں گے بلکہ

سادگی سے نکاح ہی کریں گے۔“ میرے جاتے ہوئے قدم لمحہ بھر کو وہاں ٹھہرے۔ واپس ڈرائنگ

روم میں جانے کو چلے مگر میں واپس نہ چلی۔ پتا نہیں کیوں مگر میں کبھی بھی پلٹتی نہیں تھی۔ مڑ کر دیکھنا

میری فطرت میں تھا ہی نہیں۔ میں اگلے ہی لمحے مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی کہ میں نے آگے بڑھنے کا

حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ وجیہ کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ۔



میں اپنا موبائل لے کر چھت پر آگئی تھی۔ آج بڑی سہانی شام تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

چل رہی تھی۔ ہلکے ہلکے بادل بھی ادھر ادھر سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا شاید بارش بھی ہو جائے

گی۔

میں نے وجیہ کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر اس نے فون اٹھا لیا تھا مگر وہ بولا نہ تھا۔ حالانکہ

سننے کو بے تاب تھا۔ میں نے بھی زیادہ غرہ نہ کیا۔

”السلام علیکم وجیہ!“ وہ میرا سلام سن کر جواب دیے بغیر نہ رہ سکا۔

”وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہوں۔“ انداز میں خشکی بدستور موجود تھی۔ مجھے اس پر پیار آ گیا اور

میں سب بھول گئی۔ وہ سب جو تین چار روز قبل میرے اور اس کے بیچ ہوا تھا۔  
 ”کب آرہے ہو، ماما سے ملنے؟“ میں نے بڑے اعتماد سے پوچھا۔  
 ”جب تم کو۔“ وہ بھی نرم پڑ گیا۔  
 ”میں تو چاہتی ہوں کہ تم ابھی آ جاؤ۔“ میں نے لاڈ سے کہا۔  
 ”ابھی، خیر تو ہے۔“ وہ حیران ہوا۔

”بس میرا دل چاہ رہا ہے۔“ میں نے بالکل سچ کہا تھا، واقعی اس وقت میرا دل بڑی شدت سے اسے دیکھنے، اسے ملنے کو چاہ رہا تھا۔  
 ”اچھا آ جاؤ مگر آج کہیں باہر چلیں گے۔ تمہاری ماما سے میں کل اپنی اماں جان کے ساتھ آ کر ملوں گا۔“  
 اس نے اپنی اماں کے ساتھ آنے کا کہا تو میرے کانوں کو یقین نہ آیا۔ جی چاہا اس سے پوچھوں۔

”تو کیا تم نے انہیں منالیا ہے؟“ مگر میں نے نہ پوچھا۔ میں اس کی محبت میں سر پاؤں تک گرفتار تھی، اس کے باوجود میں نے اظہار محبت میں کبھی عامیانا نہ پن اختیار نہ کیا تھا اور خوبصورت بات یہ تھی کہ وہ بھی حال دل کہنے کے لیے الفاظ کا سہارا کم ہی لیتا تھا۔  
 مجھے اپنی یہ محبت اسی لیے تو بے حد عزیز ہو گئی تھی کہ یہ بالکل اسی معیار کی محبت تھی جیسی میں نے کبھی سوچئی تھی جسے میں دل کی لگی سمجھتی تھی، دل لگی نہیں۔ وجہ میرے دل کو ایسا لگا تھا کہ اب میرے جینے کے لیے لازم ہو گیا تھا، اس محبت میں ہجر و فراق کی باتیں میں شامل نہ کی تھیں، میں اپنی محبت کو ”محبت“ ہی رکھنا چاہتی تھی، روگ نہیں بننا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے، تیار ہو جاؤ، میں آ رہا ہوں۔ بس ایک ہارن دوں گا، فوراً باہر چلی آنا۔“ اس نے حکم سے ہی کہا تھا مگر مجھے اس کا خود پر حکم چلانا اب اچھا لگ رہا تھا، شاید اس لیے کہ میں نے اس کے انداز کی زندگی گزارنے کو تسلیم کر لیا تھا۔

”جو حکم میرا صاحب!“ میں نے شرارت سے اسے ہیر صاحب کہا جس پر وہ ایک جاندار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”خوش کیا ای.....“

میں نے اسے اللہ حافظ کہا اور قلائعیں بھرتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اکاؤ کا اکٹھے

ہوئے بادل اب پورے آسمان کو ڈھانک چکے تھے۔ سلیٹی بھرے بھرے بادل جن میں بھرا ہوا پانی چھلکنے کو تھا۔ ہوا میں نمی اور نم مٹی کی مہک شامل ہو چکی تھی جو میرے وجود کو چھوتی تو میرے اندر ایک پرسکون ٹھنڈک کی تاثیر روم تک پھیل جاتی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنی وارڈ روم کھولی۔ سامنے مجھے آسمانی رنگ کا کڑھاٹی والا سوٹ دکھائی دیا۔ آسمانی قیاس دوپٹہ سفید شلوار کے ساتھ گرمیوں میں میرا پسندیدہ ہوا کرتا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کیا۔ ہلکی سی گلابی رنگ کی لپ اسٹک کی ایک تہہ ہونٹوں پر جمائی۔ غارہ لگانے کی ضرورت مجھے اب رہی ہی نہ تھی۔ وجیہ کا ساتھ مجھے قدرتی طور پر بلش کیے رکھتا تھا۔ سفید چنل پاؤں میں ڈالی اور میں تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف لپکی۔ مجھے وجیہ کی گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا تھا اور میں اس کے دوسرے ہارن سے پہلے گیٹ سے باہر اس کے سامنے ہونا چاہتی تھی۔ اس وقت مالی بابا لان میں صفائی کر رہے تھے، مجھے پورچ میں یوں بھاگتا دیکھ کر آگے بڑھے اور انہوں نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔

”شکریہ بابا.....“ میں نے ان کا شکریہ ادا اور سیدھی وجیہ کی گاڑی کے پاس جا کے

رکی۔

”ہیلو..... کیسے ہو۔“ میں پھولی ہوئی سانسوں سے پوچھا۔

”کم از کم اس وقت بہت اچھا۔“ اس نے گاڑی سے اتر کر میرے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔

”یہ تکلف کیوں کرتے ہو، میں خود بھی تو دروازہ کھول کر بیٹھ سکتی ہوں۔“ میں نے گاڑی

میں بیٹھنے کے بعد اس سے کہا۔

”یہ تکلف نہیں، تمہاری عزت ہے، تمہارا حق ہے۔ کیا یہ تمہیں نہیں چاہیے؟“ وہ اپنا

چشمہ اتار کر سیدھا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

اف..... اس کی آنکھیں تمہیں یا جھکڑیاں۔ میں نے گہرا کر نظریں پھیر لیں۔

”ہم ہر عورت کو عزت و تکریم نہیں دیتے اور جنہیں دیتے ہیں، وہ یقیناً خوش قسمت ہوتی

ہیں اور عصمہ! تم..... تم تو بے حد خوش قسمت ہو، یہاں رہتی ہو۔“ اس نے میرا چہرہ داپس اپنی

طرف گھماتے ہوئے اپنے سینے پر بائیں جانب ٹھیک وہاں اپنی شہادت کی انگلی رکھی جہاں اس کا

دل تھا۔

”میری خواہش ہے کہ یہ تمہارا ابدی گھر بن جائے۔ تم جب تک جیو اس دل پر حکمرانی

کرتی رہو۔“

اس نے میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھ دیا تو مجھے لگا دھڑ..... دھڑ کی تیز آواز اس کے سینے سے نہیں بلکہ میرے سینے سے آرہی ہو۔

”اچھا اب بتاؤ کہاں چلیں؟“ وہ فوراً ہی نادل ہوتا ہوا پوچھنے لگا۔

”جہاں تمہارا دل کرے۔“ میں نے بات اس کی مرضی پر چھوڑ دی۔

”اچھا جہاں میرا دل کرے۔“ وہ گاڑی کو مین روڈ پر ڈالنا ہوا بولا۔

”ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے سر اقرار میں ہلادیا۔

”اچھا اگر اس وقت میرا دل کر رہا ہو کہ ہم مری چلے جائیں۔ ایک لمبی ڈرائیو کرتے ہوئے اتنی لمبی ڈرائیو جو تھکا دینے والی ہو لیکن جب ہم رکیں تو ہمارے سامنے قدرت کے حسین مناظر ہوں، آسمان کو چھوتے ہوئے کوساروں کی سرسبز گود ہو اور نرم ہوا کے گداز ہاتھ ہوں جو ہمارے تھکے ہوئے مساموں میں سے ساری تھکن کھینچ لیں۔“ وہ ایک سرشاری کے عالم میں تھا اور کہتا جا رہا تھا۔

”اچھا..... پھر.....؟“ مجھے اس کے ساتھ جانے پر اعتراض نہ تھا۔

”پھر میں کسی کی مہکتی ہوئی زلفوں میں چہرہ چمپا کے سوجاؤں بلکہ پڑا سوتا رہوں، دن اور رات کی تفریق اور اس کا احساس کیے بغیر۔“

آج وہ بڑا دمیٹک ہو رہا تھا، اتنا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خمار تھا مگر اس خمار پر کسی حیا کی چھاپ نہ تھی، وہ تو ایک معصوم بچہ دکھائی دے رہا تھا۔

”تو کیا خیال ہے، رکھوں ایک سیلر پر پاؤں اور نکلوں شہر سے باہر۔“ وہ مجھ سے میری رائے پوچھ رہا تھا۔

”اگر تمہارا یہی دل کر رہا ہے تو میں تیار ہوں۔“ میں نے اس لمحے کچھ بھی اچھا برا سوچے بغیر اس کی مرضی پر سب چھوڑ دیا۔

”اس کا مطلب..... تم نے وجیہ الدین کو دل و جان سے جیت لینے کی ٹھان لی ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستا ہوا بولا۔

”کیا مطلب..... ٹھان لی ہے؟“ میں نے ایک ادا سے ترجمی نظر سے اسے پوچھا جس پر وہ کندھے چپکا کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے اب وہ میری مرضی کا موموں منت ہو۔

”مجھے تو یہ اعزاز حاصل ہو چکا ہے کب کا۔“ میں نے اپنی گردن اکڑا کر کہا۔

”یہ ہوئی ناہات وجیہ الدین میر زادہ کے دل پر راج کرنے والی۔“ اس نے ہرے کا ایک نعرہ لگایا اور واقعی ایک سلیٹر پر پاؤں جمادیا۔

❖ ❖ ❖

اس روز میں کافی دیر سے گھر واپس آئی تھی، مجھے دیکھ کر ماما کے چہرے پر پھیلی ہوئی پریشانی اور ٹھکر کی لکیریں کچھ اور گہری ہو گئیں اور وہ میرے پیچھے ہی میرے کمرے میں آ گئیں۔  
”عصمہ! کہاں سے آرہی ہو؟“ وہ غصے کے باوجود نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔

”ماما! میں کراچی کی سڑکیں ٹاپ کے آرہی ہوں۔“ میں نے ان کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ بے جانی سے جواب دیا۔

”کس کے ساتھ تھیں؟“ انہوں نے جانتے بوجھتے بھی مجھ سے پوچھا مگر میں نے مائنڈ نہ کیا اور بڑے آرام سے کہا۔

”وجیہ کے ساتھ۔“

”تو تم ہا نہیں آؤ گی۔“ اب انہوں نے میرے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے اور چہرہ دوسری جانب پھیر کے کھڑی ہو گئیں۔

”بھلا اپنے عہد سے پھر نا کوئی اچھی بات ہے اور پھر میرا دل وجیہ کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتا۔“

میرا لہجہ کچھ اور دھیما پڑ گیا، میں اپنی ماما کے ساتھ بدتمیزی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں انہیں پیار سے منانا چاہتی تھی۔

”تمہارے پاپا اس بات پر سخت برہم ہیں اور تم سے خود بات کرنا چاہتے ہیں۔“ انہوں نے بھی اپنی آواز کو بلند کیے بغیر کہا۔

”ماما پلیز..... میں پاپا سے کیا کہوں گی، آپ انہیں بتادیں۔“

”اگر تم اپنی زندگی کا اتنا ہم فیصلہ اپنی مرضی سے کر ہی چکی ہو تو انہیں مطمئن بھی کرو۔“ وہ میری مدد کرنے کو تیار نہ تھیں اور مجھ میں پاپا سے بات کرنے کی ہمت واقعی نہ تھی۔

”ماما! وہ کل وجیہ کی اماں اور اس کی بڑی بہن آئیں گی، آپ اور پاپا ان سے مل لیں۔“ میں نے انہیں دوسری جانب متوجہ کیا۔

”لیکن میں اور تمہارے پاپا ان لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے۔“ ماما نے بالکل سٹا انداز میں کہہ دیا مگر میں تو سر سے پاؤں تک جل اٹھی۔

”کیا مطلب، آپ لوگ ان سے نہیں ملیں گے۔ آپ نے تو کہا تھا۔“  
 ”میں نے ضرور اس انداز میں سوچا تھا مگر تمہارے پاپا نہیں مان رہے۔“ انہوں نے مجھے دہناتادی۔

”تو ٹھیک ہے پھر جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے بھی زیادہ بحث نہ کی۔  
 ”اچھا تو کیا کرو گی، ہماری مرضی کے بغیر۔“ وہ طنز کیے بغیر پوچھ رہی تھیں۔  
 ”کورٹ میرج۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔  
 ”کورٹ میرج.....“ ماما کی آواز ریزہ ریزہ ہو کر نکھرنے لگی۔  
 ”یہ آپ کی اور پاپا کی بے جا ضد کی وجہ سے ہو گا ورنہ میں تو اپنا حق مانگ رہی ہوں۔ وہ حق جو مجھے میرے دین اور شرع نے دیا ہے۔“

میں نے دین کا حوالہ دے کر اپنے حق پر اٹھ دکھائی۔  
 ”تمہیں بس اتنا ہی معلوم ہے شرع اور دین کا اور کچھ معلوم نہیں ہے کہ شرع کیا کہتی ہے؟“ وہ میرے سامنے بیٹھ گئیں میرا حتیٰ فیصلہ سن کر۔ ویسے بھی ان کی ٹانگوں میں جان کہاں رہی تھی۔

”کیا شرع ایک جوان لڑکی کو اپنی من مانی اس حد تک کرنے کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنا جیون ساتھی یوں بنے جیسے کہ تم نے چنا۔“  
 اب ان کی آنکھیں اور باتیں دونوں مجھے کاٹ رہی تھیں۔

”میں نے کیا کیا؟“ میں نے بھر بھری آواز میں جواب دیا۔ ایسے کہتے ہوئے میرا دل چور سا ہو گیا تھا۔

”اس کا جواب تم صرف اپنی اور وجیہ کی آج کی ملاقات کو نظر میں رکھ کر سوچو۔ مجھے بھی دینے کی ضرورت نہیں ہے، صرف خود سمجھو۔“  
 انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے قریب آئیں اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

”موصمہ! تم نے جانے کیوں میرے اعتماد کو چکنا چور کر دیا۔ میرے دودھ میری تربیت

کو مجرم کر دیا۔ تم نے عصمہ! اپنے والدین کا دل دکھایا۔ شرمندگی اور ندامت سے ہمارے سر جھکا دیے۔ یہ دین کے زمرے میں کہاں آتا ہے؟ اللہ جو خود اپنے بندوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے جس نے ایک ماں کے قدموں تلے ”جنت“ کو رکھ دیا۔ کیا وہ اسی ماں کی توہین کرنے کی ایک بیٹی کو اجازت دیتا ہے؟ تم نے عصمہ..... اللہ کے احکامات کو صریحاً پامال کیا ہے اور تم شرع کی بات کر رہی ہو۔“ وہ کہتے کہتے رکیں، ان کا ہاتھ میرے سر سے ہٹا اور وہ پھر گویا ہوئیں۔

”سنو، تم نے آج مجھ سے اپنا شرعی حق مانگا ہے، اگرچہ تم نے میری ممتا کے حقوق کا کچھ خیال نہیں کیا پھر بھی میں تمہیں تمہارے اس شرعی حق سے محروم نہ کروں گی۔ اس سے کہو کل اس کے گھر والے یہ ذہن بنا کر آئیں کہ ہم اسی ہفتے میں تمہارے نکاح کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہیں گے اور یہ نکاح بے حد سادگی سے ہو گیا۔“

وہ واپسی کے لیے دروازے کی طرف بڑھیں۔

”لیکن ماما.....“ میں تڑپ کر ان کی طرف بڑھی تاکہ کچھ احتجاج کروں۔

”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی، بس اب ہمارے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے تنبیہ کی اور میرے کمرے سے باہر چلی گئیں جبکہ میں اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ مجھے اس وقت بھی ماما بے حد کٹھور دکھائی دے رہی تھیں۔

”بھلا کوئی ایسے بھی کرتا ہے، وہ بھی اپنی اکلوتی اولاد کے ساتھ۔“ میرا دماغ ان کے روئے کے خلاف سلگنے لگا۔

”ٹھیک ہے، میں بھی آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔ سنبھال کر رکھیں اپنی زمین جائیداد۔“ میں اپنی عادت کے مطابق اپنی سوچ کر اٹھا پر پکڑ گئی۔

”کیا ہو گیا اگر میں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی ہوں تو؟ کیا میں اکیلی ہوں جو ایسا کر رہی ہوں۔ دنیا میں لاتعداد لڑکیاں اپنی مرضی سے شادیاں کرتی ہیں۔ تو کیا ان کے والدین ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔“ میں خود سے سوال و جواب کرتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔

”یہ سب اس نصیر احمد اور اس کی جادوگر والدہ خاتون آپا کی مہربانی ہے جن کی وجہ سے ماما نے میرے خلاف یہ محاذ کھڑا کیا ہے ورنہ شاید ماما ایسا نہ کرتیں۔“ مجھے نصیر احمد ایک ہی پل میں دوبارہ زہر لگنے لگا ورنہ آج دوپہر کو میرے دل و دماغ میں اس کے متعلق کیسے اچھے خیالات آرہے

تھے۔

نصیر احمد کا خیال آتے ہی میرا دل اس کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے لگا اور میں نے اسے باقاعدہ کچھ بددعائیں بھی دے ڈالیں۔

”اللہ کرے اس کا گھر کبھی نہ بے اور اگر بے تو اس خاتون آپا کو اتنی بری بہو ملے جو انہیں دوسرے ہی دن گھر سے نکال باہر کرے۔ جیسے انہوں نے میری ماما کو میرے خلاف کیا ہے۔ یہ ماں بیٹا بھی ایک دوسرے کے نہ رہیں۔“ وغیرہ وغیرہ۔ میں جانے کیا اول فول بک رہی تھی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینک رہی تھی۔ نیچے، کٹن، ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے کوشن۔

”نہیں چاہیے، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ایسی محبت بھی نہیں چاہیے جو خود غرض ہو جس میں حکم ہو۔ مجھے لگتا ہے میں کسی کی اپنی ہوں ہی نہیں۔ سوتیلی ہوں سوتیلی۔ اچھا ہے یہاں سے چلی جاؤں گی۔ سن لیں۔ مجھے یہاں سے بے عزت کر کے نکالنے والے اچھی طرح سن لیں، میں کبھی یہاں پلٹ کر نہیں آؤں گی۔“

میں جان بوجھ کر کبھی دروازے کے پاس اور کبھی کھڑکی میں جا کے چیخ رہی تھی تاکہ ماما کے کانوں تک میری آواز جائے۔

”لوگ ترس جائیں گے میری شکل دیکھنے کو، مر جاؤں گی، جب بھی اپنا چہرہ نہ دیکھنے دوں گی۔“ میں نے چلا کر کہا اور زور زور سے رونے لگی۔ میں غصے میں پاگل ہو رہی تھی، جب ہی نورائیں ماما اندر آئیں۔ یہ بے چاری کسی زمانے میں تو نورتن بیگم تھیں، مغل خاندان سے تھیں، دہلی کا خاص انداز زندگی تھا ان کا مگر وقت کی گرم ہواؤں نے کچھ بھی نہ رہنے دیا تھا۔ حتیٰ کہ لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرنے لگیں تو ان کا نام بھی نورتن بیگم سے نورائیں ماما ہو گیا تھا۔ اب یہ میری ماما کے ساتھ پچھلے دس برس سے تھیں اور ان پر ماما کی محبت کا سارا اثر تھا بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ میری دوسری ماما تھیں۔

”بیٹا! ذرا دھیرے بولے، آپ کی آواز پورے گھر میں گونج رہی ہے۔“ وہ مجھے سمجھانے آئی تھیں۔

”میں سننے کے لیے ہی چیخ رہی ہوں۔“ میں نے خاصی بدتمیزی سے جواب دیا۔

”اچھی بیٹیاں ایسے بات نہیں کرتیں۔“ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور میرے ہاتھ میں سے کانچ کا گلدان بڑے آرام سے لے کر واپس اسی جگہ پر رکھ دیا جسے میں نے فرش پر پھینکنے کے لیے اٹھایا تھا۔ ایسا رد عمل میرے ہر بار کے غصے میں نہیں ہوتا تھا مگر جب میں



خود کو غصے میں بے حد بے بس پاتی تھی تو بچ بچ مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ جاتا تھا اور میں نے چلانے کے ساتھ ساتھ توڑ پھوڑ بھی شروع کر دی تھی۔

نوراں ماما نے مجھے اپنی دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اپنے سینے سے لگا کر سمجھائی لیا۔  
 ”بس بس میری جان!“ وہ مجھے پیار کر رہی تھیں۔ میرے غصے کو اپنی محبت سے ٹھنڈا کر رہی تھیں۔

”یہ ماما نے اچھا نہیں کیا۔ یہ ماما نے اچھا نہیں کیا۔ وہ کیا سمجھتی ہیں، مجھے یاد جیہ کو ان کی دولت کا لالچ ہے۔ نہیں چاہیے مجھے ماما کا دیا ہوا ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔“  
 میں ان کے بازوؤں میں ڈھیلی پڑنے لگی۔

”مت کریں مجھ پر یہ احسان بھی۔ اپنے گھر سے نکاح کر کے رخصت کرنے والا۔“  
 میں اللہ جانے کیا کیا کہتی جا رہی تھی۔

”ہم نے کہا نا کہ آپ چپ کریں۔ خبردار اب اگر ایک لفظ بھی کہا تو؟“ انہوں نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر میرا منہ بند کر دیا۔

”آئیں..... ادھر آئیں..... آپ ہماری بات سنیں۔“ انہوں نے مجھے زبردستی کھینچ کر بستر پر بٹھایا کیونکہ میں پھر ان سے چھوٹ کر کھڑکی کی طرف لپکی تھی۔

”بس بس میری جان!“ وہ میرا سر سہلانے لگیں۔ ”ہم ہیں نا، ہماری طرف دیکھو۔ ہم بھی تو آپ کی ماں کی جگہ ہیں۔“ وہ میری پیشانی کو چومتے ہوئے بولیں۔ ان کی محبت کا اتنا آسرا پایا کہ میں ان کی گود میں بکھر گئی۔

”مامی! مجھے نہیں رہنا، اب اس گھر میں نہیں رہنا۔“

”نہ میری شہزادی، نہ میری جان.....“ وہ مجھے پیار کیے جا رہی تھیں اور سیمپٹی جا رہی تھیں۔

”دیکھو، دیکھو آپ کا سر دکھ جائے گا اتنا مت روؤ، چپ کرو۔ آپ کو نوراں ماما کی قسم۔“ وہ مجھے اپنی قسم دے رہی تھیں۔

”مامی..... میں..... میں..... وہ ماما مجھے.....“

ٹوٹے پھوٹے الفاظ میری ہچکیوں سے اور بھی ٹوٹ رہے تھے اور نوراں ماما انہیں ایک ایک کر کے جوڑتی جا رہی تھیں۔

”آپ بہت اچھی ہو، بہت اچھی، کچھ نہیں ہوا اور بڑی بیگم جو بھی کر رہی ہیں، اس وقت خصے میں کر رہی ہیں مگر اس میں آپ کا بھلا ہے۔“

”کیا بھلا ہے مامی ادہ..... وہ کبھی مجھ سے پیار کرتی ہی نہ تھیں اور نہ ہی کریں گی۔ کیا ایسی ہوتیں ہیں مائیں۔“ میرا جی اپنی ماما کے لیے اس وقت بدگمانیوں سے لبا لب تھا۔ میری سوچ، میرا دماغ سن ہو چکے تھے۔

میں کب تک روتی اور بولتی رہی، مجھے یاد نہ رہا۔ بس اتنا ضرور یاد رہا کہ میں ایک غیر کی گود میں ماں کا گداز تلاش کر رہی تھی جو یقیناً وہاں نہ تھا۔ یہ کی آج پھر میرے دل میں چھید کر گئی تھی اور مجھے لگا میں اپنی ماما سے مزید ایک قدم دور ہو گئی تھی۔



اگلے روز میں شام تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ مجھ پر ایک سردی تہ اندر سے باہر تک چھائی رہی۔ نورائیں ماما ناشائے کر آئیں اور کتنی ہی دیر بیٹھی میری منت سماجت کرتی رہیں مگر میں نے ایک نوالہ بھی حلق سے نہ اتارا۔ میں نے رات یہ عہد کر لیا تھا کہ اب میں ماما کے گھر کا کھانا پینا خود پر حرام سمجھوں گی۔ مجھے تو بس شام ہونے کا انتظار تھا۔ میں نے صبح ہوتے ہی وجیہ کو فون پر کہہ دیا تھا۔

”وجیہ! اگر میں تم سے کہوں کہ آج میری ایک بات نہ ٹالنا بھلے عمر بھر اپنی منواتے رہنا۔“

”اچھا یہ تو بہت سستے کا سودا ہے، کہو۔“ وہ شرارت سے بولا تھا مگر میں اس وقت بے حد سنجیدہ تھی۔

”میں چاہتی ہوں ہمارا نکاح آج ہی ہو جائے۔ تا صرف نکاح بلکہ تم مجھے یہاں سے لے جاؤ۔“ میں نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

”ادہو، تو عصمہ صاحبہ کا اب ہمارے بغیر رہنا محال ہو گیا ہے۔ اوئے سنو.....“ وہ

محبت سے کہہ رہا تھا۔

”کہیں کل سے تم مری کے کوساروں کی گود میں تو نہیں سو رہی ہو۔“ وہ ذومعنی انداز میں پوچھ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کے اس انداز پر یقیناً شرما جاتی۔ میرا دل خود ہی گد

گدی لیتا اور خود ہی ہنستا چلا جا ہنگوا اس وقت میں جس صدمے سے دو چار تھی، اس نے میرے دل کو سمندر بنا رکھا تھا جس کا ڈھیروں نمکین پانی میری آنکھوں کے کناروں سے چھلک چھلک پڑ رہا تھا۔

”اوڑکی! کیا ہوا، خیر تو ہے۔“ مجھے چپ پا کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”وجہ اگر تم نے آج میری بات نہ مانی تو شاید تم آج ہی میرا مرا ہوا منہ دیکھو۔“ مجھ میں اب اور ضبط کی ہمت نہ تھی۔ میں نے فون بند کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آج میں جی بھر کے رو لینا چاہتی تھی کہ اس کے بعد میں اگر جینا تھا تو خشک آنکھوں کے ساتھ اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ جینا تھا۔ وجہ کو آنسو پسند نہ تھے اور میرے درد بٹانے والا اور کوئی وہاں ہونے نہیں سکتا۔

”آہ..... میرے درد.....“ میرے سینے میں ٹھہرے سمندر میں جوار بھانا اٹھنے لگا۔

”میرے درد تو کبھی میری ماں نے نہیں سمجھے، میرے باپ نے نہیں جانے۔ اب آگے اور کون جانے گا۔“ مجھے اپنی ماما اور پاپا کے سخت رویے یاد آنے لگے۔ وہ رویے جن میں کوئی نہ کوئی بیڑی کوئی نہ کوئی جھکڑی ضرور ہوتی تھی۔ ان کی محبت بھی عجیب تھی، جب بھی پیار کیا پسند نصائح کے ساتھ ہی کیا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھ پر اعتماد کریں، مجھے اپنا جانیں، مجھے ٹوٹ کر پیار کریں مگر ایسا کبھی نہ ہو سکا۔

ماما نے میری عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے اور میرے درمیان ایک حد بڑھالی تھی۔ اس حد نے مجھے پران کا ادب اور احترام لازم کر کے میرے پیار کے بے ساختہ پن کو پابند کر دیا تھا۔ میں نے اپنی سسکی کو سختی سے ہونٹوں میں دبایا اور فون بند کر دیا۔ اس کے بعد میں بستر سے اٹھی۔ باتھ روم جا کر شاور لیا۔ اپنی وارڈروپ کھولی۔ سرخ شنون کا سوٹ پہنا۔ چند جوڑے بیگروں سے اتارے اور ایک چھوٹے سے بیگ میں ڈال لیے۔ اپنی چند کتابیں (کہ میں کتابوں کے بغیر نہ رہ سکتی تھی) اور تعلیمی اسناد اٹھا کر ایک بڑے ہینڈ بیگ میں ڈالیں۔ جی چاہا کچھ اور بھی لے لوں مگر کیا.....؟ میں نے اپنی جیولری والی دراڑ کو کھولا۔ میرے پاس کافی ساری جیولری تھی جو ماما نے مجھے مختلف مواقع پر تحفہ کی تھی۔

”نہیں، میں کچھ نہیں لوں گی۔“ میں نے اپنا بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیا۔ حالانکہ یہ جیولری میری تھی اور مجھے بہت عزیز بھی تھی۔

”نہیں، ورنہ ماما سمجھیں گی میں گھر سے قیمتی اشیاء چرا کر لے گئی ہوں۔ میں کچھ نہیں لے جا رہی بلکہ..... بلکہ اس عمل پر ماما کے سلوک نے ہی مجھے مجبور کر دیا ہے ورنہ میں تو یہاں سے دلہن بن کر رخصت ہونا چاہتی تھی۔“ میں نے اپنے گالوں پر پھسل آنے والے آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے مسل کر صاف کیا اور دروازہ بند کرنے لگی مگر میری نظر ایک ننھے سے لاکٹ پر پڑی۔ سو نے کی نازک سی چٹین میں میرا نام چمک رہا تھا۔ یہ لاکٹ مجھے میرے پاپا نے میری پانچویں سالگرہ پر دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد تھا۔

”میرے پاپا.....“ ہونٹوں کو تختی سے بھیجنے ہونے کے باوجود میرے لبوں سے آہ نکل ہی گئی۔ اس سے قبل کہ میرا دل پانی ہو کر آنکھوں سے نکل جاتا، میں نے وہ لاکٹ اٹھا کر اپنی مٹھی میں بند کیا اور دروازہ بند کر دیا۔

”پاپا..... پاپا.....“ میرا دل دھڑکنے کے بجائے پاپا..... پاپا کہہ کر جلنے لگا۔

”پاپا تو پچھلے کئی دنوں سے میرے پاس نہ آئے تھے۔ وہ تو بہت کم میرے پاس آتے تھے۔ ہتا نہیں کیوں میں جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، پاپا نے میرے اور اپنے درمیان ایک حد فاصل کو پلٹے دیا۔ تکلف، جھجک اور ہاپ بیٹی کے درمیان ادب و احترام کی دیواریں اوپر ہی اوپر اٹھتی گئیں۔ حالانکہ میرے پاپا کتنے شفیق اور نرم خور تھے۔

”پاپا..... آپ..... آپ نے بھی مجھے اپنا نہ جانا۔“ میں نے اپنے کمرے کے دروازے پر ایک الوا دماغی نظر ڈالتے ہوئے اپنے پاپا سے گلہ کیا اور جاتے جاتے اپنے بیڈ کی دراز میں پڑی اپنے پاپا کی شانخی کارڈ والی وہ تصویر اٹھا کر اپنے پرس میں رکھ لی جو میں ایک روز پاپا کی رائٹنگ ٹیبل سے..... اٹھا لی تھی، جب وہ یہ تصویر بنوا کر لائے تھے تو اور پھر وہ کتنی دیر کہتے رہے۔

”کمال ہے میں نے یہاں تین تصویریں رکھی تھیں لیکن اب تو صرف دو پڑی ہیں۔ بھئی کس نے ایک تصویر اٹھا لی۔“ وہ کچھ پریشان بھی تھے، انہوں نے یہ تصویریں اپنے پاس پورٹ کے لیے دینی تھیں۔

”کیا کرتے ہیں عباسی صاحب..... یہیں کہیں ہوگی، بھلا تصویر کہاں جائے گی۔“ ماما ان کے ساتھ مل کر تصویر کو تلاش کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”نہیں ہے تو کہہ رہا ہوں۔“ پاپا کو کچھ غصہ آ گیا تھا۔

”آپ فوٹو لیب سے ہی دولائے ہوں گے۔“ ماما نے انہی کو الزام دیا۔

”نہیں بیگم! میں وہاں چپک کر کے لایا تھا۔“ اما اور پاپا آپس میں الجھتے رہے اور میں خاموشی سے بیٹھی کھانا کھاتی رہی۔ مجھے ان دونوں کا الجھنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں اکثر ایسا بھی کرتی تھی کہ انہیں اسی طرح سے الجھا دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں مگر میں کبھی کبھی انہیں لڑنا دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔

پتا نہیں میرے اندر کون سا احساس کتری تھا جس کی تسکین میں ایسی حرکتیں کرتی رہتی تھی۔ میں نے دوبارہ اپنی آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب مجھے شدت سے اس لمحے کا انتظار تھا جب اما نے میرے کمرے میں آ کر کہا تھا۔

”اٹھو، وجیہ آگیا ہے۔“

مگر اما میرے کمرے میں نہ آئیں۔ آئیں تو نوران ماما ہی میرے پاس آئیں۔

”انہیں بیٹا! آپ کے مہمان آگئے ہیں۔ بڑی بیگم آپ کو ڈرائنگ روم میں بلا رہی ہیں۔“ وہ میرے قریب سر جھکا کر کھڑی تھیں۔ میں نے بھی ان سے نظریں نہ ملائیں اور اٹھ کر ان کے ساتھ چل دی۔

”اما آج اتنی تو میں شاید ان سے جاتے جاتے کچھ کہہ ہی لیتی۔ اپنے دل میں چھپی ہوئی کسی پرانی حسرت کو ہی نکال لیتی۔ آخر ان کے کندھے سے لگ کر وہ آنسو بہانے کا حق تو مجھے اب بھی حاصل تھا لیکن میری اما! انہیں آج بھی یہ جاننے کا خیال نہ آ رہا تھا کہ ان کی بیٹی دراصل کیا چاہتی تھی؟“ میں نے جاتے جاتے ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے رک کر اپنی متورم اور سرخ آنکھوں کو چھپانے کے لیے ان پر کنسلر کی ہلکی سی تہہ چڑھائی اور اپنے رخساروں پر بھی بلش آن کا برش مارا۔

نوران ماما مجھے ایسا کرتی دیکھ کر اپنی بیٹکی ہوئی آنکھیں صاف کر رہی تھیں، وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں۔

”میری شہزادی.....“ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا کر سمجھ لیا، وہ مجھے پیار کرتے ہوئے رورور کر دعائیں دے رہی تھیں۔

”اللہ آپ کو خوش رکھے، اپنے گھر میں آباد رہو۔“

اور میں پتھر ہوئی بے حسی سے انہیں خود سے جدا کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”رہنے دیں ماما! اب مجھے دعائیں نہ دیں۔ میں جانوں اور میرا اللہ جانے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب لوگ بھول جائیں

گے، بس چند روز کا غصہ ہے، ان لوگوں کا آپ کے سوا اور کون ہے بھلا۔“

”وہ مجھے اب بھی خوش نہیںوں کی ڈور سے باندھ کر بھیجنا چاہتی تھیں۔“

”اب کوئی کیا سوچتا ہے، کیا کرتا ہے، مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں نے ہلکی سی لپ اسٹک سے اپنے لبوں پر آئے وہ کھرٹھ بھی ڈھانپ لیے جو میرے دل سے رسنے والے خون کے جنے پر ابھر آئے تھے۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہاں پر میری ماما اور میرے پاپا کے علاوہ وجیہ اور اس کی والدہ بھی موجود تھیں۔ وجیہ کی والدہ ہی ہو سکتی تھیں جو بڑی شان سے سراٹھا کر بیٹھی تھیں۔ وہ ایک رعب دار اور حسین عورت تھیں، بالکل وجیہ کی شاہت..... وہ مجھے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور بسم اللہ کر کے مجھے گلے لگایا۔

میں بھی کہوں میرا وجیہ اتنا دیوانہ کیوں ہو رہا ہے۔“ انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے سب کے سامنے میری تعریف کی اور مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا۔

”بیگم ممتاز! آپ سے ہمیں اور کچھ نہیں لینا۔ ہمارے لیے یہ ہیرا ہی کافی ہے۔“ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا تے ہوئے میری ماما کو مخاطب کیا۔

”جی جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ ماما کی ٹوٹی ہوئی آواز مجھے بہت دور سے سنائی دی۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی تھیں۔ اتنے میں کسی نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔

”السلام علیکم.....“ یہ نصیر احمد کی آواز تھی، میں نے چونک کر سراٹھایا، ماما نے اسے آج کیوں بلایا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر وجیہ سے ہاتھ ملایا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”اٹکل! وہ کرمل صاحب بس ابھی آرہے ہیں۔“ اس نے میرے پاپا کو پیغام دیا اور وجیہ کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

”بڑے صاحب! کچھ مہمان آئے ہیں۔“ ہمارے چوکیدار نے آکر اطلاع دی۔

”ہاں انہیں اندر بھیج دو۔“ پاپا نے مختصر جواب دیا۔ اگلے چند لمحوں میں ہمارے ڈرائنگ روم میں پاپا کے دوست کرمل فقیم رضا اور دو کوئی اور مرد حضرات آکر بیٹھ چکے تھے۔ ان کے آنے کے کچھ ہی دیر بعد ہمارا ڈرائنگ روم نکاح خواں کو بھی لے آیا تھا۔ یوں ان چند افراد کے درمیان میرا نکاح وجیہ الدین پیرزادہ کے ساتھ ہو گیا۔ میرے میکے سے نکاح کے گواہوں میں کرمل اٹکل اور نصیر احمد تھے۔ جبکہ وجیہ کے دو ماموں ان کی طرف سے تھے۔

”عہاسی صاحب! حق مہر بتائیں۔“ وجیہ کے ماموں نے پوچھا تھا۔  
 ”میری طرف سے کوئی مشروط نہیں..... آپ لوگ اپنی مرضی سے لکھ لیں۔“ پاپا نے  
 سپاٹ لہجے میں جواب دیا تھا۔  
 ”بھائی جان آپ ہمارے وجیہ کی دلہن کا حق مہر بھی اتنا ہی لکھیں جتنا ہمارے ہاں  
 بیٹیوں کا ہوتا ہے۔“ وجیہ کی اماں جان بے بڑے زعم سے کہا تھا۔  
 ”لکھیں مولوی صاحب!“ وجیہ کے ماموں کی آواز میں اپنی بہن سے زیادہ زعم اور  
 دولت کے نشے کا غور تھا۔

”دس لاکھ سکہ رائج الوقت..... ایک کوٹھی جس میں یہ رہے گی۔ اور وہ سارا زیور جو  
 اسے چڑھایا جائے گا۔ لکھیں جی لکھیں، آخر یہ پیر زادوں کی بہو ہے۔ کیا ہوا جو بچے اپنی مرضی سے  
 شادی کر رہے ہیں تو؟“ اس بار وجیہ کے دوسرے ماموں بولے تھے۔ ان کا انداز میرے پاپا کو یہ  
 باور کراتا تھا کہ ان کی بیٹی اپنی مرضی سے شادی کر رہی ہے، مگر اونچے گھر میں جاری ہے۔ نکاح کے  
 بعد انکل نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خوش رہنے کی دعا دی۔

”میں کھانا لگوانی ہوں۔“ میری ماما بہانے سے اٹھ کر وہاں سے جانے لگیں۔  
 ”بیگم عہاسی! کھانا نہ بنے دیں۔ بس پانی پی تو لیا ہے۔ ویسے بھی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔  
 حویلی پہنچتے پہنچتے ہمیں رات ہو جائے گی۔“ وجیہ کی اماں نے انہیں جانے سے روک دیا۔  
 ”جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ وہ سپاٹ سی بولیں۔

”اچھا عہاسی صاحب رب را کھا..... پھر کبھی ملاقات ہوگی۔“ وجیہ کے دونوں ماموں  
 نے باری باری پاپا سے کرل انکل اور نصیر احمد سے ہاتھ ملائے اور وہ باہر چلے گئے۔  
 ”عہاسی صاحب! بیٹی کو رخصت کریں۔“ کرل انکل نے پاپا کو ہاتھ پکڑ کر میری طرف  
 کر دیا۔ جس پر پاپا نے میرے سر پر بڑا ڈھیلا ہاتھ رکھ دیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔  
 ”جاؤ خوش رہو۔“ اس سے پہلے کہ میں اپنے پاپا سے لپٹ کر کہتی۔  
 ”پاپا! مجھے معاف کر دیں۔“ پاپا مجھے گلے لگائے بغیر مجھ سے دور ہو گئے۔ اور میرا دل  
 تڑپ کر رہ گیا۔

”بیگم عہاسی! آپ فکر نہ کریں، آپ کی بیٹی ہمارے گھر عیش کرے گی۔ یہ تو پیر زادوں  
 کی تاریخ ہے کہ اپنی پسند کی عورت پر تو جان بھی نثار کر دیتے ہیں۔ میرے وجیہ کو تو اس سے بچ بچ

محبت ہے۔“ انہوں نے اپنے تئیں میری ماما کو تسلی دی تھی کہ وہ ٹکرنہ کریں، مگر ماما کب ان کے انداز سے مرعوب ہونے والی تھیں، پولیس۔

”میری بیٹی نے اپنے لیے جو انتخاب کیا..... وہ اس کی امیدوں پر پورا اترے تو اچھا ہے، ورنہ اس کے نصیب.....“

”مامی! آپ جا کر وہ بیک لے آئیں جو میں نے عصمہ کے لیے رکھوایا تھا۔“ وہ میرے پاس آئے بغیر پولیس۔

”جی بیگم صاحبہ!“ ماما اندر کو بھاگیں اور فوراً ہی ایک بیک لیے ہوئے واپس آگئیں۔ جسے انہوں نے ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر ہی رکھا ہوا تھا۔

”اس میں کچھ چیزیں ہیں تمہارے لیے۔“ ماما نے وہ بیک مجھے دکھاتے ہوئے دوری سے کہا۔

”میرے پاس پہلے سے وہ چیزیں موجود ہیں جو مجھے چاہیے تھیں۔“ میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ ورنہ میں پچھلے ایک کھٹنے سے چپ بیٹھی سر جھکا کر سن رہی تھی۔

”مامی! آپ جا کر اس کی گاڑی میں سامان رکھ دیں۔“ انہوں نے میری بات کو ان سنی کر کے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ چلیں، ورنہ دیر ہو جائے گی۔ رات کے وقت گاؤں کا سفر مناسب نہیں۔“ ماما نے سیدھے لفظوں میں ہم لوگوں کو جانے کا کہا۔

”جی آئی! اللہ حافظ۔“ وجیہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ماما کو سلام کر کے ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ وجیہ کی اماں جان انہیں ویسے پر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ جس کے جواب میں میری ماما کی سست اور رکی سی۔

”جی..... جی ضرور۔“ صاف بتا رہی تھی کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔ بہر حال! میں رخصت ہوئی تو میرے ساتھ کوئی بھی باہر تک نہ آیا تھا۔ لوراں ماما نے البتہ مجھے اپنی ہاتھوں کے سہارے گاڑی تک ضرور چھوڑا تھا۔

”بیٹا! ہماری ضرورت آپ کو جب بھی محسوس ہو ہمیں بس ایک ہار یا دکر لیتا۔ ہم آجائیں گے۔ ہماری دعائیں آپ کے سر پر سایہ کیے رہیں گی۔“ وہ روتے ہوئے مجھے رخصت کر رہی تھیں اور میں اپنے پتھر ہوئے قدموں کو بمشکل اٹھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ میری سماعتوں کو اب بھی کسی کی



محبت بھری اس آواز کا انتظار تھا، جسے سنتے ہی میرے پتھر ہوئے قدموں میں جان پڑ جاتی اور پلٹ کر اس اپنے جانے والے سے پلٹ کر رو دیتی۔ مگر یہ بھی میری حسرت ہی رہی۔ جیسی میری رخصتی ہوئی تھی ایسی تو کسی کی میت بھی نہیں ہوتی، اس کے ساتھ بھی چند آنسو، چند سسکیاں لازم ہوتی ہیں۔ چار کندھے بھی اسے احترام اور محبت سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے دفناتے ہیں۔ خواہ مرنے والا اپنے پچھلوں کو عمر بھر ستا کر، رلا کر گیا ہو، مگر میں؟ میں تو دلہن تھی۔ نئی زندگی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔

اس زندگی میں خوشیوں کے لیے اپنوں کی دعاؤں سے محروم دلہن..... سرخ جوڑے میں زرد چہرے والی دلہن..... جس کی آنکھوں میں کل کے سہانے سپنوں کی جگہ..... آج کے اٹھائے گئے تازہ زخموں کا لہو تیر رہا تھا۔

”اماں جان! آپ لوگ چلو..... ہم کل کسی وقت حویلی پہنچ جائیں گے۔“ وجیہ نے مجھے گاڑی میں بٹھانے کے بعد اپنی اماں جان کو مخاطب کر کے کہا تو میرا دل پریشانی سے اُجھل کر حلق میں آگیا، کہ.....

”کیا مطلب؟ ہم لوگ اب کہاں جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے میرا سوہنا..... جیسے تمہارا جی کرے..... کل آؤ پرسوں آؤ..... جب بھی آؤ تمہارا گھر ہے۔“ انہوں نے اپنے بیٹے کی پریشانی چومے ہوئے کہا اور وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دوسری گاڑی میں جا بیٹھیں۔

”ٹھیک ہے لاڈی! انجوائے کرو! جوان آدمی ہو، یہی تو دن ہیں اپنی مرضیاں کرنے کے، خوش رہو.....“ وجیہ کے ماموں نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

شکریہ ماموں جان! وجیہ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا، اس نے گاڑی اشارت ہی کی تھی جب اس کے ماموں زن سے اپنی گاڑی آگے بڑھالے گئے۔ ٹھیک وجیہ کے انداز میں پیچھے دیکھے بغیر اور فل اسپید میں۔



کچھ ہی دیر میں وجیہ مجھے طارق روڈ پر موجود ایک بہت بڑی بوتیک میں لے آیا تھا۔  
”یہاں کس لیے؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”اچھا سوال ہے میڈم! میری دلہن کیا اس حال میں ہو سکتی ہے، اور میں کیا اپنی ویڈیو گائڈنگ اس روکھے پیکھے چہرے والی کے ساتھ مناؤں گا۔ چلو فائنٹ کوئی ڈریس پسند کرو۔“ وہ مجھے ہدایات دیتے ہوئے پیار سے کہہ رہا تھا۔

”وجیہ! ام!“ مجھے سخت جھجک ہو رہی تھی۔

”اچھا ابھی تم نہیں میں.....“ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے منٹوں میں ایک بے حد خوب صورت اور مارڈرن بلاؤڈز والا غرارہ پسند کیا، کھلتے ہوئے سرخ رنگ میں۔  
”وجیہ! ایہ..... تو.....“ میں اس کے سیلو لیس ہونے پر گہرا رہی تھی۔

”اب تم عصمہ نہیں ہو، بیگم وجیہ ہو، بس۔“ اس نے مجھے پیار سے ڈانٹا، اور میں چپ ہوئی، پھر اگلے آدمے کھنٹے میں وجیہ نے مجھے ایک معروف بیوٹی پارلر میں ڈراپ کیا۔  
”میں ایک کھنٹے بعد تمہیں پک کرتا ہوں، ذرا کچھ انتظامات کر کے آتا ہوں۔“ اس نے مجھے پارلر کے اندر تک چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں..... یہ احتیاط سے رکھ لینا۔“ اس نے ایک بڑی خوب صورت اور کاہلارہیلی میرے ہنڈ بیگ میں ڈال دی۔ یہ وہی تھیلی تھی جو وجیہ کی اماں نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وجیہ کو دی تھی۔

”لاڈی! ابھی میری بہو کی منہ دکھائی ہے۔ وجیہ کے گھر والے اسے پیار سے لاڈی کہتے تھے۔

”او، کے ڈیر..... سی یو..... اور مجھے یقین ہے واپسی پر جب میں تمہیں دیکھوں گا تو مجھے ہوش نہیں رہے گا، گلٹا ہے واپسی پر تم ہی مجھے لے جاؤ گی۔ ڈرائیونگ آتی ہے نا؟“ اس نے میرے کان کے قریب آ کر سرگوشی کی اور چلا گیا۔

”واہ..... لاڈی نے بڑی حسین لڑکی کو دلہن بنایا ہے۔“ اس پارلر کی آنرپوٹیشن نے مجھے دیکھتے ہی تعریف کی، پتا نہیں کیوں مجھے اس کا وجیہ کو اتنی بے تکلفی سے ”لاڈی“ کہنا اچھا نہ لگا۔  
”چلو بھی فائنٹ چیئنج کر کے آ جاؤ۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور فرمائش سخت۔“ وہ مجھے سر سے پاؤں تک عجیب انداز میں گھورتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

میں نے چپ چاپ اپنا ڈریس لیا اور جلد ہی چیئنج کر کے آ گئی۔ میں واپس آئی تو میں نے دیکھا وہ بیوٹیشن میرے پرس میں سے وہ تھیلی نکال کر اس میں موجود جیولری کو دیکھ رہی تھی۔

”اتنی بے تکلفی، ایسی بداخلاقی، بلکہ اخلاقی جرم..... مجھے یہ بات سخت گراں گزری، مجھے اس کی یہ حرکت برداشت نہ ہوئی۔

”سوری میڈم! کسی کا پرس کھولنا اخلاقی گراوٹ اور مجرمانہ ذہن کی غمازی کرتا ہے۔“  
 میں نے بڑے نرم، مگر کاٹ دار انداز میں کہا تھا، مگر وہ بڑی ہی بے شری سے قہقہہ لگا کر بولی۔  
 ”میں ہر ایک سے اتنی بے تکلف نہیں ہوتی، میں تو خود کسی کو تیار بھی نہیں کرتی۔ تم خوش نصیب سمجھو خود کو..... وہ بھی لاڈلی کی وجہ سے۔“ وہ میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں کس کر مجھ پر جھپکتی ہوئی عجیب انداز میں بولی، اس کی سانسیں میرے چہرے پر پڑیں تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

”زیادہ غرے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی طرح ریپلیکس بیٹھو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ اس نے کرننگلی سے کہا اور میرا چہرہ سختی سے اپنے سامنے موڑتے ہوئے کہا۔ ”اب آنکھیں بند کرو اور ہنسنا مت۔“

اس نے حمزہ سے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ماہر بیٹیشن تھی۔ صرف چند منٹوں میں اس مجھے تیار کر دیا۔

”ماریہ! آؤ اس کا میرا سائل وغیرہ کر دو۔“ وہ سامنے بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگی، بڑی ہی عجیب سی نظروں سے، جن میں میرے لیے ستائش سے زیادہ میرا ناپ تول تھا۔ مجھے اس کے یوں مسلسل دیکھنے سے بے حد کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

”ویسے تمہاری جیولری بڑی شاندار ہے۔ لگتا ہے لاڈلی کی خاندانی جیولری ہے۔“ اس کی نظریں میری جیولری پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے اس وقت ایک حاسد اور حریص عورت دکھائی دے رہی تھی۔ میرے دل میں اس وقت بے شمار سوالات اٹھ رہے تھے۔

”اس کا وجہ سے کیا تعلق ہے؟ یہ وجہ سے اتنی بے تکلف کیوں ہے؟ اس کے خاندان تک کو کیسے جانتی ہے۔

اگر جانتی ہے تو خواتین کے حوالے سے بات کرنے کے بجائے بار بار وجہ کا نام وہ بھی خالص اس کا لاڈ پیار والا نام کیوں لے رہی ہے؟“

وہ پہلی عورت تھی جس سے مجھے بھی حسد محسوس ہو رہا تھا۔ اور وہ اچھی بھلی خوب صورت ہونے کے باوجود مجھے ایک آنکھ نہ بھار ہی تھی۔

اب وجیہ میرا تھا، صرف میرا۔ میں اس کے لیے کسی اور کے ایسے جذبات بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

”اچھا گڈ بائے..... مجھے کہیں جانا ہے۔“ وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی اور میرے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے ”گڈ بائے“ کہہ کر چلی گئی۔

”میڈم نے آپ کو تیار کیا“ آپ واقعی لکی ہیں، ورنہ میڈم تو اب بڑی بڑی ماڈلز اور آرٹسٹ کو ہی تیار کرتی ہیں۔ لہٰذا وہ غیرہ نہیں تیار کرتیں۔“ اس کی اسٹنٹ نے میرا ہیرا سٹائل بنا کر مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ میڈم کی کوئی خاص فرینڈ ہیں؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

”نن..... نہیں تو..... ہاں..... ہاں بالکل.....“ میں نے ایک ہی وقت میں اسے دو متضاد جواب دیے جس پر وہ مجھے پریشانی سے دیکھنے لگی۔

”پلیز آپ مجھے جلدی تیار کر دیں۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“ میں نے اپنے موبائل پر وجیہ کا ایس ایم ایس دیکھ کر اسے منت سے کہا، وجیہ اگلے پانچ منٹ میں مجھے پک کرنے والا تھا۔ اور مجھے اس کے اگلے ایس ایم ایس سے پہلے بیٹی پارلر کے استقبالیے تک پہنچ جانا تھا۔ میں پچھلے دو گھنٹوں سے وجیہ کی شریک زندگی ہوئی تھی۔ اتنی نویلی دلہن، مگر ایسی فرمانبردار؟ میں ایسی تبدیل ہو گئی تھی، کس لیے؟

میرے اندر اک سہا ہوا سا جواب منہ چھپا رہا تھا۔ اور یہ اس بات کی علامت تھا کہ میرے اور وجیہ کے درمیان ایک ان ہونا سا..... دکھائی نہ دینے والا خوف سرک آیا تھا۔

میں اس کے قرب میں بھینکنے سے قفل ہی اپنا آپ چھپا رہی تھی۔ خود میں سمٹ رہی تھی اس کی محبت کے غمار سے زیادہ مجھ پر اس کی شخصیت اور دولت کا رعب بیٹھ رہا تھا۔ میں استقبالیے پر موجود تھی جب وجیہ اندر داخل ہوا۔

”ماشاء اللہ۔“ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے بے ساختہ کہا تھا اور اپنا ہاتھ میرے سامنے بڑھا دیا۔ میرا ہاتھ تھام کے وہ مجھے چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ گاڑی تک لے آیا۔ میرے لیے آگے بڑھ کر فرنٹ ڈور کھولا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”کیا کروں..... آج وہ سارے لاڈ مجھے ہی تمہارے اٹھانے پڑیں گے جو سسرال کی عورتیں اٹھاتی ہیں۔“ ہم کہاں جا رہے تھے مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ نہ ہی میں نے اس سے پوچھا تھا۔

اب تو جہاں بھی جانا تھا وجیہ کے ساتھ ہی جانا تھا۔ وہ راستے بھر ڈرائیو کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے دیکھتا رہا۔ اپنی میٹھی میٹھی نظروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے شریر نظروں کے ساتھ..... اس کے انداز میں میری حوصلہ افزائی تھی، میرا مان تھا، میرے لیے محبت تھی، میں اس کے ساتھ خوش تھی، مجھے یہ سب اچھا لگ رہا تھا، کیوں نہ لگتا، میں نے اپنے والدین تک سے لڑ کر اسے حاصل کیا تھا، پایا تھا، میری جھگی ہوئی آنکھوں کو کچھ معلوم نہ پڑا کہ ہم کہاں آگئے تھے۔ وجیہ نے گاڑی کے بریک لگائے تو میں نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر دیکھا۔

ہم ایک معروف فائینڈاشر ہوٹل کی پارکنگ میں تھے۔

”لو اسے اچھی طرح سے اوڑھ لو اور پورا نقاب کر کے باہر نکلنا۔“ وجیہ نے ایک موٹی

سیاہ چادر میرے ہاتھ میں دی۔

”بھئی یہ گھر نہیں ہوٹل ہے۔ میں کیا کرتا، تم نے اتنی جلدی مجھے حکم دیا کہ میں وہ سب نہ کر سکا جو کرنا چاہتا تھا۔“ اس نے میری آنکھوں میں ابھرتے سوال کو دیکھ کر خود ہی جواب دے ڈالا۔ میں نے وہ چادر چپ چاپ اوڑھی اور گاڑی سے باہر آگئی، میں محسوس کر رہی تھی، میں ایک روباٹ لگ رہی تھی، جس کا ریموٹ کنٹرول وجیہ کی آنکھوں میں تھا۔ میں اپنے پیروں پر نظریں جمائے وجیہ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

”ویکم سرا“ کسی کی نسوانی آواز نے کہا۔

”تھینک یو.....“ وجیہ کا جواب تھا۔

”سر! آپ کا سویٹ تیار ہے..... امید ہے آپ کو اچھا لگے گا۔“ وہ اب ہمارے ساتھ

ساتھ چل رہی تھی۔

”لگتا تو چاہیے۔“ وجیہ اور وہ چلتے چلتے سوال جواب کر رہے تھے۔

”سر! پہلے بھی آپ کو شکایت ہوئی ہے۔ آئی ہوپ کہ آج بھی.....“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔“ وجیہ نے اس کی بات پوری ہونے

سے پہلے ہی اسے ڈانٹ سادیا..... جس پر وہ کچھ شرمندہ ہو گئی۔

”اوکے سر! پی ویڈیو گائڈ۔“ اس نے رسا کہا، پھر کمرہ کھلنے کی آواز آئی اور کسی کے

واپس جانے کی چاپ۔

کمرے میں بے شمار گلابوں کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، وجیہ

نے مجھے ہاتھ پکڑ کر کہیں بٹھا دیا تھا۔ میرا وجود ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔

”اب اس کی ضرورت نہیں۔“ وجیہ نے میرے سر سے سیاہ چادر کو بڑے آرام سے اتارا  
میں نے سختی سے اپنی آنکھیں موند لیں، اور وہ ہنس پڑا۔

”ہائے..... عصمہ! بیگم وجیہ الدین میرا زادہ.....“ وہ شوخ ہو رہا تھا۔

”ارے یہ دونوں نام اب تم پر سوٹ نہیں کرتے تمہارا سب سے پہلا تھک میری طرف  
سے یہ کہ..... آج سے تم دلنشین۔“ وہ زہر پلہ دہراتا ہوا بولا۔

”سہی..... ہاں بالکل سہی نام ہونا چاہیے..... تمہارا..... دلنشین۔“ اس نے پھر سے  
مجھے اس نام سے پکارا تو میرے لبوں سے بھی بے ساختہ نکلا۔

”دلنشین۔“

”دلنشین..... دلنشین۔“ میرے چاروں طرف خوشبو گنگناٹے لگی۔ تازہ گلابوں کی سحر  
کن خوشبو۔ اور اس میں وجیہ کی ٹھہری ہوئی.... دل کو چھو لینے والی خوب صورت آواز.....

جو میری سماعتوں سے میری روح تک کو سرشار کیے دے رہی تھی۔

مجھے فرش سے اٹھا کر آسان کی وسعتوں میں محو پرواز تھی۔

اس آواز میں میرے ماضی کا کوئی نوحہ شامل نہ تھا۔

یہ تو وہ آواز تھی جس نے میرے برسوں کے خواب کو پر عطا کر دیے تھے۔

اور آج میں سچ جج خود کو خوش نصیب تصور کر رہی تھی۔

میرا انتخاب غلط نہ تھا۔

اور یہ وہی رات ہے جس کی گود سے میری خوشیوں کی سحر طلوع ہوگی۔

جس میں میں کھل کر سانس لے سکوں گی۔

میں اپنی مرضی سے جیوں گی۔

میں آج کی ہاشور عورت ہوں۔

مجھے حق ہے کہ.....

میں اپنا شریک سفر خود تلاش کروں۔

میں اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ اپنی مرضی سے کروں۔

یہ میرا حق ہے۔

اور میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔

نقطہ محبت کی ہے۔

محبت !!!

جو فطرت ہے قدرت ہے۔

میں عورت ہوں اور یہ محبت۔ میرے لیے ودیعت ہے۔ گلاب، چاندنی اور رات  
..... میری زندگی کی کتاب کے کچھ نئے صفحات پر میرے لیے لکھتے رہے اور وجہ اس لکھے کو میرے  
لیے پڑھتا رہا۔

اے تسلیم کرنا تھا کہ.....

مجھے تم سے محبت ہے

محبت بھی کچھ ایسی

جس میں چھوٹے جذب رکھنے اور گلے مل کے ہمیشہ

مسکرانے کے لیے

میں چاہتا ہوں

کہ میرا دل

چاہتوں اور خواہشوں کی سب حدود کو پار کر جائے

مجھے تم سے محبت ہے

مگر میں چاہتا ہوں تم

مجھے چاہو..... مجھے چاہو تو ایسے ٹوٹ کر چاہو

تمہارے رات اور دن

تمہاری دھوپ چھاؤں

ساحلوں دریا کناروں کو

نقطہ تم میرے نقطے میں سمیٹو

اور مجھے چاہو

تمہاری آنکھ سے دل

روح سے وجدان کی ہر کیفیت میں، میں ہی میں ٹھہروں

تمہارا ڈومنا  
 روتا بھرتا مسکراتا..... دل  
 مجھے ایسی محبت دے  
 کہ میں خود اپنا نہ رہ سکوں اک پہل  
 تمہارا اور بس  
 تمہارا ہو کے رہ جاؤں  
 مجھے ایسی محبت دو

وہ اپنا دل میرے سامنے جس ادا سے، جس خوب صورتی اور جس سرشاری کے عالم میں  
 کھول کے رکھ چکا تھا، میں اس پر نازاں و فرحان تھی۔ اور اس نے مجھ سے جس خواہش کا اظہار کیا  
 تھا۔

میں اسے مان لینے اور کر گزرنے کا عہد بھی جی جان سے کر چکی تھی۔ وجیہ الدین پیرزادہ  
 نے مجھے ایک ہی رات کے چند ہی گداز لحوں میں عصمہ سے دلشیں کر کے، میرے قدموں میں عمر  
 بھر کے لیے ”محبت“ کی بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ جنہیں میں کبھی بھی قید تصور کرنے کو تیار نہ ہو سکتی  
 تھی۔



تیسرے روز شام کے وقت ہم نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا۔ ہم اپنے گاؤں کی طرف  
 جا رہے تھے اس گاؤں جواب میرا سرال تھا۔ بلکباب جہاں میرا گھر تھا، میرا سب کچھ تھا، آج میرا  
 ولیہ تھا، آج بھی میں اسی بیوٹی پارلر سے تیار ہوئی تھی۔ مگر آج لہنگے یا غرارے کے بجائے کا مدار  
 شلوار قمیص پہنا ہوا تھا۔ آف دایمٹ شوڈ سلک کے سوٹ پر سچے گئینوں کا بے حد خوب صورت کام  
 تھا۔ مجھے آج بھی اسی بیوٹیشن نے (جس کا نام میں ابھی تک نہ جانتی تھی۔) نے بڑے ہنر سے تیار  
 کیا تھا۔ اس کی اسٹنٹ نے جب میرے لمبے بالوں کا بڑا خوب صورت سا جوڑا بنا کر ان میں  
 سرخ اور نارنجی رنگ کے گلاب کی ادھ کلیاں سجائیں تو لمحہ بھر کو میں خود اپنے میں اپنا آپ دیکھ کر  
 مبہوت رہ گئی تھی۔ میں خوب صورت تو تھی، یہ تو مجھے بچپن ہی سے علم تھا، مگر میں اتنی حسین ہو جاؤں  
 گی۔ مجھے یہ اندازہ نہ تھا۔



”وجیہ کی محبت نے واقعی مجھے کیا سے کیا کر دیا تھا۔“  
 ”کیسی ہے میری دلشیں بیرزادہ؟“ مجھے یوں کم سم بیٹھا دیکھ کر وجیہ نے پوچھا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا تو تم خوش ہو؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”خوش.....“ میں نے اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔  
 ”بے حد خوش ہوں میں۔“ مجھے سچ بولنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اب میں اتنی خود اعتماد ہو گئی تھی کہ اپنے اندر کا حال بیان کر سکوں۔

”اچھی بات ہے خوش رہنا چاہیے۔ خوشی ہی انسان کو زندہ رکھتی ہے۔ ورنہ محض چلتے پھرتے جسوں کا نام زندگی نہیں ہے۔“ اس نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں گاڑی کے ششے فوراً ہی گرا دوں۔ پتا نہیں مجھ سے کسی بھی قسم کی ذرا برابر بدبو بھی کیوں برداشت نہیں ہوتی تھی۔ مگر اس وقت نا صرف مجھے برداشت کرنا پڑا بلکہ جبراً مسکراتا بھی پڑا۔  
 ”کاش وجیہ! تم سگریٹ نوش نہ ہوتے۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”سوری.....“ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں سگریٹ پسند نہیں۔ مگر میرا اس کے بغیر گزرا نہیں تم یقیناً جلد ہی اس کی عادی ہو جاؤ گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ میرے دل کی بات بھی جان لیتا تھا اور میں موقع پر میرے خیال کا جواب زبان سے دے کر مجھے اکثر ہی حیران کر دیا کرتا تھا اس وقت بھی میں حیران تھی۔

”اٹس آل رائٹ۔ تم پریشان نہ ہو۔“ میں نے اسے یقین دلانا چاہا کہ میں عادی ہو جاؤں گی۔

”گڈ..... دیری گڈ۔“ وہ خوش ہو گیا۔

پھر وہ مجھے گاؤں اور شہر کے ماحول کا تضاد..... وہاں اور یہاں کے لوگوں کے خیالات اور مزاجوں کا تضاد سمجھا تا رہا کہ اس کے خاندان والے بہت سی باتوں میں بے حد ماڈرن اگرچہ اب ہو گئے ہیں مگر ان کے گھروں میں عورتیں اب بھی مردوں کے ساتھ بے تکلفی سے پیش نہیں آتیں۔ کم از کم اپنی خواب گاہوں سے باہر تو ہرگز نہیں۔ اس کے کہنے کا مطلب تھا کہ مجھے بھی اس بات کا خیال اس کے خاندان کے باقی افراد کے سامنے رکھنا ہوگا۔ اور یہ کہ ان کے خاندان کے مرد جو بھی کریں عورتیں ان کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتیں نہ ہی وہ اپنی عورتوں کے سامنے

کسی بات پر جواب دہ ہوتے ہیں۔ یعنی وجیہ کے کہنے کا مطلب تھا اب میں وجیہ کی باقی کی زندگی میں عمل دخل نہیں کروں گی۔

”مجھے سب پتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

”تو میں سمجھوں کہ تم ان اصول و ضوابط کی پابند رہو گی۔“ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے

پوچھ رہا تھا۔

”ان شاء اللہ تعالیٰ۔“ میں نے دل سے کہا۔ ویسے بھی وجیہ کی محبت تو مجھے حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے دل پر تو میری حکمرانی کا پرچم لہرا ہی گیا تھا۔ مجھے اور کچھ لینا بھی نہیں تھا۔ مجھے اس کے خاندانی پس منظر یا اصول و ضوابط سے زیادہ دلچسپی محسوس نہ ہو رہی تھی اس لیے میں بے بڑی آسانی سے کہہ دیا۔

”مجھے فخر ہے کہ تم میرا انتخاب ہو۔“ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دہاتے ہوئے بڑی محبت اور جوش سے کہا۔

”same to u۔“ میں نے بھی اس کے چہرے کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے

کہا۔

”لاڈلی تمہارا ہے۔ جی جان سے تمہارا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے ایک نعرہ لگایا اور سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھواں میری طرف اچھال دیا۔ ہنستے ہنستے مجھے اچھو لگ گیا اور میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ وہ دھواں میرے حلق سے جا لگا تھا۔



ہم گاؤں پہنچے تو باہر نہر کے پل پر ہی ایک جیپ ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس میں کل کر ایک گن مین اور ڈرائیور ہماری طرف آگئے۔ میں اور وجیہ اب گاڑی سے نکل کر ایک پچارو میں بیٹھ چکے تھے۔ آگے ڈرائیور اور ہاڈی گاڑتے۔ اب میں سر جھکا کر خاموش بیٹھی تھی اور وجیہ ڈرائیور سے گاؤں کا حال چال پوچھ رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہے چھوٹے صاحب! سب سکی ہے۔“ وہ بڑے ادب و احترام سے وجیہ

کو بتا رہا تھا۔

”صاحب! پہلے حویلی چلیں گے یا سیدھے پنڈال میں۔“ وہ وجیہ سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے حویلی اتارو اور بیگم صاحبہ کو پنڈال میں لے جاؤ۔“

وجیہ نے جب یہ کہا تو میرا خوشیوں سے ہلکتا دل ایک دم سے یوں ٹھہر گیا جیسے اکھیلیاں کرتے بچے کو اچانک ہی کوئی ٹھوکر لگ جائے اور وہ اپنا پاؤں ”سی سی“ کرتا ہوا اٹھا کر ذرا ہل کو کھڑا ہو جائے۔ میں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ وجیہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ میری ایک سماجیت تھی کہ وہ اس وقت تو کم از کم میرے ساتھ ضرور چلے، مجھے تھا تو اپنے گھر نہ بیچے، کم از کم میرا اعتراف بن کر وہاں تک تو میرے ساتھ چلے جہاں آج میرے لیے اجنبیوں کا جھکھٹا تھا۔

”اچھا سنو! صفدر! پنڈال ہی چلو۔ بعد میں مجھے حویلی لے جانا۔“ اس نے اپنا گرم مضبوط ہاتھ میرے اس بچ پڑتے ہاتھ پر رکھ کر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس وقت میرا جی چاہا میں اس کا شکریہ ادا کروں، مگر اس نے مجھے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ میرے کان کے قریب یہ سرگوشی کر کے ..... Mention not اور میری گردن میرے کندھوں پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ”میں واقعی دلنشین ہوں۔“ میرا دل شرارت سے ہنسا اور دوبارہ اکھیلیاں کرنے لگا۔



ہم پنڈال میں داخل ہوئے تو ہمارا شاندار استقبال کیا گیا وجیہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ کنوپیوں کے اندر کا ماحول اتنا ماڈرن اور اتنا خواب آگیز تھا۔ مجھے خود یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ ایک گاؤں میں ہونے والا شادی کا فنکشن ہے۔

کنوپیوں میں تیز روشنیاں ہمارے پہلے قدم پر بھی بچھادی گئی تھیں۔ اب پورے پنڈال میں سرنخی مائل مدھم روشنی کا اک خمار تن چکا تھا۔ اسٹیج تک کے راستے پر دونوں طرف سے چھوٹے چھوٹے پٹائے چھوٹے اور ہمارے سروں پر تازہ گلاب کی چٹاں اور رنگین چمکیلی پٹیوں کے لاتعداد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی بارش ہونے لگتی۔ پورے پنڈال میں جگہ جگہ کھانے کی میزیں بھی ہوئی تھیں اور جہاں سے گزر کر ہم جا رہے تھے اس کی اطراف میں خوب صورت ماڈرن صوفوں کی قطاریں تھیں جن پر ایک سے ایک حسین چہرہ جلوہ افروز تھا۔ ”باہی آگئے۔ ست بسم اللہ“ ایک نازک اندام سی حسین لڑکی جوش سے آگے بڑھی اور اس نے وجیہ کا بازو تھام لیا۔

”لاڈی! میرا شہزادہ! اُج تے تو چمکاں مار دایا ایں۔“ دوسری جانب کے پہلے صوفے سے ایک بڑی رعب دار عورت اٹھی اور وجیہ کا ہاتھ چومتی ہوئی بولی، اس نے اس طرف سے میرا بازو تھام لیا۔

”واہ! پسند تو تیری بڑی اعلیٰ ہے۔ سوئی جوڑی بنی ہے۔“

”جن تے چائنئی“ والی مثال بھی ہو گئی۔“ اس نے جبکہ کرسیاں سے میرا چہرہ دیکھا اور تعریف کرنے لگی۔

”باہی! آخر لاڈی کی چوائس ہے۔“ وجیہ بے حد خوش تھا۔

”ہاں باہی! یہ تو ہے۔ آپ کی پسند تو کبھی ماڑی (بری) ہوتی ہی نہیں، کیوں باہی؟“ وہ خوب صورت سی لڑکی وجیہ کو دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔

”بس کر..... چپ رہ..... ہر ویلے بولتی نہ رہا کر۔“

وجیہ نے اسے پیار سے آنکھیں دکھائیں۔ ہم دونوں چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ پھولوں کی چٹاں ہم پر نچھاور ہو رہی تھیں اور دونوں اطراف سے تعریف بھری فقرے سننے کو مل رہے تھے۔ ایک بے حد مشہور نغمے کا میوزک دھیمے سروں میں مسلسل بگڑ رہا تھا۔

اس خواب آفرین ماحول میں بڑا جادو تھا، بلکہ مجھے تو یہ سب جادوئی لگ رہا تھا۔ ایک سحر انگیز خواب ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا خواب جس کے کبھی نہ ٹوٹنے کی دعا میرا دل ہولے ہولے مانگ رہا تھا۔

”اتنی پذیرائی اتنی محبت! ایسا دلہانہ استقبال.....“ مجھے تو اس کی توقع نہ تھی، میرا تو خیال تھا کہ وجیہ تو یوں بھی ایک زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ یہ لوگ تو بے حد تنگ ذہن اور روایتی سے ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے ان کے ہاں مرد اپنی پسند اور مرضی سے شادیاں کر لیتے ہیں، لیکن ان بیویوں کو خاندان والے وہ اہمیت نہیں دیتے جو ان کی اپنی خاندان کی بہو، بیٹیوں کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر میں تو بے حد خوش بخت ثابت ہوئی تھی۔ یہاں تو میرے استقبال میں شہزاد یوں کے استقبال جیسا جوش اور پروٹوکول شامل تھا۔

”لاڈلی تو مور پیاہ لایا ہے۔“

”لاڈلی کی دلہن تو پری لگ رہی ہے۔“

”ہائے میرے اللہ! اتنی سوتی۔“

”چل نی، چپ کر نظر نگائے گی۔“

ہمارے اسٹیج تک آتے آتے ایسی ہی پذیرائی قدم قدم پر ہو۔

”آمیرا پتر۔ بسم اللہ کر۔“ اسٹیج پر وجیہ کی اماں پہلے سے موجود تھیں۔ انہوں نے اپنا

ہاتھ بڑھا کر لاڈلی کو اور دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تمام کے ہمیں اوپر چڑھایا۔

”نی اللہ دوسائی، کتھے مرگئی ایں۔“ جیسے ہی ہم اسٹیج پر پہنچے انہوں نے کسی کو قدرے غصے

سے آواز دی۔

”جی بی بی جی۔“ فوراً ہی ایک جوان سی عورت حاضر ہو گئی۔

”صدقے کا تھال لا۔“ وہ ایک حکم سے بولیں۔

”جی بی بی جی ایہ لیں۔“ اس نے وہ تھال جو اس کے ہاتھ میں تھا آگے کر دیا۔  
 ”لے میرے جن ہاتھ لگا دے اسے۔ اور تو بھی۔“ وجیہ کی اماں نے اس تھال پر میرا  
 اور وجیہ کا ہاتھ رکھوایا۔

”جالے جا..... جا کر بخشو کو دے، وغڈ دے گا کیوں میں۔“ انہوں نے اس تھال میں  
 رکھے کپڑے اور روپے تقسیم کرنے کا کہا۔ جسے وہ فوراً ہی لے کر چلی گئی۔

ہم دونوں اسٹیج پر بڑے خوب صورت رنگین بیڑ میوں پر بیٹھ چکے تھے۔ جن کی ساخت  
 بالکل بادشاہی کرسیوں جیسی تھی۔ پورے پنڈال میں چاروں کونوں میں فل سائز ایل سی ڈی  
 اسکرین نصب تھی۔ جس پر میری اور وجیہ کی مختلف زاویوں سے لائیو ویڈیو چل رہی تھی۔ جسے اسٹیج کی  
 بائیں جانب بیٹھے چند کیمرا مین ایک بڑے ریو الونگ کمرے سے بنا رہے تھے۔ میں نے چوری  
 چوری ایک آدھ بار نظریں ادھر ادھر گھمائیں۔ میں ہر زاویے سے بے حد حسین دکھائی دے رہی  
 تھی۔ میری ساس صاحبہ میرے ساتھ براجمان ہو چکی تھیں اور تقریباً دس بی منٹ کے بعد وجیہ نے  
 میرے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔ باہر مردانے میں یار دوست میرا انتظار کر رہے ہیں۔“ پھر وہ  
 رک گئیں۔

”اماں جان! اب آپ اپنی نوں (بہو) کا خیال رکھیں۔ میں چلتا ہوں باہر۔“ اس نے  
 اپنی ماں کو مخاطب کر کے کہا۔

”جاسوہنے جا۔ مرد ہر وقت بیویوں کے ساتھ جڑے بیٹھے اچھے نہیں لگتے۔“ انہوں نے  
 خاصی بلند آواز سے کہا اور ہاتھ پکڑ کے وجیہ کو اٹھا کر وہاں خود بیٹھ گئیں۔

”اللہ وسائی۔“ انہوں نے دوبارہ اللہ وسائی کو آواز دی۔

”جی بی بی صاحب! وہ دوبارہ کسی جن کی طرح حاضر ہو گئی۔

”ادھر کھڑی رہ اور تحفے اور لفافے لے کر رکھتی رہ لوگوں سے..... دیکھ مجھے خود نہ پکڑنا  
 پڑے نہ ہی دلنشین کو.....“

”دلنشین؟“ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اور پھر میں نے نوٹ کیا انہوں نے وہاں سب  
 سے میرا تعارف اسی نام کے ساتھ کروایا۔

”دلنشین..... واہ! کیا نام ہے! اپنے نام کے مکمل معنی ہے آپ کی بہو تو.....“ ایک بڑی

ہی ماڈرن سی خاتون مجھے منہ دکھائی کا لفاظی دینے اسٹیج پر آئیں تو اپنی ہیرے کی انگوٹھیوں والے ہاتھ سے میرے گال کو چھو کر میری تعریف کرنے لگیں، پھر میری ساس سے مخاطب ہوئیں۔ اس بار ان کے لہجے میں ذرا کاٹ تھی۔

”زینت بیگم! آپ کی بہو کے گھر والوں میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا۔“

”وہ.... وہ سب تو لندن میں ہیں۔“ زینت بیگم نے سفید جھوٹ بولا۔

”لن.... دن.... میں۔“ وہ صاحبہ بھی چبا کر بولیں، حیرت اور طعنے کے احتجاج کے ساتھ ان کے لبوں پر بڑی ادا کارانہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ اب وہ میری دوسری جانب بیٹھ کر باقاعدہ زینت بیگم سے بات چیت کرنے لگی تھیں اور میں ان دونوں کی بناوٹ زدہ باتوں کے درمیان گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

”مسز فرخ! آپ کو تو پتا ہے نالا ڈی کوئی کورس کرنے لندن گیا ہوا تھا۔ وہیں پر یہ دونوں اکٹھے پڑھتے تھے۔ لاڈی کا دلنشین پر دل آگیا۔ بس اس نے مجھے فون کر دیا۔ یہاں سے ہم لوگ چلے گئے اور وہاں پر ان کی شادی کر دی۔ ویسے ایک ولیمہ تو ہم نے وہاں لندن میں کر دیا تھا۔ اب آپ کو پتا ہے نا۔ یہاں اپنی برادری اور میل ملاپ بھی تو ہے۔ پھر میرے لاڈی کی شادی تھی سب کو دعوت تو دینی ہی تھی۔“

زینت بیگم نے میرے بازو پر ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے اوپر تلے جھوٹ بولے۔ پھر بھی میں نہ تو چٹکی کی جبین پر ”سی“ کر سکی اور نہ ہی اپنے دل دکھنے پر کہ مجھے تو جھوٹ بولنے والے اچھے ہی نہ لگتے تھے۔ یہی بات تو میری ماما نے میری گھٹی میں ڈال دی تھی کہ حقیقت جتنی بھی تکلیف دہ ہو سچ کیسا بھی کڑوا ہو۔ خواہ اپنی جان جانے کا خوف ہو یا عزت گھٹنے کا۔ مگر بولنا سچ ہی چاہیے..... جیسی تو میں نے بھی وجہ کے معاملے میں ماما سے کوئی جھوٹ نہ بولا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے سامنے کھڑی ہو کر اور ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر کے چھوڑ آئی۔ مگر جھوٹ کا سہارا نہ لیا۔

”آہ! میری ماما!“ اب جو میرے لبوں سے ”سی“ نکلی اسے میں ضبط نہ کر سکی کہ یہ چٹکی تو خود میری انگلیوں نے میرے دل پھر بھری تھی۔

”میری ماما! اور یہ وجہ کی اماں۔“ میں نے ذرا سی ترچھی نظر سے زینت بیگم کو دیکھا تو وہ مجھے خود سے کوسوں دور بیٹھی معلوم ہوئیں۔

”اماں! اب کیا آپ ہی بھر جائی کے ساتھ بیٹھی رہو گی یا ہماری باری بھی آئے گی۔“

کچھ دیر کے بعد وہی لڑکی آکراماں سے لاڈ سے بولی۔

”آؤ نا تم بیٹھو یہ لڑا ہٹی بھر جائی سے باتیں کرو میں ذرا مہمانوں کو دیکھوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی اٹھیں۔

”دلنشین! یہ تمہاری چھوٹی نند ہے صنوباریہ! اور وہ وہ جو بلیک کپہری پر کا مدار گاؤن والی ہے نا وہ وہ دیکھو ایل سی ڈی اسکرین پر جس کا کلوز اپ آ رہا ہے اس وقت۔“ زینت بیگم نے پہلے میری توجہ اشارے سے سامنے ذرا فاصلے پر کسی سے باتیں کرتی ہوئی اس لڑکی کی طرف کروائی جس نے پنڈال میں داخل ہوتے ہی وجہ کے بازو کو تھامنا تھا۔ پھر ایل سی ڈی اسکرین کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا۔

”وہ زویا ہے اس سے بڑی یہ دونوں تمہاری نندیں ہیں اور ہاں ایک دیور بھی ہے تمہارا تیور جی آجائے گا وہ بھی اچھی۔“ انہوں نے مجھے ساری تفصیل بتائی اور صنوباریہ کو میرے ساتھ بٹھا کر خود بڑے غرے سے اسٹیج سے اتر گئیں۔

”اوہ مائی گاڈ! دلنشین بھابی! آپ کتنی آفت لگ رہی ہیں۔“ صنوباریہ نے میرے ساتھ چپکتے ہوئے اپنے حلق سے انگریزی تلفظ کی بگڑی ہوئی آواز نکالی۔

”جی شکریہ۔“ میں نے مسکرا کر مختصر کہا۔

”اللہ وسائی!“ اس نے بھی بیٹھتے ہی اللہ وسائی کو آواز دی جس کے ساتھ کھڑی ایک اور عورت حنائف اور لفافے سمیٹنے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔

”جی صنوبی ہابی!“ وہ فوراً کارلش بجانے کے انداز میں جھکی۔

”اس بختاں کو بولو جا کر ذرا اس ویڈیو بتانے والے سے کہے میں بھر جائی کے ساتھ بیٹھی ہوں میرے اچھے اچھے پوز اسکرین پر دکھائے۔“

اس نے اللہ وسائی کو سرگوشی کے انداز میں ہدایات دیں اور خود اپنا آپ درست کرنے لگی۔ خاص طور پر اس نے اپنا دوپٹہ گلے سے ہٹا کر کندھے کے ایک طرف لٹکایا اور ذراتن کے بیٹھ گئی۔ اللہ وسائی کے ہونٹ فوراً ہی بختاں کے کانوں سے گلے اور بختاں نے بجلی کی سی تیزی سے ویڈیو آپریٹر تک یہ اطلاع پہنچائی جس پر ویڈیو آپریٹر نے مسکراتے ہوئے کیمرا کا زوم صنوبی پر فٹ کر دیا۔ اب چاروں طرف صنوبی کے مختلف پوز نظر آرہے تھے۔ وہ اچھی پیاری سی لڑکی تھی۔ مجھے اس کا یہ انداز بالکل فطری ہی لگا جیسے ایک نوجوان لڑکی (جو کہ خوب صورت بھی ہو) کو توجہ حاصل



کرنے کا شوق ہوتا ہے کہ سب اسے ہی دیکھیں اسی کی تعریف کریں۔  
 ”صنوبی! تم بہت پیاری ہو۔ رنگی لٹک پر مٹی۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہولے سے کہا تو وہ بے حد خوش ہو گئی۔

”لاڈی پاجی تو واقعی ہمارے لیے چاند جیسی بھر جائی لائے ہیں۔“ وہ میرے ساتھ اور بھی چڑ مچی اور میں مسکرا دی۔

پھر کھانا شروع ہو گیا۔ لوگ مجھ سے ہٹ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اللہ وسائی اور بچاں نے وہاں موجود دھروں کی مدد سے میرے سامنے کی میز پر بھی کھانا چنوائے کی کوشش کی۔ مگر میں نے منع کر دیا۔ جس پر ایک اور اونچی لمبی خاتون اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئیں اسٹیج پر آ کر ذرا پوچھنے والے انداز میں پوچھیں۔

”کیا بات ہے دلنشین! کھانا کیوں منع کر دیا۔“ وہ خاتون پچھلے ایک کھٹنے سے مسلسل سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی اپنے ساتھ بیٹھی دیے ہی غروں والیوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں اسٹیج پر میرے قریب نہ آئی تھیں البتہ کئی بار میں نے صنوبی اور زویا کو ان کے ساتھ جھک کر باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

”جی۔ وہ میں یہاں سب کے سامنے کھانہ نہیں پاؤں گی۔“ میں نے بغیر کسی جھجک کے سچ کہا کہ جھوٹ اور بناوٹ کی مجھے تو عادت تھی ہی نہیں۔  
 ”رہنے دیں نامما“ بھر جائی اپنے کمرے میں جا کر کھالیں گی۔“ صنوبی نے میری حمایت میں کہا۔

”ممما؟“ بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔

”اوہاں! دلنشین بھر جائی! یہ میری مہاں بلکہ میری زارا اور جی کی ممما اور لاڈی بھائی کی چھوٹی ممما۔“ صنوبی نے ان کا مکمل تعارف مجھ سے کروایا۔

”یعنی وجہ کی سوتیلی ماں۔“ میرے ذہن میں ایک انجانی سی چیمپن انہیں دیکھتے ہی جو ہوئی تھی یہ اس کا مطلب تھا۔ اف میری چھٹی حس۔ میں نے اپنی چھٹی حس کو ذرا سا جھڑکا جو بے حد تیز تھی اور مجھے بہت کچھ دوسروں کے بارے میں پہلے سے بتا دیا کرتی تھی۔

”مرضی ہے اس کی۔ لیکن اگر یہ سوچ رہی ہے کہ آج لاڈی اس کے ساتھ کھانا کھائے گا تو یہ بھول جائے۔ آج تو لاڈی زنا نے میں آئے گا ہی نہیں۔ اس کے یار دوستوں نے محفل سہائی

ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے تو وہ انجوائے منٹ کے.....“

”مما! وہ کرل صاحب کی مزر آپ کو بلا رہی ہیں۔“ صنوبی نے اپنی ماں کی بات پوری ہی نہ ہونے دی اور انہیں دوسری طرف متوجہ کر دیا۔

”ہاں..... وہ بیگم کرل محی الدین۔ اور وہ ان کے ساتھ ایم این اے ضیاء بخاری کی مزر اور وہ.....“ وہ بڑی ادا سے اپنی ساری سہیلیوں کے شوہروں کے نام اور مقام بتانے لگیں۔ اور پھر اسٹیج سے اتر گئیں یہ کہتی ہوئی۔

”صنوبی! بتا دینا لاڈی کو میں نے اس کی بیوی کو کھانے کا پوچھا تھا۔“ وہ مجھے ”بیوی“ کہتے ہوئے جانے کیوں طہر سے مسکرائیں اور جانے مجھ پر کیا کرتا کر گئیں مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ میرا ذل تو وجیہ کے آج رات زنانے میں نہ آنے کا سن کر ہی اداس ہو گیا تھا۔ پھر کون کون اسٹیج پر آ کر میرے ساتھ بیٹھتا رہا۔ تصویریں اور مووی بنواتا رہا۔ میری کتنی تعریف کرتا رہا۔ اور پھر کب وہاں صنوبی اور زویا نے بھائی کے ولیمہ پر لڈی ڈالی۔ اور ان پر ان کی دونوں ماؤں نے کتنے کڑکڑاتے ہوئے نوٹ وارد کر رکھ دیے مجھے کچھ پتا نہیں چل سکا کیونکہ میرا دل اور دماغ تو وجیہ کی طرف الجھا ہوا تھا۔ دراصل کچھلی دورا تیں میرے لیے زندگی کے دو خوبصورت سالوں جیسی گزری تھیں جن کے ایک لمحے میں بھی وجیہ مجھ سے الگ نہ ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی باتیں مجھے واقعی پروں کے دیس میں لے گئی تھیں اور آج تیسری رات اس کی طرف سے ہجر کا پیغام آ گیا تھا جو میرے لیے خاصا سوہان روح تھا۔ وہ نہیں تھا تو یہ سارے پنڈال کی پذیرائی میرے لیے پھینکی اور بے معنی تھی اور وہ آج دیکھنے والا نہیں تھا تو یہ سارا سنگھار بے کار تھا۔ مجھے ایک دم سے سب برا لگنے لگا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جاؤں وہاں جہاں اس وقت وجیہ موجود تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ ماحول اور یہ سارے لوگ مجھے اپنے نلگ رہے تھے۔



کوئی رات کے ڈیڑھ بجے پنڈال سے میرے کمرے تک لایا گیا۔ عجیب بات جو آج ہی میرے ساتھ ہوئی اور مجھے اس کے ہونے سے یہ بھی سمجھ آ گئی کہ یہاں لوگ کس فطرت کے ہیں! وہ یہ ہوئی کہ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی وجیہ کی اماں زینت بیگم نے اللہ رسائی کو آواز لگائی۔ اسے وہ سارے تحائف اور لٹاف اپنے کمرے میں پہنچانے کا حکم دیا اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے

چل دیں۔

”ڈنشین کو اس کے کمرے میں چھوڑ آنا“ میں تو بہت تھک گئی ہوں۔“ ان کے جانے کے بعد باقی سب بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ زویا اور اس کی ممانے ویسے بھی مجھے کوئی خاص لفٹ نہ کرائی تھی، اس لیے وہ بھی دور سے ہی ٹاٹا ہائے ہائے کرتی ہوئی چلی گئیں۔ اسٹیج سونا ہو گیا۔ ہیرے کھانے کے جمونے برتن سمیٹنے لگے۔ ویڈیو آپریٹر اپنے آلات باغدھنے لگا اور ڈیکوریشن والے آکر ارد گرد کے گلدستے اور لائٹس ہٹانے لگے۔ مجھے اس وقت بے حد شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مصروف تھا اور میں جو دلہن بنی اسٹیج پر بیٹھی تھی اس سے لا تعلق..... مجھے لگا بس میرا کردار یہاں تک کے شارٹ میں ختم ہو گیا ہے۔ میں نے یہ شارٹ اچھا دے دیا تھا، اس کی شاباشی سارے مہمان مجھے دے کر جا چکے تھے اور اب وہ سارے لوگ جو اس ڈرامے کے کردار تھے۔ ہدایت کار تھے یا کیرہرہ مین ویسٹ ڈیزائنر وغیرہ۔ سب تھک چکے تھے۔ اب تو بیک اپ ہو رہا تھا جس کا اشارہ زینت بیگم دے گئی تھیں۔

”آؤ بھر جائی! میں آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔“

بالآخر صنوبی کو میرا خیال آ ہی گیا اور وہ مجھے وہاں سے لے جانے کے لیے آگئی ورنہ تو میرے جی میں یہ خیال بھی آنا شروع ہو گئے تھے کہ کہیں کسی کو نے سے میرے لیے یہ آواز ہی نہ آ جائے کہ ڈنشین بی بی اب اٹھو اور اپنے کمرے میں جاؤ۔ لیکن اللہ کا شکر کہ ایسا نہ ہوا تھا۔

”دیکھ کے بھر جائی.....“ سنبھل کے.....“ اسٹیج پر سے اترتے وقت میرا پاؤں مڑا تو صنوبی نے مجھے سنبھالا۔ میں اس کا ہاتھ تمام کے چپے اتری۔ وہ مجھے باہر کھڑی ایک پھارو تک لائی تھی۔

”بسم اللہ کر اس..... سلام آکھاں بھر جائی.....“ ایک بالکل وجہ جیسے شخص نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے تمام لیا اور میرے لیے گاڑی کا دروازہ ٹھیک اسی انداز میں کھولا جیسا کہ وجہ کھولنا تھا۔ ایک لمحے کو تو میں چکر ای گئی۔ مجھے لگا وجہ ہی مجھ سے شرارت کر رہا ہے لیکن جب وہ میرے لیے دروازہ کھول رہا تھا تو میں نے دیکھا اس کا قد اتنا بلند نہ تھا جتنا کہ میرے وجہ کا تھا۔

”دمی پاجی..... ابھی رکو بچاں نے بھی آنا ہے۔“ میرے وہم کو یقین میں صنوبی نے فوراً ہی یہ کہہ کر بدل دیا تھا۔

”بجٹاں کو لے کر جانا میری ذمہ داری ہے کیا؟ خود ہی آتی رہے گی۔“ وہ قدرے بد  
 قیامی سے بولا اور اس نے دوسری جانب سے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔  
 ”پاپی..... وہ کس کے ساتھ آئے گی، سب جا چکے ہیں۔“ صوبلی منمنائی تو وہ اس پر  
 احسان کرتا ہوا بولا۔

”آج تو لے جاتا ہوں پر یہ کی کمین میری گاڑی میں بیٹھنے کے لائق نہیں ہیں۔“  
 اس نے بمشکل دو منٹ انتظار کیا اور جب بجٹاں ہانپتی ہوئی آئی تو اسے جھاڑتا ہوا بولا۔  
 ”کھسے مرگئی تھی میں تیرے باپ کا نوکر ہوں کیا؟“  
 ”نہیں جی ہمارے مائی باپ آپ..... وڈیروں کے نوکر تھے اور ہم کی آپ کے نوکر ہیں  
 ۔ معافی دے دو جی.....“ وہ بے چاری مارے شرم کی زمین میں گڑی جا رہی تھی۔  
 ”چل چل بکو اس نہ کر..... اندر بیٹھ۔“

تیسروں نے اس کے بڑے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھے بغیر حقارت سے کہا۔  
 ”یا اللہ شکر ہے بلکہ صد شکر ہے کہ میرا وجیہ ایسا نہیں ہے۔ وہ تو ان میں سے لگتا ہی نہیں۔  
 اتنا بااخلاق، پادب اور تعلیم یافتہ۔ دراصل ان لوگوں میں تعلیم کی کمی بھی ہے نا۔“  
 ”میں بھرجائی کو اپنا تعارف تو کرادوں۔ وہ میری طرف جھٹکا ہوا بولا۔  
 ”آئی ایم تیسرے پیرزادہ ایم بی اے فرام لمز۔ اب میرا ارادہ UK جانے کا ہے۔“ اس  
 نے بڑی شستہ انگریزی اور پھر اردو میں اپنا تعارف کراتے ہوئے میری جانب مصافحہ کے لیے اپنا  
 ہاتھ بڑھا دیا بالکل وجہ کی طرح۔

”ٹائٹس ٹو میٹ یو۔“ مجھے مسکرا کر کہنا پڑا لیکن میرا دل اندر سے پریشان ہو گیا تھا۔ یہ لوگ  
 کس قسم کے ہیں ان کے چہروں پر کتنے نقاب ہیں اور زویا کی ممانعت النساء..... سب لوگ ایک جیسے  
 تھے، کبھی اتنے اجڈ کہ ان کی بولی بھی ان کے اندر کی طرح پیوند کار ہوئی سنائی دیتی ہے۔ نہ اردو نہ  
 پنجابی خاص انداز میں اکھڑا اور جھٹکے مارتا ہوا عجیب سا تلفظ جس میں نرمی یا محبت نام کی کوئی چیز بھی  
 شامل نہیں ہوتی اور کبھی اتنی میٹھی کہ اندر تک چپکتی چلی جائے۔

”کیا سوچنے لگیں بھائی جان، ہم لوگ ایسے ہی ہیں۔ محبت کریں تب بھی اگلے کی جان  
 نکال لیں اور دشمنی پر آئیں تو بھی جان لے کر ہی چھوڑیں۔“ اس نے مجھے کھویا ہوا پا کر مجھے  
 چھیڑتے ہوئے کہا۔

”اودھ میرے اللہ..... یہ واقعی بڑے پراسرار لوگ ہیں سب ہی کو دلوں کے حال چہروں پر دکھائی دے جاتے ہیں۔ وجہ یہ بھی تو میری خاموشی کے جوابات دے کر مجھے حیران کر دیا کرتا تھا۔“  
 ”ویسے بھابی نے اگر خاندان سے لکڑی ہے تو ٹھیک لی ہے۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔“ وہ ذومعنی الفاظ میں میری تعریف کر رہا تھا جو مجھے اس کے منہ سے اچھی نہ لگی۔

”اچھا تو آپ کے شوق کیا کیا ہیں؟“ وہ راستے میں ہی مجھ سے بے تکلف ہو رہا تھا۔  
 ”جی کچھ خاص نہیں بس مجھے اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے اور اچھی موسیقی۔“  
 ”اچھی موسیقی..... واہ پھر تو ہماری خوب بنے گی۔ اس نے میری بات کا آخری لفظ میرے لبوں سے اچک کر بات پوری کی اور سی ڈی پلیئر آن کر دیا راحت فتح علی خان کی پرسوز آواز اور اس کی گاڑی کا بہترین اسٹیرلو..... میرا موڈ بہت اپ سیٹ ہونے کے باوجود مجھے اچھا لگا۔

گم سم گم سم پیار دا موسم  
 بھناں دیر نہ لائیں.....

”آہ..... کتنا بڑا امتحان ہے لاڈلی پاجی کو آج تو یہ ظلم نہیں ڈھانا چاہیے تھا۔“ وہ میری طرف گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا گنگنانے لگا۔ مجھے اس وقت اس سے عجیب سی وحشت ہونے لگی۔

”صنوبی! گھر کتنی دور ہے؟“ میں نے پیچھے بیٹھی صنوبی سے پوچھا۔  
 ”گھر جا کر کیا کریں گی بھر جانی..... اچھا ہے آج کی رات اسی گاڑی میں لوگ ڈرائیو کرتے ہوئے گزار دیں۔“ وہ بار بار مجھے احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج وجہ گھر نہیں آئے گا اور مجھے یہ رات تنہائی میں گزارنی ہوگی۔  
 ”کیوں پاجی! کیا آپ محفل و موسیقی میں نہیں جائیں گے۔“ صنوبی نے اپنے بھائی کو یاد دلانے والے انداز میں پوچھا۔

”میں یہ پروگرام اپنی بھر جانی کے نام مس کرنے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ بھر جانی ہم سے باتیں کرے۔“ وہ پھر مجھ سے مخاطب تھا۔

”لیں جی ہمارے تو دونوں بھائی ہی گئے کام سے۔“ صنوبی نے ہنستے ہوئے اپنے طور پر توفیق کیا تھا مگر مجھے یہ بات بہت بری لگی لیکن یہاں میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسے کچھ کہہ نہ سکی۔ اتنے میں گاڑی کے بریک چرچائے اور اس نے ایک دم سے بریک لگا کر گاڑی کو روکا جس سے

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور میں باوجود کوشش کے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور تیور پر مگر کرنے کے انداز میں ٹکرائی۔

”بسم اللہ آکھاں.....“ اس نے مجھے دونوں کندھوں سے تمام کے سنبھالا اور مسکراتے ہوئے نرمی سے چھوڑ دیا۔

”بھئی کبھی آپ کو گرنے نہ دے گا“ آتما کر دیکھ لیجئے گا۔

گاڑی رکی تو سب سے پہلے بچاں تیزی سے اتری اور اس نے گاڑی کے اگلے پچھلے دروازے کھولے۔

اس سے پہلے کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نیچے اتارتی تیور نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آؤ بھرجانی! اللہ کا نام لے کر اپنے گھر میں پیر دھرو۔ لاڈی پاجی کے آدھے کام میرے ہی ذمے ہوتے ہیں۔ لگتا ہے آپ کی ذمہ داری بھی بٹانی پڑے گی۔“ وہ جب سے ملا تھا ایسی ہی باتیں کر رہا تھا اور بازی نہ آ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”تھینک یو بھی! مجھے سہاروں کی عادت نہیں۔ میری ماں نے مجھے اعتماد سے جینا سکھایا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

”دیری گڈ مجھے با اعتماد لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ لائیک یو۔“ اس نے ذرا بھی برا نہ منایا اور مجھے پھر بھی سہارا دے کے اندر تک لے آیا۔ یہ ایک خاصی بڑی حویلی تھی جس کی کئی راہداریوں سے گزر کر ہم ایک کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔

”یہ ہے آپ کا کمرہ..... میرا مطلب ہے جملہ عروسی۔“ وہ اب میرا ہاتھ چھوڑ کے دروازے کی چوکت پر راستہ روک کے کھڑا ہو گیا، جہاں کچھ ہی لمحوں میں زمینت بیگم اللہ وسائی اور زویا بھی آگئیں۔

”بڑی دیر لگا دی تھی تو نے..... دیکھ تو سہی کیا ویلا ہو گیا ہے۔ بس پوچھنے ہی والی ہے۔“ زمینت بیگم نے ایک لمبی سی جھائی لیتے ہوئے کہا۔

”آجانی اللہ وسائی..... کتنے مر گئی.....“ انہوں نے پھر اللہ وسائی کو پکارا۔ مجھے لگ رہا تھا اللہ وسائی کے بغیر تو وہ نوالہ بھی توڑ کے اپنے منہ میں نہ ڈالتی ہوں گی۔

”جی بی بی جی.....“ اللہ وسائی سرسوں کا تیل لیے کھڑی تھی جسے زمینت بیگم نے اس

کے ہاتھ سے لے کر میرے کمرے کی چوکھٹ پر ڈالا۔ میں یہ سب بہت ہی حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ ہمارے گھر میں تو ایسی باتوں ایسی رسوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں نے اپنے خاندان کی کئی شادیاں دیکھی تھیں، کبھی کسی نے یہ کچھ نہ کیا تھا جو یہاں ہو رہا تھا۔

”بسم اللہ کر کے سیدھا بیرو اندر رکھ..... اللہ کرے تو میرے لاڈی کے لیے خوش بخت ہو۔“ زینت بیگم نے مجھے گم سم دیکھ کر زبردستی پکڑ کر مجھے اندر دھکیلنے کی کوشش کی تو میں نے بغیر کچھ پوچھے اپنا دایاں پاؤں اندر رکھ دیا۔

”آں..... ہاں..... اب اور آگے نہیں۔“ تیمور نے پھر سے میرے سامنے کھڑے ہو کر اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔

”ہوٹنمی! یہ ہمارا حق ہے تمہارا نہیں۔“ زویا نے بھائی کے بازو نیچے کیے اور خود اس کی جگہ پر آگئی۔ میں اب بھی حیران تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

”چلو لٹشین بھر جائی! نیک نکالو پھر سچ تک جانے دیں گے۔“ وہ اپنا ہاتھ آگے کیے ٹیک مانگ رہی تھی جس کا مجھے واقعی علم نہ تھا کہ کیا ہوتا ہے۔

”بھئی! ان بچپوں کو کچھ دے دلا کر فارغ کریں، میرا مطلب ہے کوئی رقم یا تحفہ۔“ ہمیں نے میرے کان میں سرگوشی کر کے مجھے ٹیک کا مطلب سمجھایا تو میں نے اسے پہلی بار شکریے کی نظر سے دیکھا اور اپنا پرس کھولا۔

”نہ..... نہ..... بھر جائی یہ نہیں..... پیسے بہت ہیں میرے پرس میں۔ ہو سکتا ہے آپ سے زیادہ ہی ہوں اس وقت۔“ وہ تنک کر بولی۔

”تو پھر..... جلدی کرو..... بولو.....“ میری جگہ ہمیں نے اس سے پوچھا۔  
 ”پاجی! آپ کا معاملہ نہیں ہے آج میں نہ آؤ۔“ اس بار صنوبی مجھے چھوڑ کر اپنی بہن کے ساتھ تھی۔

”واہ..... واہ..... تم دو اور لٹشین اکیلی۔“ وہ میرے ہی ساتھ تھا۔  
 ”بولو..... بولو..... کیا چاہیے؟“ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔  
 ”مجھے تو وہ چاہیے۔“ زویا نے بے تکلفی سے میرے گلے کی طرف انگلی کر کے کہا۔ میں سمجھی یہ وہ جڑاؤ ہار مانگ رہی ہے جسے دو دن پہلے وہ پارلروالی علینا لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ.....“ میرا ہاتھ اس ہار پر اور میرا دل حلق میں آپڑا۔ پتا نہیں کیوں خود یہ ہار بہت پسند آ گیا تھا۔

”نہ..... نہ..... یہ..... نہیں ایسے تو ہم سب کے پاس ہیں۔ مجھے تو یہ چاہیے۔“ وہ قریب آ کر میرے گلے میں پڑے ہوئے اس نازک سے ڈائمنڈ کے لاکٹ کو چھوتی ہوئی بولی۔  
”یہ پاسیے۔“

”یہ.....؟“ میرا حلق میں پڑا دل دوبارہ میرے سینے میں گرا اور ڈوب گیا۔  
”یہ تو وجیہ نے مجھے گفٹ کیا ہے۔“ میری مری مری سی آواز نکلی۔  
”لاڈی پاجی آپ کو پھر لادیں گے۔ پریشانی کیا ہے۔“ وہ زبردستی میرے گلے سے لاکٹ اتارنے کو تیار تھی۔

”زدیا..... بد تمیزی مت کرو۔“ تیمور نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ روکا۔  
”مجھے یہی پسند ہے اور نیک میں اپنی پسند کی چیز لیتے ہیں۔“ وہ منہ بسورنے لگی۔  
حالانکہ عام طور پر میں کسی اپنی کوئی چیز کسی دوسرے کو یوں دیا نہیں کرتی تھی جو میری غیور ہوتی مگر اس وقت موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے وہ لاکٹ اتار کے اسے دے دیا۔

”اوسو سوٹ بھر جانی! آپ کا دل تو لاڈی پاجی جیسا ہے۔“ زدیا نے وہ لاکٹ مندیوں کی طرح اپنے گلے میں ڈالا اور پرے ہو گئی۔ اب میں صوبی کی طرف دیکھ رہی تھی کہ جانے وہ کیا مانگ لے۔ اس نے کچھ دیر مجھے تاپنے تو لے والے انداز میں دیکھا اور پھر ہنس کے بولی۔

”میرا نیک بھر جانی کی مرضی کا۔ جو چاہے دے دیں۔“ وہ میرے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلا کے کھڑی بیمار سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنا پرس بغیر کھولے اس کے ہاتھ میں دے دیا جس پر اس نے وہ پرس کھول کر اس میں سے چند ہزار روپے نکالے اور پرس واپس مجھے دے دیا یہ کہتے ہوئے۔

”بھر جانی! یہ تو رسمیں ہوتی ہیں ورنہ پیسوں کا کیا ہے۔“ اس نے میرے ہاتھ کو پکڑا اور مجھے بیڈ پر بٹھا دیا۔

”چلو بھئی اب ہذا اب میری باری ہے۔ کمال ہے سب نے اپنا اپنا نیک لے لیا، میں اکلوتا دیور ہوں، میرا بھی تو حق ہے۔“

اس بار تیمور تالی بجا کر انہیں ہٹاتا ہوا آگے آ گیا۔



”یا اللہ خیر.....“ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔  
 ”چلو بھر جانی! اپنا کوڑا (گھٹنا) سیدھا کرو۔ وہ بے تکلفی سے میری طرف بڑھا تو میری  
 جان ہی نکل گئی۔ اب کون سے رسم رہ گئی ہے؟  
 ”دلنشین! دیور کو گھٹنے پر بیٹھنے دو۔“ زینت بیگم نے آگے بڑھ کر باقاعدہ میرا گھٹنا سیدھا  
 کرتے ہوئے کہا۔  
 ”اتنی بے شرمی کی رسم.....“ میں نے حیا سے سیٹھتے ہوئے اپنا گھٹنا چھڑانے کی کوشش  
 کرنی چاہی۔

”آپ..... آپ یہ رسم رہنے دیں! میں ٹیک ایسے ہی دے دیتی ہوں۔“  
 ”یہ رسمیں ہماری خاندانی ہیں اور بچوں کے ٹیک ان کا حق اور شگون ہوتے ہیں۔ کوئی  
 روپوں کا لالچ نہیں ہوتا بیگم صاحبہ!“ فخر النساء بھی اپنے لمبے بالوں کا جوڑا کستی ہوئی آگئیں۔  
 ”یہ سب تو ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ رسمیں، شگون..... یہ سب گناہ ہے،  
 شرک ہے۔“ نادانستہ ہی میرے منہ سے نکل گیا۔  
 ”اچھا..... تو یہ سب کیا ہے جو تم نے کیا؟“ انہوں نے ایک دم ہی مینٹر بدلا اور بڑے  
 ہی کاٹ دار لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئیں۔  
 ”چھوڑیں نا ماما! آپ کیا لے کر بیٹھ گئیں۔“ تیمور نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کے گلے  
 میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”ویسے بھی میں اتنا شیر جوان اور بھر جانی کا یہ اتنا سا گھٹنا، کہیں کچھ ہو گیا تو لاڈی پاجی کو  
 کون جواب دے گا۔“ وہ میرا پچاؤ کر رہا تھا مگر فخر النساء جو کہنا چاہتی تھیں، وہ کہہ کر ہی باز آئیں۔  
 ”نہ تو ہٹ پرے یہ عورتوں کی باتیں ہیں ہمارے خاندان کے رواج ہیں۔ یہ دودن کی  
 آئی ہمیں سکھائے گی کہ کیا گناہ ہے کیا ثواب۔“  
 انہوں نے تیمور کی ایک نہ مانی۔

”چل بیٹھ تو اس کے گھٹنے پر۔ رسم پوری کر۔“ وہ تو باقاعدہ لڑنے کو تیار تھیں۔ تیمور آگے  
 بڑھ کر میرے سامنے بیٹھ گیا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے گھٹنے پر رکھ دیا۔ بیٹھا وہ بھر بھی نہیں۔  
 ”لاؤ بھر جانی میرا ٹیک دو۔“ وہ مجھے مسکرا کر دیکھتا ہوا محبت سے اپنا ہاتھ پھیلائے بیٹھا

”کک .... کک .... کیا لو گے؟“ میرے خشک حلق میں کانٹے سے چھ رہے تھے۔ میری تو آواز بھی گھٹ چکی تھی۔ بارے ندامت اور غیرت کے میں تو اس وقت ان سب کے سامنے آنکھیں اٹھانے کے لائق نہ رہی تھی۔

”مجھے تو بس آپ کی کلکیشن سے کچھ چاہیے۔ کوئی اچھی سی کتاب جو آپ کی فیورٹ ہو۔“ وہ اسی نرمی سے بولا۔

”پاجی! یہ کیا..... آپ کے پاس کیا کتابوں کی کمی ہے۔ الماریاں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔“ زویا نے پھر اپنی تند زبان کھولی۔

”آپ یہ لے لو یا پھر اس میں سے کچھ.....“ میں چونکہ ان رواجوں کے متعلق زیادہ جانتی نہ تھی اس لیے میں نے اپنے پرس میں سے روپے اور اپنے زیورات کی وہ زریں کام والی حلی اس کی طرف بڑھا دی جس میں کیا کیا کچھ موجود تھا مجھے اس کی خبر بھی نہ تھی۔

”بی بی! زیادہ حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ہمارے ہی گھر کا ہے۔“ ہتا نہیں کیوں فخر النساء مجھے ذلیل کیے جا رہے تھیں اور زینت بیگم بالکل خاموشی سے ایک طرف صوفے پر بیٹھی اللہ وسائی سے اپنے کندھے دوہا رہی تھیں۔

”اچھا ماما! اب چپ کرو بس بہت ہو گیا۔“ ایک دم سے تیور غصے میں آ گیا۔

”حد ہوتی ہے وہ ابھی اپنے گھر میں داخل ہوئی ہے اور تم لوگوں نے ساس بہو والا تماشا کھڑا کر دیا۔“ اب تمہی کھل کر میری حمایت میں اپنی ماں سے جھگڑ رہا تھا۔

”تمہی پاجی! آپ ماما کے ساتھ بد تمیزی کر رہے ہیں۔“ زویا نے بھائی کو جتلاتا چاہا۔

”چپ کر ماما کی چچی..... اور چل جا کر سواپنے کمرے میں اور باقی سب بھی اٹھو نہیں کرنے رواج رکھیں۔ گھنڈہ ہو گیا کچھ اس میں.....“

اب تیور بیز زادہ اپنے پہلے والے روپ میں آچکا تھا اس نے اپنا تہذیب یافتہ لبادہ اتار کے پرے پھینک دیا تھا۔ وہ تو اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ اتنا گرم ہو رہا تھا کہ دید لگا بخا بھول گیا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پریشانی سے ٹھنڈے ہونے لگے۔

تمہی پلیز.....“ میں نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہلتی نگاہوں سے اسے ایسا کرنے سے روکا۔

”اٹس آل رائٹ۔“ وہ کچھ ٹھنڈا ہو کر زینت بیگم کے قریب صوفے پر جا بیٹھا۔

”لائیں سائیں! میں آپ کا سرد بادوں۔“ اللہ وسائی کو زینت بیگم نے ایک خاموش اشارہ کیا وہ فٹ سے تیمور کا سر دبائے کو آگے بڑھی۔

”مٹھڑ تو..... پرے مٹ..... مر نہیں رہا میں۔“ تیمور نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے پھر غصہ کیا تو وہ بے چاری سہم کر دور ہٹ گئی۔ میرے کمرے کا ماحول جو پہلے ہی فخر النساء کی آمد سے مکدر ہو چکا تھا اور بھی خراب ہو گیا۔

”چل نی اٹھ..... ہو گئیں رسمیں..... دفع ہو ادھر سے بلکہ ہم سارے ہی دفع ہو جاتے ہیں۔“ فخر النساء نے نیچے بیٹھی بچاں کو ایک ٹھوکر خواخواہ ہی رسید کی اور اپنی بیٹیوں کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی چل پڑیں۔

”چھوڑ دے یہ اس کا تھہ..... اور تو بھی..... کیسے خفے اور کیسے نیک.....“ انہوں نے زویا کے گلے سے لاکٹ کھینٹا اور صوبی کے ہاتھ سے روپے اور انہیں میرے سامنے بیڈ پر پٹخ کے دے مارا۔

”ٹھیک ہی کہتے ہیں وڈو ڈیرے جو اپنے جن والوں کا نہ ہو ادھ کسی کا کیا ہوگا۔ کر دایانا سیا پا آتے ہی۔“ وہ باقاعدہ میرے سامنے کھڑی ہو کر مجھے بڑا ہی سخت طعنہ دے کر گئیں اور میں زمین میں گڑ کر رہ گئی۔ ان کے پیچھے پیچھے ہی زینت بیگم اور اللہ وسائی بھی کمرے سے نکل گئیں۔

میں سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھ مروڑتی رہی اور میرے گالوں پر میرے آنسو پھیلتے رہے۔ یہ آنسو میں ضبط نہ کر پار ہی تھی۔ یہ اس درد کے نتیجے میں بہنے والے آنسو تھے جو اس وقت میری لیس لیس میں بہہ رہا تھا جو فخر النساء کی زبان کے نشتروں کے گلنے سے ہو رہا تھا۔

”زبان کے زخم بے حد گہرے ہوتے ہیں۔ بہت تڑپاتے ہیں۔ ان کے گڑھے بھلے بھر جاتے ہوں مگر ان کے تو نشان بھی دھواں دیتے رہتے ہیں عمر بھر اس لیے اپنی زبان کو ہمیشہ سنبھال کر استعمال کیا کرو۔“ ایک بار جب میں خاتون آپ کے ساتھ کچھ بدتمیزی کی تھی تو میری ماما نے مجھے کتنے پیار سے سمجھایا تھا۔ ان کی تب کی کبھی ہوئی بات کا مطلب آج پوری طرح واضح ہو کر مجھ پر بیت رہا تھا۔

”ماما.....“ میں نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچا مگر پھر بھی ایک سسکی کہتے ہوئے نکل ہی گئی اور میرے آنسوؤں کے بہنے میں اور بھی روانی آ گئی۔ تیمور چند لمحے تو بیٹھا مجھے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر یہ کہتا ہوا تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

”بھر جائی! کمرے کی کنڈی اندر سے لگا لینا“ پالا ڈی کیا خبر کب آئے۔“ اس کے جانے کے بعد میں مرے ہوئے قدموں سے اٹھی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ بند کر کے چھٹی چڑھا دی۔



”ٹھک..... ٹھک..... ٹھک.....“ کوئی کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھی اور بغیر کچھ بھی سوچے دروازہ کھول دیا۔  
 ”سوری..... سوری ڈار لنگ..... میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا.....“ وجیہ مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

”وجیہ! تم کہاں رہ گئے تھے۔“ میں اسے اپنے سامنے پاتے ہی بے اختیار ہو گئی اور اس کے گلے سے لگ کر ہچکیاں لینے لگی۔

”ارے..... رے..... یہ کیا بھی..... یہ رونے دھونے کا پروگرام وہ بھی ابھی سے اور اس وقت۔“ اس نے مجھے نرمی سے خود سے علیحدہ کیا اور بستر پر تقریباً گر سا گیا۔

”آ جاؤ..... آ جاؤ..... یار! میں بہت تھک گیا ہوں۔ میرا سر بھی درد سے پھٹا جا رہا ہے۔“ وہ مجھے اپنی طرف بلاتا ہوا واقعی بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”وجیہ تم.....“ میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔  
 ”شش..... شش..... ش.....“ وہ نہیں نہ کچھ پوچھتی ہیں اپنے دولہا سے اور نہ ہی زیادہ

بولتی ہیں۔ بھئی وہ نہیں جو ہوتی ہیں! انہیں شرم جو آتی ہے۔“  
 اس نے میرے لیوں پر اپنی انگلی رکھ کر مجھے چپ کرایا اور میرے زانو پر اپنا سر رکھ کر بڑا

بڑا تاتا ہوا پل بھر میں گہری نیند سو گیا۔  
 ”وجیہ۔“ میں اس کے الجھے اور نکمرے ہوئے ہال سنوارتی ہوئی سوچنے لگی۔ ”میری

شادی سے لے کر اب تک جو کچھ ہو رہا تھا وہ کتنا غیر یقینی اور پراسرار تھا بلکہ شادی سے لے کر کیوں شادی سے پہلے وجیہ سے محبت.....

”محبت.....؟“ میرے دل پر کسی نے چٹکی بھری۔ ”پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کی جانے والی محبت.....“

کوئی میرے اندر نہس کر مجھ پر طنز کر رہا تھا۔  
 ”کیا ایسے ہوتی ہے محبت؟ کیا محبت جان بوجھ کر کی جاسکتی ہے؟“  
 ”یہ کیا ڈھکوسلے بازی ہے۔ زن..... نہیں..... دلنشین بیگم؟“ میرا اندر مجھے لٹاڑنے لگا تھا۔

”اپنا خیال زبردستی اس کے دل میں اور اپنے دل میں اس کے خیال کو بسا کر اور ہر روز جان بوجھ کر مختلف طریقوں سے اس کی آبیاری کرتے رہنے کو تم نے محبت بنا دیا۔“ یہ محبت ہی تو تھی جسے مجھ پر اتنا غصہ آ رہا تھا۔ وہ محبت جو ہر انسان کے خیر میں اس کی فطرت میں ودیعت ہوئی ہوتی ہے جسے اللہ انسانوں کے اندر سو کر زمین پر بھیجتا ہے اور وہ محبت میرے اس رویے کو اپنی توہین سمجھ رہی تھی۔ واہ..... واہ..... تم اچھی ہو..... نصیر احمد سے جان چھڑانے کے لیے تم نے وجیہ سے راہ و رسم بڑھائی اور اُس گھر کی کھٹن سے چھٹکارا پانے کے لیے اس طرح کی شادی کی اور ان سب کو نام دے دیا محبت کا۔ خود غرضی محبت نہیں ہو سکتی یہ دونوں تو ایک دوسرے کی حریف ہیں۔“  
 ”لیکن اب تو مجھے وجیہ سے محبت ہے۔ سچ کچ کی محبت۔“ میں نے اپنے طور پر اپنا دفاع کرنا چاہا۔

”اوہ شٹ اپ پلیز۔“ میرے اندر سے وہی آواز مجھ پر چڑھ دوڑی۔  
 ”ابھی تو تم صرف وجیہ سے متاثر ہو رہی ہو۔ مجھے آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی تو میں پریشان ہو گئی۔“  
 ”متاثر.....؟“

”ہاں متاثر..... تم پہلے وجیہ کے حسن سے متاثر ہوئیں پھر اس کے انداز سے اس کے ذوق سے پھر اس کی دولت سے۔ وغیرہ وغیرہ۔“  
 ”ایسا نہیں ہے۔“ میں نے ڈھیلے سے انداز میں کہا۔  
 ”ایسا ہی ہے۔“ کوئی ماننے کو تیار نہ تھا۔  
 ”تو کیا یہ اس کی سزا کا عمل شروع ہو گیا ہے۔“ میں نے رات کو ہونے والے سلوک کو سوچتے ہوئے خوف سے پوچھا۔

”سزا اور جزا کا عمل..... اتنی جلدی شروع نہیں ہوتا۔“ کوئی مجھے سر سے پاؤں تک کھور رہا تھا۔ ”تم اتنی بے حوصلہ اتنی کم ہمت کیوں ہو۔ ذرا سا وقت برا ہوا نہیں اور تم اپنی قسمت کو دوش

دینے بیٹھ گئیں۔ ”میرا اندر مجھے سمجھا رہا تھا۔ بالکل ماما کے اعزاز میں۔ ماما بھی تو یہی کہتی تھیں کہ میں بے حد متلون مزاج اور بے صبری ہوں اور ایسی لڑکیاں تو اپنے بے ہوئے گھر بھی اکڑ خراب کر لیتی ہیں۔ میرا گھر تو ابھی بسا بھی نہ تھا۔

”میرا گھر.....“ میں نے اپنے کمرے کو غور سے دیکھا۔ جدید فیشن کے فرنیچر سے آراستہ نرم گداز قالین سے..... اور اس وقت تازہ گلابوں سے بھرا ہوا میرا کمرہ..... او نادان لڑکی..... جو تم دیکھ رہی ہو گھر ان چیزوں سے تعمیر تو پاسکتے ہیں مگر تعمیر نہیں۔ ادخوابوں کی مسافر تعبیروں سے نظریں ملانا سیکھو۔ تمہارا گھر تمہاری اور وجیہ کی وہی ہم آہنگی سے بنے گا۔ تمہاری محبت سے تعمیر پائے گا۔“ ہماری تو بہت انڈرا سٹینڈنگ ہے اور محبت | □□□□□..... تو مجھ پر جان دیتا ہے اور مجھے بھی اس سے محبت ہے۔ رینلی بلیوی۔“ میں نے خود کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی۔

”اچھا ٹھیک ہے“ اگر ایسا ہے تو سامنے آجائے گا اور سنو..... جب حقیقت کھلنے لگے تو رونے دھونے نہ گنا بلکہ اگر تم وجیہ سے محبت کی دعویدار ہو تو نفس کر اس کے سب اچھے برے سلوک برداشت کرنا اور اسے بدلنے کی کوشش کرنا۔ یہی تمہاری محبت کی ابتدا ہوگی۔“

میرے دل پر گڑی ہوئی وہ چٹکی ایک دم سے کھلی اور پھر سے کہیں اڑ گئی۔

”کہاں؟“ میں اپنے آپ کو ادھر ادھر سے ٹٹولنے لگی۔

”ڈنشین..... میری جان.....“ وجیہ نے مجھے نیند میں ہی پکارا اور بند آنکھوں سے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے اوپر جھکا لیا۔

”آئی لو یو..... مائی سویٹ ہارٹ..... آئی لو یو.....“ وہ بڑبڑاتا ہوا مجھے نیم باز نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے موڈ میں تھا۔

”وجیہ..... پلیز.....“ میرا دم اس کی سانسوں سے آتی ہوئی عجیب سی تیز بدبو میں گھٹ رہا تھا۔ یہ سگریٹ کی بو تو نہ تھی۔

”تو پھر.....؟“ میرے دماغ میں ڈھیر ساری چونٹیاں ریٹکنے لگیں۔

”وجیہ..... تم نے پی رکھی ہے۔“ میں نے اسے پرے کرتے ہوئے قدرے نفرت

سے پوچھا۔

”ہاں بھئی تمہاری محبت کا شمار ہی اتنا تھا کہ میں نے پی لی۔“ وہ اتنا ہی میرے قریب

ہور ہاتھ بٹنا میں اسے پرے کرنا چاہ رہی تھی۔

”بڑا سرور..... بڑا نشہ ہے تمہارے قرب میں۔ دیکھو نا، میں ساری مچھلیں چھوڑ کے آ گیا ہوں۔“ وہ اس وقت میرے قرب کا خواہاں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک درخواست تھی۔ وہ اس وقت ایک مرد تھا، صرف مرد جس کی پناہ گاہ ایک عورت کے وجود میں ہی ہوتی ہے، جہاں اسے سکون ملتا ہے اور اگر اس کی اپنی عورت اسے اپنا وجود پیار کے ریشم سے بن بن کے جاٹھاری سے بچھا بچھا کے پیش نہ کرے تو پھر وہ مرد اپنے گھر کا راستہ بھول جاتا ہے۔ اور گھر سے باہر بے شمار جمرو کے ایسے ہوتے ہیں جن میں ایسے ہی ریشمیں جال تنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک ٹھکے ہوئے بکھرے ہوئے بے چین اور بے قرار مرد کو ان لمحوں میں سکھ اور قرار کے ریشمیں بستر ہی درکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جمدوں میں ہوں یا باہر کے جمرو کے کے اندر۔“

میری ماما میری ساعتوں میں سرگوشی کر رہی تھیں اور میں اپنے پہلو میں بے قرار اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی جو آج گلابوں کے ڈھیر پر بھی بساندے بھرا ہوا تھا۔

”دلنشین ....“ اس کا تھکا ہوا چہرہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ تھا۔

”ڈیو لوی؟“ اس کے انداز میں خمار کے ساتھ ساتھ مصومیت بھی تھی۔ میرا جی تو چاہا کہ اپنی ناک کو چٹکی کے اندر دبا کے مسل دوں اور ابکا کی کرتی ہوئی ہاتھ روم میں گھس جاؤں۔

”آئی لو یو ریلی۔“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور میری اگلیاں اس کے الجھے بالوں میں نرمی سے پھرنے لگیں۔

”تم بہت اچھی ہو دلنشین..... بہت پیاری..... بہت خوبصورت.....“ وہ ایک چھوٹے سے بچے کی طرح اپنا چہرہ میرے ہاتھ تھا م کے ان پر گر کرنے لگا۔

”اور تم لاڈی..... تم بھی بہت اچھے ہو، بہت پیارے..... بہت خوبصورت.....“

”وجیہ کہو دلنشین! تمہارے ہونٹوں سے اچھا لگتا ہے۔“ اور میں نے اسے کئی بار پیار سے پکارا۔ ”وجیہ..... وجیہ..... وجیہ.....“ حالانکہ ہر بار ایسا کرنے پر میری آنکھوں کو کئی کئی آنکھوں کا خراج پیش کرنا پڑا۔



اگلی صبح میری زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی تھی، بہت سی حقیقتیں میرے سامنے کھل چکی

تھیں جو بے حد تلخ تھیں مگر وہ حقیقتیں تھیں جنہیں مانے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں انہیں تسلیم نہ بھی کرتی تب بھی وہ اٹل رہتیں اس لیے میرے پاس انہیں تسلیم کر لینے کے سوا کوئی اور راستہ بھی تو نہ تھا۔ ماما کے کمر سے نکلنے وقت میں نے ویسے ہی بہت بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں۔ وہاں کا تو میں نے خود پر کھانا تک حرام کر لیا تھا لیکن ماما مجھے بہت یاد آ رہی تھیں۔ کیسی ہچی اور کمری بات کہی تھی ماما نے کہ ”جا تو رہی ہو میں چھوڑ کے لیکن یاد رکھنا ابھی تمہارے قدموں سے والدین کے گھر کی مٹی بھی نہ چھوٹی ہوگی اور وہ تمہیں یاد آئے لگیں گے۔“ ماما مجھے یاد آ رہی تھیں اور پاپا بھی۔

رات جب وجیہ کا خمار گہری نیند میں بدل گیا اور وہ بے خبر بے سدھ ہو گیا تو میرے پہلو سے سارا چین اور آنکھوں سے پوری نیند غائب ہو گئی۔ جب دلنشین لاڈلی کو پرسکون اور مطمئن کر کے سلا چکی تھی عصمہ پورے حواسوں میں آگئی اور دلنشین کے گلے لگ کے خوب روئی۔ وہ رونا جو وہ اپنی ماں کے گلے لگ کر نہ بہا سکی تھی تب عصمہ نے اسے سمجھایا۔

”اب زندگی کے اس پورے بچ کو پورے دل سے قبول کر لو اور اسی طرح سے جیو جیسے وجیہ چاہتا ہے کیونکہ تم نے وجیہ سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ تمہاری ایک بات مان لے تو تم اس کی عمر بھر مانتی رہی گی۔ اب مانتی رہو عمر بھر.....“

میں اپنے ہی قول میں گرفتار ہو چکی تھی لہذا کیا کرتی؟

”ارے بھر جائی! تم جاگ گئیں۔ گڈ مارنک۔“ میں اپنے کمرے کی بیرونی کھڑکی کھولے کھڑکی تھی جب وہ جانے کہاں سے آٹپکا اور بڑی بے تکلفی سے میرے روبرو کھڑا ہو کر حال چال پوچھنے لگا۔

”آپ کو رات کوئی ڈر دور تو نہیں لگتا۔ نیند تو آگئی تھی۔ ساری رات جاگتی تو نہیں رہیں اور یہ کیا بھر جائی! آپ کی آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا روتی رہی تھیں؟“ وہ خود بخود بولتا جا رہا تھا اور بے درپے سوالات کر رہا تھا۔

”نہیں! ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو تم سوچ رہے ہو اور ویسے بھی وجیہ تو تم لوگوں کے جاتے ہی آگئے تھے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بالکل نارمل انداز میں اسے بتایا تو وہ غیر یقینی انداز میں ”پاجی رات کو محفل سے اٹھ کر آگئے تھے“ کہتا ہوا کھڑکی سے آنکھیں لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ جہاں وجیہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔

”واہ جی ماننا پڑے گا بنگال کا جادو ہی نہیں بلکہ وہ پیار کا جادو ہوتا ہے جو سر چڑھ کر بولتا



ہے۔“ وہ میری طرف شرارت سے دیکھتا ہوا بولا۔  
 ”مان لو تو اچھی بات ہے۔“ میں نے خود کو مکمل طور پر دلنیش کے وجود میں سموتے ہوئے کہا۔

”بھرجائی..... میں آتا ہوں! ابھی اندر۔ مل کر ناشتا کریں گے۔“ وہ ہنستا ہوا دوسری جانب چلا گیا جہاں سے یقیناً کوئی دروازہ اندر حویلی میں آتا ہوگا۔ تب ہی تو اگلے پندرہ منٹ کے بعد ہی وہ ہمارے کمرے میں موجود تھا۔ وجیہ کی کمر پر دو ہنٹ مار کے اسے جگا تا ہوا۔  
 ”لاڈی پاجی! اب اٹھ بھی جاؤ دیکھو میرا بھوک سے برا حال ہے۔“ وہ اپنے پیٹ پر بچوں کی طرح ہاتھ پھیرتا ہوا لاڈ سے کہہ رہا تھا۔

”سونے دو تا یار!“ وجیہ نے کسمسا کر کروٹ لی۔ مندی مندی آنکھوں سے لمحہ بھر کو اسے دیکھا اور پھر سو گیا۔

”لاڈی پاجی! اٹھو ناشتا کر لو پھر سو جانا۔ بھرجائی بھی انتظار کر رہی ہے۔“ وہ اس کی دوسری جانب جا کر اسے جگانے لگا۔

”افوہ..... کیا ہے یا! ناشتا ہی تو کرنا ہے۔ کرو تم اور تمہاری بھرجائی۔“

لاڈی نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”دیکھ لو پاجی! کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ بھلا کب باز آنے والا تھا۔

”یار! جو تیرا جی کرے سمجھ لے اور مجھے نہ ستا۔ میرا نشہ ابھی اترا نہیں ہے۔“

وجیہ نے ایک شرارت کی نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ مجھے تیمور کے سامنے یہ بات اچھی نہ لگی اور اس سے بھی گراں گزری مجھ پر تیمور کی اگلی بات جو اس نے اپنے بھائی کی آنکھوں کا شمار دیکھ کر کہی تھی۔

”اترے گا کیسے پاجی! ڈبل پیگ چڑھے ہیں۔ ولایتی بھی اور دیسی بھی۔“

”اف میرے اللہ..... یہ دو بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو تھی۔ وہ بھی ایک نئی

نوبلی دہن کے سامنے۔“ میں تو مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی۔ مجھے لگا وجیہ نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میری عزت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے۔ میری حیا کا پلو کسی نامحرم کے سامنے سرکا دیا ہے۔

”بختاں..... او بختاں.....“ وہ بختاں کو آوازیں دیتا ہوا باہر چلا گیا اور میں نے قنافت

اٹھادو پٹا اور بھی پھیلا کر اپنے اوپر اوڑھ لیا۔ میں اس کے سامنے کچی جو ہو گئی تھی۔

”وجیہ..... تم بھی اٹھ جاؤ پلیز۔ دیکھو میں تمہارے بغیر ناشتا نہیں کروں گی۔“

میں نے اسے پیار سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر ”کیا ہے کیا ہے“ پلیز سونے دو“ کرتا رہا پھر تکیہ مجھ پر مارتا ہوا اٹھ ہی بیٹھا۔

”بڑی ضدی ہو تم بھی بھلا میرے ساتھ ناشتا کر کے کیا ہو جائے گا۔“ وہ بسورتا ہوا ہاتھ روم جانے کے لیے اٹھا۔

”تمہارے بغیر ناشتا مجھے بالکل پیکا لگے گا اور تمہارے ساتھ کھانے سے مجھے اپنے لیے عزت اور تحفظ کا گہرا احساس محسوس ہوگا۔ میرا دل بڑھے گا۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سلیپر اس کے پیروں کے سامنے کر دیے۔

”او تھینک یو۔“ وہ خوش ہو کر بولا اور سلیپر پیروں میں گھسیٹتا ہوا ہاتھ روم کی طرف بڑھا۔

”اٹس مائی پلیز ری لارڈ۔“ میں نے ادب سے جھک کر اپنے سینے پر ہاتھ باندھے۔

”ی لارڈ! اچھا لگا..... اچھا ہے۔“ وہ میرے ی لارڈ کہنے کو انجوائے کرتا ہوا دہراتا ہوا

نہانے چلا گیا اور میں اس کے لیے وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس کی وارڈ روب بھری پڑی تھی۔ شلوار کرتے، قمیڑی پیس سوٹ، جینز، ٹی شرٹس..... سب طرح کے لباس تھے اور ہر ایک میں اس کی چوائس بڑی شاندار تھی۔ قیمتی کپڑا اچھے رنگ اور بہترین سلائی۔ اس کا ذوق بہت ہی اعلیٰ تھا۔ مجھے اس کے لباس اچھے لگے۔ بیگروں پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے میں نے ایک کرتا شلوار نکال لیا۔ آف وائٹ سلک کا شاندار کرتا اور لفٹے کی کلف دار سفید شلوار میرے پاپا بھی تو شام کو ایسا ہی لباس پہنا کرتے تھے مگر وہ سلک وغیرہ نہیں پہنتے تھے صرف کاشن یا داش اینڈ وئیر پسند کرتے تھے۔

”میرے پاپا..... میرے پیارے پاپا.....“ مجھے اپنے پاپا اچانک ہی یاد آ گئے۔ ان کا گھرے داڑھی والا شفیق سا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا، اس طرح سے کہ میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔



چلو بھر جانی! بڑی اماں کا حکم ہے کہ ناشتا سب اکٹھے ہی کریں گے۔ ویسے بھی آج گھر کے باقی لوگوں سے بھی تو آپ کا تعارف ہوتا ہے۔“ تیور پھر ایک ہی اطلاع لے کر آ گیا۔ اس کے ہاتھ مجھے تھامنے کے لیے آگے بڑھے تھے مگر اس لیے وجیہ نے ہاتھ روم کا دروازہ کھولا۔

”ارے پاجی بھی اٹھ گئے ہیں۔ بھر جائی! آپ کا جادو چڑھ رہا ہے پاجی پر۔ بولے گا..... بولے گا..... ایک دن سرچڑھ کے بولے گا۔“ وہ وجیہ کے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔

”تم چلو تمی! ہم آتے ہیں۔“ وجیہ نے جلد ہی اسے رخصت کر کے گویا مجھ پر احسان کیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کے ٹلنے کا شکرا ادا کیا اور وجیہ کو تیار ہونے میں مدد کرنے لگی۔

”میں تو تیار ہو جاؤں گا مگر تم نے اپنی صورت دیکھی ہے۔“ وجیہ نے مجھے کندھوں سے تمام کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”کیا ہوا میری صورت کو؟“ میں نے بھی اس کے کندھے تمام لیے۔

”دیکھو ذرا! کیا یہ پرسوں دالی صورت ہے؟“ اس نے مجھے آئینے کے سامنے کر دیا۔ واقعی میرا چہرہ لاکھ مسکراہٹ سے سجا ہوا تھا مگر فریش نہ تھا اور میری آنکھیں رات بھر رونے کی وجہ سے متورم تھیں۔

”سوری وجیہ! مجھے رات نیند نہیں آئی۔“ مجھ سے کوئی بہانہ نہ بن سکا تو میں نے اپنی نگاہیں اس کی نگاہوں سے چھڑا کر جھکا لیں۔

”صرف رات کے لیے معافی لیکن آئندہ کبھی ایسا نہ ہو۔“ اس نے میری آنکھوں کو ہولے سے پیار کے ساتھ چھوا۔

”کبھی نہیں ہو گا وجیہ.....“ میری جلتی ہوئی آنکھیں ایک ٹھنڈے بیٹھے لمس کو پا کر پھر سے ستارہ ہو گئیں۔

”اچھی بات ہے ورنہ مجھے ممکن آنکھیں اچھی نہیں لگتیں جن کے کنارے کیلے اور متورم رہتے ہوں۔ عورت وہی دل لبھاتی ہے جس کی آنکھیں اور ہونٹ ایک ساتھ مسکراتے ہوں۔“ اس نے میرے گالوں پر ایک ہلکی سی شرارت بھری چٹکی لی اور پھر مجھے کہا۔

”چلو اب ٹافٹ تیار ہو جاؤ، بس اتنی دیر میں جتنی دیر میں اخبار کی شدہ سرخیاں دیکھتا ہوں۔“



وہ ناشتے کی میز چمی یا بحری جہاز کا ڈائننگ ٹیبل، ایک لمبی سی میز کے گرد کرسیاں ہی کرسیاں تھیں۔ تقریباً چوبیس کرسیاں تو ہوں گی۔ وجیہ کی دونوں ماؤں اور بہن بھائیوں کے علاوہ

آج اس کے دونوں ماموں بھی ناشتے پر موجود تھے جو میرے نکاح کے گواہان تھے۔ شہاب الدین، وجیہ کے بڑے ماموں اور نادرہ بیگم ان کی بیگم..... ان دونوں کے ساتھ ایک بے حد غریبی سی لڑکی بیٹی تھی جس کا نام صنوبی نے افشاں بتایا تھا اور افشاں کا ایک بھائی بھی تھا، مراد پیرزادہ جو کہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کی ڈگری لینے گیا ہوا تھا اور جس کے بارے میں وجیہ نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ زویا کا منگیترا ہے، مراد کا نام سن کر زویا نے ایک ادا سے کرسی پر پہلو بدلا تھا جس میں غوت اور تکبر صاف جھلک رہا تھا۔

”اور یہ افشاں چھوٹے پاجامی کی منگیترا ہے۔“ صنوبی نے پہلے افشاں اور پھر تیمور کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ البتہ وجیہ کے چچا اور چھوٹے ماموں نواب الدین کی فیملی میں سے کوئی موجود نہ تھا۔

وجیہ کے دو ماموں تھے جبکہ ایک چچا اور دو پھوپھیاں بھی تھیں مگر اس کے دو خیال والے ان سے خفا تھے، اس لیے وجیہ کی شادی پر نہ آئے تھے جس پر وجیہ کی دونوں مائیں خوش تھیں کہ چلو اچھا ہے ان کا آنا جانا چھٹا۔

وجیہ کے والد بھی کہیں نہیں تھے حالانکہ حیات تھے۔ ان کا ذکر بھی کسی نے نہیں کیا تھا، نہ ہی کبھی وجیہ نے ان کے بارے میں کوئی بات کی تھی، نہ کبھی یونیورسٹی کے دنوں میں ہی ان دنوں میں لیکن کیوں؟ یہ بات میرے دل میں ایک ایسا سوال بن کے پچھلے تین چار دنوں سے چل رہی تھی جس کا جواب میں کسی نہ کسی کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

میں خود کسی سے پوچھ نہ سکتی تھی اور مجھے کوئی اور بتا بھی نہ رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور اپنے بیٹے کی شادی میں کیوں شریک نہیں ہوئے۔ آج زینت بیگم اور فخر النساء کا موڈ بہت اچھا تھا۔ فخر النساء اب رات والی فخر النساء نہ لگ رہی تھیں جس پر میرے جی کو کافی تسلی ہوئی۔ اب تو وہ بڑے پیار سے مجھے پوچھ رہی تھیں۔

”ڈنٹیش بیٹی! یہ آلیٹ تو کھاؤ۔ دے نی شوا آگے ہو کے وھڈی نوں کو یہ پلیٹ.....“

”جی بس شکریہ۔“ میں جو پہلے ہی آلیٹ لے چکی تھی نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

”نہ تم تو کچھ کھاتی ہی نہیں ہو۔ ایک تو تم آج کل کی لڑکیاں..... یہ ڈانٹنگ کے چکر میں

بہت رہتی ہو۔“ انہوں نے مجھے محبت جتانے والے انداز میں سرزنش کی۔

”جی میں ڈانٹنگ نہیں کرتی۔“ میں نے سچ کہا کیونکہ میں واقعی ڈانٹنگ نہیں کرتی تھی۔

”کیا مطلب؟ آپ نے اتنا فٹ لگر کیسے رکھا ہوا ہے پھر.....“ افشاں نے پہلی بار مجھ سے بات کی وہ بھی بڑی فضول اور مکمل سی جس کا جواب میں پورے خاندان کے سامنے کیا دیتی۔

”بتاؤ نا بھر جانی! آپ اتنی اسماٹ کیسے ہو پھر۔“ زویا کو بھی میری اسماٹس کا رازاز جانے کا شوق ہوا۔

”مناسب کھانا اور کام کاج کرتے رہنا۔“ میں نے عام سے انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ہائے اللہ کیا آپ کے گھر میں ملازم نہیں تھے؟ آپ خود کام کاج کرتی تھیں۔“ افشاں پھر بڑے بھونڈے انداز میں بولی۔

”ملازم تو تھے لیکن میری ماما کہتی تھیں، لڑکیوں کو گھر کے کام کاج ضرور کرنے چاہئیں۔ میں تو ایک وقت کے لیے لان میں بھی گھاس کاٹنے والی مشین تک چلا لیا کرتی تھی۔“ میں یونہی اس سے باتیں کرنے لگی۔

”وہ تمہارے گھر کا چھوٹا سالان ہوگا مگر یہاں یہ شوق پورا کرنے کی کوشش نہ کرنا، یہاں تو ایک ایک کنال کے لان ہیں اور پھر ہماری عورتیں زناں خانوں سے باہر بے پردہ نہیں جاتیں۔“

زینت بیگم نے ذرا سمجھانے والے انداز میں کہا تو نرمی سے ہی تھا مگر کھادل دکھانے کے لیے ہی تھا۔ کس قدر تکبر ہے ان لوگوں کے اندر اپنے بڑے پن اور دولت زمین کا۔ میں نے انہیں ”جی اچھا“ کہتے ہوئے دل میں سوچا۔

”محمّد و اماں جان..... ایس ویلے کوئی چٹکیاں گلاں کرو.....“ تیمور نے پھر سے میری حمایت کی اور سب کے سامنے کی جس پر زینت بیگم کا منہ ٹھیک ویسا ہی میلا پڑ گیا جیسا رات فخر النساء کا پڑا تھا۔

”اچھا تے فیر تو دس..... پیاردی کی گل اے تیرے کول.....“ وہ جلد ہی خود کو تارمل کرتے ہوئے بولیں۔

”پیاردی گل تے پیار کرن والے جان..... کیوں پاجی تے بھر جانی جی.....“

تیمور نے پھر کٹلے الفاظ میں میرا نشانہ لے لیا۔ حالانکہ میں محسوس کر رہی تھی کہ ایسا وہ تانا بانہ اور سادہ دلی سے کرتا تھا یعنی اس کی تو عادت ہی ایسی تھی مگر مجھے ایسی باتیں اور ایسے انداز بھلا کب بھاتے تھے۔ لہذا میں سر جھکا کر چائے پینے لگی۔

”مجھی صاحب! بات یہ ہے کہ ہم آج مری کے لیے نکل رہے ہیں۔“ وجیہ جو بالکل چپ چاپ ناشتا کرنے میں مصروف تھا، ہنس کر بولا۔

”اچھا کتنے دنوں کے لیے؟“ زینت بیگم نے ذرا فکر مندی سے پوچھا۔

”دیکھو اماں! کتنے دن میرا جی لگتا ہے وہاں۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”لاڈی! تو جانتا ہے نا اس مہینے کی بیس تاریخ کو پیشی ہے۔“ وہ وجیہ کو کچھ یاد کروا رہی تھیں۔

”مجھے یاد نہیں تھا، نہ ہی میں یاد کرنا چاہتا ہوں۔“ وجیہ نے ناشتے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا جس کا مطلب تھا اسے یہ بات اور یہ ذکر اس وقت اچھا نہ لگتا تھا۔

”تے نا سمجھی پتر..... تو فکر کرتا ہے۔ یہ ہے تا حیرا چھوٹا بھرا..... یہ چلا جائے گا پیشی پر۔“ فخر النساء نے وجیہ کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر معاملے کو سنبھالنے والے طریقے سے کہا۔

”ناممائی..... میں کیوں جاؤں، بخشو مجھے بھی..... میرا کیا لینا دینا ان پیشیوں سے۔“ وہ بھی جانے کیوں بدک گیا۔

”اونے کسی دونوں نہ جاؤ، میں خود جاؤں گا کچھری۔“

وجیہ کے بڑے ماموں شہاب الدین نے مسکرا کر اپنی خدمات پیش کیں اور اس وقت اس معاملے کو رفع دفع کر دیا جس پر دونوں بھائیوں کے منہ پھول گئے تھے۔

”اماں تو بھی نا..... اچھا بھلا ماحول خراب کر دیتی ہے۔“ وجیہ بالکل اس انداز میں کھانے کی میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور جا کر ذرا دور بچھے صوفوں پر بیٹھ گیا جیسے رات تیار کرنے کی ضرورت تھی۔

قدر ممانت تھی دونوں بھائیوں میں۔ شکلیں بھی اتنی مشابہ کہ پہلی نظر میں کوئی دیکھے تو جڑواں سمجھے۔ ایک سی چال ڈھال، ایک سالبجہ، ایک سی ادائیں، لباس، پسند نا پسند اور عادات۔ اف..... دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ایک دوسرے کی کاپی کرتے ہیں۔ کم از کم مجھے تو یہی لگنے لگا تھا۔

”ہاں بھئی، ٹھیک ہے۔ اب تم دونوں کے موڈ خراب کرتی ہوں میں۔“ زینت بیگم نے پھولے منہ کے ساتھ اپنی کرسی چھوڑ دی اور وہیں جا بیٹھیں اور پھر آہستہ آہستہ سب ہی وہاں جا بیٹھے۔ یہاں تک کہ میں بھی۔ اچھے خاصے خوشگوار ماحول پر ایک دم سے جس طاری ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ پوچھوں کس کی پیشی ہے جو دونوں بھائی اتنا کھرا رہے ہیں اور کیوں؟

”بس آپنی! اب تم تو رونا بند کرو۔ بچے ہیں سمجھ جائیں گے۔“ میں نے دیکھا فخر النساء

بڑی محبت سے ذمیت بیگم کی دلجوئی کرنے لگی تھیں۔

یہاں اور بہت کچھ عجیب اور پراسرار تھا، وہیں پر یہ بات بھی بڑی عجیب سی تھی کہ ذمیت بیگم اور فخر النساء آپ میں خالد زاذبہنیش بھی تھیں اور سوتیں بھی۔ دونوں کے بیچ میں اب تک جو میں نے دیکھا وہ تو محبت ہی تھی۔ اب ان کے دلوں میں کچھ اور بھی تھا، اس کی خبر انہیں ہوئی گی لیکن بظاہر دونوں ایک دوسرے پر اور ایک دوسرے کی اولاد پر جان چمڑکتی تھیں۔ یہی حال ان سوتیلے بچوں کا بھی تھا جن میں سکوں سے کہیں زیادہ محبت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سب بھائی بہنوں میں بڑا تھا، اس لیے اس گھر پر اسی کی چلتی تھی اور سب اس کی عزت کرتے تھے۔ تیور کی اپنے بھائی میں جان تھی اور یہ سب ایک خاندان کی مضبوطی کے ستون تھے۔ ان کے بیچ روایتی زمینداروں والے حسد اور دشمنیاں نہ تھیں۔ یہ بھی کچھ عجیب سی بات تھی۔ اگرچہ بہت اچھی تھی یہ سب آپس میں باتیں کرتے تھے اور میں خاموشی سے ان کے جائزے لیا کرتی تھی۔

”دیکھو نا پاجی! ان بچوں کو کیسے ہر پٹشی پر مجھے کورا سا جواب دے دیتے ہیں۔“ ذمیت بیگم اب بھی شہاب الدین سے اسی پیشی والی بات پر گلہ کر رہی تھیں۔ میری توجہ پھر سے ان کی طرف ہو گئی۔

”تو تو بھی رہنے دیا کر..... انہیں ضرور بتاتی ہوتی ہیں تو نے یہ باتیں جن سے یہ جڑتے ہیں۔“ شہاب الدین نے نرم لہجے میں بہن کو ڈانٹا۔  
 ”کیوں نہ بتاؤں، انہیں احساس تو کرنا چاہیے، ان کے لہو تو سفید ہو گئے ہیں، میرا دل تو تڑپتا ہے نا ان کے لیے۔“

وہ اب بھی باقاعدہ آنسو بہا رہی تھیں اور وجہ اور تیور کو شکایتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔  
 ”اپنے دل کو سمجھا لو اماں کہ وہ اس شخص کے لیے تڑپنا چھوڑ دے۔“ وجہ پھر غصے سے

بولی۔

”کیسے سمجھا دوں، وہ کوئی غیر تھوڑی ہے، تمہارا باپ ہے آخر، میرا سہاگ ہے۔“ وہ قدرے بلند آواز سے بولیں۔

”نہیں ہے وہ ہمارا باپ، وہ ایک قاتل ہے، صرف قاتل.....“

وجہ غصے سے کاغتا ہوا اٹھا اور پھر پختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”قا..... ت..... ل..... قاتل..... وجہ کا باپ ایک قاتل ہے؟“

میرے چاروں طرف اس دلخراش خبر کی بازگشت گونجنے لگی۔

دجیہ کے والد قاتل تھے اور ”غیرت کیس“ میں ان پر مقدمہ چل رہا تھا۔ مجھے اتنی بات تو معلوم ہو چکی تھی، لیکن انہوں نے کس کا قتل کیا تھا اور کیوں؟ یہ تفصیل ابھی باقی تھی۔ اور میری تجسس سے گہرائی طبیعت میں جانے کیوں اک کھد بد بچ گئی تھی کہ کسی طرح سے مجھے وہ سب معلوم ہو جائے جس کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔

بہر حال میں نے بھی اپنے تجسس کو سوال بن کر اپنے ہونٹوں پر آنے نہ دیا۔ دجیہ سے تو خیر پوچھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ان کا ری ایکشن میں اس موضوع پر دیکھ چکی تھی۔ میری یہ مشکل بھی اگلے روز اس وقت حل ہو گئی جب بھتاں کی چھوٹی بہن شموں میرے حصے میں آئی یعنی وہ میری پرسنل مائی کے طور پر ہر وقت صرف میرے کاموں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ میری پیکنگ کروانے آئی تھی ہم اگلی صبح مری کے لیے نکل رہے تھے۔ دجیہ کو مری اور اس کے گرد و نواح بے حد پسند تھے۔ جبکہ مجھے مری سے زیادہ سوات وغیرہ کی طرف جانا پسند تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے مری تو لاتعداد بار دیکھا بلکہ نارائن کا غان تک گئی تھی مگر سوات کی طرف میں بچپن میں ہی ایک دو بار گئی ہوں گی اس لیے مجھے وہ دھندلا دھندلا دیا تھا۔ جی میں کئی بار آچکا تھا کہ دجیہ سے کہوں..... ہم سوات چلیں..... مگر نہ کہہ سکی۔

شموں بڑی ہی پرکشش اور جوان لڑکی تھی۔ سانولا سلو نارنگ اس پر بھوری بھوری آنکھیں اور قدرے پھیلی سی ناک کے تلے بھرے بھرے ہونٹ..... لمبا قد اور اس پر اس کا اتنا مکمل اور صحت مند جسم جو آج کل کی ماڈرن لڑکیوں کو لمبی ڈانٹنگ اور مشکل اور پر مشقت ایکسرسائز کرنے کے بعد بھی کم ہی نصیب ہوتا ہوگا۔ سچ بات ہے اسے نظر بھر کے دیکھنے والے کا ایمان خواہ مخواہ ہی ڈولنے لگتا تھا۔ میں اسے چوری چوری نظروں سے دیکھتی ہوئی یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ میں خود کو ایک حسین لڑکی سمجھتی ہوں پھر بھی اسے دیکھ کر مجھے کرٹ سا لگا تھا۔ تو جوان مردوں کے دماغ تو خود ہی



خراب ہو جاتے ہوں گے۔ مجھے پہلی نظر میں وہ اچھی لگی پھر بہت اچھی اور کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ مجھے خطرناک لگنے لگی جس سے میرے اندر کی حاسد عورت کو خوف آنے لگا تھا۔ اور عجیب قسم کی باتیں میرے دماغ میں خارش کرنے لگی تھیں۔ جنہیں بار بار سر جھٹک کے نظر انداز کر رہی تھی۔

”دلنشین بی بی! یہ آپ کے سارے کپڑے تو میں نے استری کر دیے ہیں اب بتائیں لاڈی سائیں کے کون کون سے کپڑے نکالوں۔“ اس نے میرے استری شدہ کپڑوں کو بڑے سلیقے سے نہ لگا کر لٹچی میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... وجہ کے کپڑے۔“ میں نے اپنے ناخنوں پر سے نیل پالش کو ریموور سے صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”شموں! ادھر آؤ میرے پاس۔“ میں نے اسے اپنے پاس بلایا جس پر وہ اگلے لمبے میرے سامنے قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکی تھی اور میری جانب مسکراتی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ تو جانو اس کے ہونٹوں سے ہر وقت چمکی رہتی تھی۔ بلاوجہ بھی اس کے ہونٹوں کے کونے کھلے ہی رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی اپنی طرف کھینچتی تھی۔

”کہیں ناں دلنشین بی بی کیا بات ہے؟“ مجھے اپنی طرف خاموش دیکھتا پا کر وہ پوچھنے لگی۔  
”یہ پہلے تو اپنے لب سیکڑ اور سنجیدہ ہو کر بیٹھ۔“

میں نے اس کی مسکراہٹ سے گھبرا کے کہا۔ جس پر وہ کھسیانی سی ہو گئی اور اپنے دوپٹے کا پلو اٹھا کر اپنے ہونٹ اس سے ڈھانک لیے جیسے وہ مسکراہٹ اس کے بھی بس میں نہ ہو۔

”تیری عمر کیا ہے؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”مجھے کیا پتا بی بی جی..... اماں کو معلوم ہو گا یا پھر بچاں کو۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی اور میں حیران ہو کے اس کے بے پروا سراپے کو دیکھتی رہ گئی جسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ عمر کے کتنے برس اس کی پرورش کر چکے ہیں۔

”اچھا تو کب سے یہاں ہے؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔

”کیا خبر..... بس جب سے آنکھوں کو دیکھنا یاد ہے تب سے یہیں پر ہوں۔“ اس نے بڑے ہی خوبصورت جملے میں جواب دیا۔ حالانکہ اس نے یہ تو اپنے بھولپن سے ہی کہا تھا لیکن ایک بڑا خوبصورت اور گہرا جملہ خود بخود تخلیق ہو گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اس کا سراپا۔ جس پر اس کی اپنی توجہ یا محبت صرف نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ تراشا ہوا تھا۔

”اچھا پھر تو تمہیں یہاں کے سب لوگوں کے بارے میں معلوم ہوگا۔“ میں اصل بات کی طرف آ رہی تھی۔

”آپ نے کس کے بارے میں پوچھا ہے پوچھیں۔“ وہ اپنے ہونٹوں پر سے دوپٹے کو ہٹاتے ہوئے میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ یعنی وہ اتنی بھی سادہ اور بھولی نہ تھی جتنی میں اسے سمجھ رہی تھی۔ مطلب مجھے اس کا اعتماد حاصل کرنے میں بھی احتیاط سے کام لینا ہوگا کیا خبر یہ میری باتیں باہر جا کر کسی اور کو بتا دے۔

”ڈلشیش بی بی! مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میں غلامی کے آداب سے واقف ہوں۔“ وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ اور مجھے اس لڑکی پر کئی پردوں کا گمان گزرا جنہیں اب وہ اپنے آپ پر سے ایک ایک کر کے اٹھا رہی تھی۔ اس کے انداز ہی نہیں زبان بھی لوج رکھتی تھی۔

”کیا تم تعلیم یافتہ ہو؟“ میں نے اسے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”مجھے بہت شوق تھا کہ میں اسکول کالج جاتی مگر ہم تو پیدا اُنکی کی کمین ہیں ہمارے نصیبوں میں یہ سب کہاں۔ بس آپ جیسی بیگموں اور بی بیسیوں کی صحبت سے ہی سکھ گئی ہوں۔“ اس نے پھر بڑا مہذبانہ جواب دیا۔

”آپ پوچھیں ناکس کے بارے میں پوچھا ہے؟“ وہ مجھے چپ پا کر پھر سے بولی۔  
 ”وہ شموں! تمہیں تو پتا ہے میں بھی یہاں نئی ہوں اور مجھے کیا خبر کہ تم کتنی قابل اعتبار ہو۔“ میں نے بات کو ادھر ادھر گھمانے کے بجائے سیدھا سیدھا کہہ دیا۔

”کہا نا شموں اب آپ کی غلام ہے تو وفادار بھی آپ ہی کی ہوگی۔ بے دھڑک بات کریں۔“ وہ مجھے اپنے بارے میں اعتبار دلانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔  
 ”ویسے بھی آپ لاڈلی سائیں کی بیگم ہیں تو میری گردن تو پہلے سے ہی اس طوق میں ہے۔“ وہ ذرا ہنس کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ مجھے اس کا ہنسا اچھا نہ لگا۔

”بی بی جی مطلب نہ پوچھا کریں۔ ان غلام گردشوں میں مطلب کی باتیں کرنے والے زیادہ عرصہ سکھ نہیں پاتے۔“ وہ پھر فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئی۔ تب مجھے وہ ایک اجڑا دیہاتن کے بجائے ایک اچھا خاصا معمرہ لگنے لگی۔ اس کے معصوم پرکشش سراپے کے اندر ایک گھنی اور منجمی ہوئی

ادا کارہ دکھائی دینے لگی۔ تب میں نے اس سے بے تکلف ہونے کی بجائے ضروری سمجھا کہ اس پر اپنا کچھ رعب بٹھاؤں۔

”اچھا چلو چھوڑو بے کار کی باتوں کو۔ اٹھو اور میرے ساتھ تیاری کراؤ چل کر۔“ میں خود بھی اٹھ گئی اور اپنی چیزیں دیکھنے لگی۔ وہ بھی خاموشی سے اٹھی اور میرے ساتھ مدد کرنے لگی۔ میں نے محسوس کیا وہ واقعی غلام تھی۔ آنکھ کے اشارے کو سمجھ کر بجا آوری کرنے والی۔



”ارے بھر جائی! یہ کیا ابھی تو تم آئی ہو اور ابھی سے جانے کی تیاری کر لی۔“ میں نے پینکنگ سے فارغ ہو کر سر میں تیل لگا رہی تھی جب تمہی آگیا اور آتے ہی میرے سامنے بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ وہ دو ہی روز میں مجھے آپ سے ”تم“ کہہ کر بات کرنے لگا تھا۔

”وجہ نے پروگرام بنایا ہے۔“ میں مختصر آکھا۔

”لاڈی بھائی! وہ بھی مانو کوئی سیاح ہی ہیں ان کا راک سیک تو جب دیکھو بندھا ہی رہتا ہے اور اب تو وہ مہینہ بھر نہ پلٹیں گے۔“ وہ سینٹرل ٹیبل پر پڑے ہوئے فروٹ میں سے ایک سرخ سیب اٹھا کر دانتوں سے کھترتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”ویسے یہ مری میں کیا رکھا ہے۔ جانے بھائی کو مری میں کیا نظر آتا ہے حالانکہ یہ اتنا سا مری ہے۔ مال روڈ سے چڑھو تو کشمیر پوائنٹ اور دوسری طرف سے اترو تو پھر مال روڈ کا وہی جنرل پوسٹ آفس اور اس کی گود میں پھیلا ہوا چھوٹا سا بازار۔“ وہ اپنے طور پر مری کا ناک نقشہ بتا رہا تھا لیکن ٹھیک میرے خیالات کے مطابق بتا رہا تھا اس لیے مجھے برانہ لگا۔

”تو اور کیا مجھے تو خود ہاں جانے کا کچھ ایسا شوق نہیں؟“ بے ساختہ ہی میں نے کہہ دیا۔

”اچھا پھر تو تم میری ہم خیال ہو۔“ وہ خوش ہو کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور مجھ سے سیاحت اور سیر کے موضوع پر باتیں کرنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسے تو مستنصر حسین تارڑ کے سبھی سفرنامے از بر تھے۔ کیونکہ وہ ٹھیک وہی کچھ بول رہا تھا جو ان کے سفرناموں میں تحریر تھا۔ مستنصر حسین تارڑ میرے پسندیدہ سفرنامہ نگار تھے اس لیے مجھے اس کے ساتھ ڈسکس کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کیلاش کا ذکر آگیا جس پر وہ ایک دم غصے میں آگیا۔

”دفع کرو جی۔ وہ بھی کوئی جگہ ہے۔ جادو گر نیوں کی وادی ہے۔“ وہ اپنے اجڈ انداز

میں آ رہا تھا۔

”وہیں سے تولائے تھے ہمارے ابا بھی ایک تھخہ۔ جس کی بدولت آج جیل میں پڑے ہیں۔“ وہ اپنی رو میں کہہ گیا اور پھر کچھ خیال آنے پر شوش کی طرف دیکھ کر غرائے میں انداز میں بولا۔

”چل نی تو تو یہاں سے دفع ہو..... جب ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوں تو تم کیوں نہیں وہاں سے دفع ہوتیں چڑھ کے سروں پر کیوں بیٹھی رہتی ہو چل اٹھ۔ نکل یہاں سے۔ جا کر چائنا کے لا۔“ وہ اس کی بے دریغ بے عزتی کرتا ہوا بولا۔ اور وہ بے چاری منمناتی ہوئی فوراً ہی چلی گئی۔

”تمہی سائیں بھول ہو گئی۔ معافی دیدو۔ ابھی لاتی ہوں چا۔“ وہ گئی تو تمہی نے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”ان کی کینوں کو زیادہ منہ نہ لگانا بھر جائی ورنہ یہ حرا مزادیاں کب تمہاری برابری میں آ جائیں تمہیں پتا بھی نہ لگے گا۔“ وہ مجھے شوش کے بارے میں خبردار کرتا ہوا خود ہی تسلی دینے لگا۔

”وہی تو ایسی کی تھی ان کی۔ ان کے نکلے ہوئے سر اور کھلی ہوئی زبانون پر رسہ مارنا آتا ہے ہمیں بھی۔ جیسے وہ ایک آئی تھی۔ صاحبہ بننے کو پہنچ گئی نا اگلے گھر۔“ وہ اک ٹمطراق سے بولتا ہوا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا تھا۔ میں گھبرا گئی اور بہانے سے وہاں سے اٹھنے لگی۔

”اچھا تیور بھائی! میں ذرا دیکھوں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی رکھے والی۔“

”چھوڑو نا اتنی فکر کس لیے۔ بازار بھرے پڑے ہوتی ہیں چیزوں سے وہ چیزیں آخر خریدنے کے لیے تو ہوتی ہیں۔ کچھ رہ گیا تو بھاجی لے دیں گے۔“ اس نے کمال بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے زبردستی بٹھا دیا۔

”ارے وہ آپ کیا بتا رہے تھے کیلاش کی جادوگریوں والا قصہ؟“ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کو کہا۔

”وہ قصہ تو ہم نے کب کا پاک کر دیا تھا۔ تھا ایک واقعہ جو یہاں حویلی میں ایک پرانی کہانی کی طرح چھڑا تھا۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”کیا مطلب..... پرانی کہانی..... قصہ..... واقعہ؟“ میں نے سنجیدگی اختیار کی کہ مجھے تو اس قصے کی کھد بدکل ہی سے تھی۔

”گلتا ہے تم ضرور سنو گی، سنو، سنو۔ آخر تمہیں بھی تو اس حویلی کے قوانین معلوم ہونے چاہئیں۔ تم بھی تو باہر کی ہو۔“ وہ اپنے بے تحاشہ بولنے کی وجہ سے پھر سے ایک جملہ مجھ پر طنز کا بول گیا بھلے وہ نادانستہ تھا یا بے ساختہ۔

”باہر کی۔“ میرے لبوں سے اپنے ہی لیے ایک اجنبیت کا خطاب نکلا۔

”میرا مطلب تھا۔ تم بھی تو غیر ذات کی ہو اس لیے۔ ورنہ تم تو بھابی کے نکاح میں ہو تو گھر والی ہی ہوتی نا؟“ وہ پھر میرا دل دکھائی گیا مجھے جتنا گیا کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔

”یہ لوگ ذات برادر یوں، اونچ نیچ اور تکبر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگ ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہم جیسے سادہ لوح اور منکسر المزاج لوگوں کا بھلا کیا جوڑ ہے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں بھاگ سکتے عصر۔ اتم بھی اس بات کی حقیقت کو سمجھو ورنہ عمر بھر تم اپنے اور پرانے کے پائوں میں پستی رہو گی۔“

اس وقت مجھے اپنی ماما کی وہ بات یاد آگئی جو انہوں نے مجھے سمجھائی تھی تاکہ میں وجیہ کا خیال اپنے دل سے نکال دوں۔ اس وقت مجھے ماما کی بات سے سچ کی بجائے ان کے اپنے مطلب کی پو آئی تھی۔ اور اس وقت وہی پو تیور کے منہ سے ماما کے سچ کے ساتھ آ رہی تھی۔ میں ان کی اپنی نہ تھی ان کے لیے پرانی اور غیر ذات ہی تھی اس کا احساس ان چار پانچ روز میں ہی قدم قدم پر مجھے دلایا جا رہا تھا۔

”ہمارے ابا کو بھی لاڈی بھابی کی طرح سیر سپاٹوں کا بہت شوق تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا۔“ وہ اپنی دھن میں بولتا جا رہا تھا۔ اور میں اپنے پریشان دل کو تھامے اسے دیکھ رہی تھی جو وجیہ کے بارے میں شکوک میں گھرنے لگا تھا۔ میرا دل تو یہ بھی چاہ رہا تھا کہ میں تیور سے کہوں کہ وہ اپنی پوری بات کی وضاحت کرے۔ لیکن میرے ہونٹ تو پھر بنے اک دو بجے پر دھرے تھے۔

”ہاں تو بھر جائی! میں آپ کو بتاؤں ابا جب کیلاش سے اسے اپنے ساتھ لائے تو ہمارے گھر میں تو کھرام مچ گیا۔ ایک تو وہ تھی اتنی حسین کہ اس کے سامنے میری بڑی اور چھوٹی اماں معمولی لگنے لگیں۔ اور پھر ابا کا اسے الگ گھر لے کر دینا، اس پر عنایتیں کرنا، بھلا کیسے برداشت ہوتا۔

ہو گئے ہمارے مامے اکٹھے اور ابا کو اسے کسی دوسری جگہ رکھنا پڑا۔ لیکن ان کی محبتیں پھر

بھی اسی پر نچھاور رہیں۔ کرتے کیا وہ جادوگرنی سے دل جو لگا بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے تو ابابہم سب سے دور ہو گئے تھے۔ ہم نے وہ بھی برداشت کیا۔ بہت سہا ہم نے۔ بہت۔“ وہ بتاتے بتاتے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی تھیلی پر اپنے کئے مارنے لگا۔ اس کا چہرہ حسد کی آگ سے اس وقت بھی تپ رہا تھا۔

”تیور چائے آگئی ہے۔ آؤ چائے پی لو۔“ میں نے اسے کول کرنے کے لیے اس کی توجہ ہٹانے کو کہا۔

وہ میری طرف پلٹا تو شموں بجلی کی تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ وہ چائے دینے آئی تھی میں چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے خاموشی سے میرے ہاتھ سے لے لیا اور چائے پینے لگا۔ وہ ذرا دیر کو چپ ہوا تو مجھے لگا میں صدیوں کے انتظار کی صلیب پر لٹک چکی ہوں۔ میں وہ ساری کہانی ایک نشست میں سننے کی خواہاں تھی مگر اس میں دلچسپی ظاہر نہ کر رہی تھی۔ حالانکہ میرا دل مسلسل کہہ رہا تھا۔

”پھر؟ پھر کیا ہوا؟ پھر کیا ہوا؟“ میں تو یہ جاننے کو بے تاب تھی تو پھر اسے خود ہی قتل کیوں کر دیا۔

”ہمارے ابا! اس غبیث عورت کے پیار میں اندھے ہو چکے تھے اور یہ بھول چکے تھے کہ یہ باہر کی عورتیں کبھی وفادار نہیں ہوتیں۔ وہ بھی ایسی ہی حیباختہ لکلی اور ابابہی کے ہاتھوں اپنے برے انجام کو پہنچی۔“ اس نے جتنی تیزی سے گرم گرم چائے ختم کی اتنی ہی تیزی سے وہ کہانی بھی ختم کر دی۔

”اچھا بھر جائی میں چلتا ہوں۔ میں تو تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ آج رات میں بھی اسلام آباد جا رہا ہوں۔“ وہ خالی کپ میز پر رکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اسلام آباد کیوں خیریت تو ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔  
”ہاں وہ میں یو کے جانے کے لیے کاغذ جمع کروانے جا رہا ہوں۔“ اس نے یو کے کا نام لیتے ہوئے ذرا گردن اکڑا کر کہا اور باہر چلا گیا۔

وہ تو چلا گیا لیکن میرے ذہن میں کئی کانٹے بو گیا۔ میرا اچھا خاصا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ میں سارا کام چھوڑ چھاڑ کے بیٹھ گئی۔

”لائیں بی بی! میں آپ کے کندھے دبا دیتی ہوں۔“ مجھے پریشان بیٹھا دیکھ کر شہوں نے پیار سے کہا وہ چائے کے برتن اٹھانے آئی تھی۔ میں نے اسے اس وقت ایسا کرنے سے منع بھی نہ کیا تبھی وہ میرے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی اور میرے کندھے دبانے لگی۔

”ڈنٹیشن بی بی! آپ خواہ مخواہ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ دفع کریں جی یہاں تو ہاتھ نہیں کیا کیا قے نکھرے پڑے ہیں۔“ وہ کندھے دباتی باتیں کرنے لگی۔

”مجھے یہاں کے قے کہانوں سے کچھ غرض نہیں۔“ میں نے اسے جھاڑنے والے انداز میں سختی سے کہا اور اٹھ کر نہانے چل دی۔ ویسے بھی میں ان باتوں کی عادی نہ تھی نہ ہی میرے گھر میں ایسا کچھ ہوتا تھا کہ گھر کی ملازماؤں کو پھروں کے مساج کرنے اور دیوانے پر مامور رکھا جاتا۔

”میرا گھر؟ سی۔ی۔ی۔“ ایک پھانس میرے کلیجے میں چبھ گئی۔ اور مجھے اپنی ماما اور نوراں ماما دونوں ہی بیک وقت یاد آنے لگیں۔ ہاتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔

شہوں اب تم جاؤ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ بعد میں نہاؤں گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ میں نے اسے کمرے سے باہر بھیجنے کے لیے ایک ہی سانس میں حکم بھی دیا اور وضاحت بھی کر دی۔ وہ مسکراتی ہوئی جی بی بی جی کہہ کر چلی گئی اور میں نے اپنے کمرے کے دروازے کو بند کر کے چٹختی چڑھا دی۔

”ماما۔“ میرا دل ان کے لیے اتنا اداس ہوا کہ مجھ سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ میں نے اپنا موبائل فون سائیڈ ٹیبل سے اٹھایا اور ماما کا نمبر ڈائل کیا۔

جیسے ہی دوسری جانب فون کی تیل بجنا شروع ہوئی میرا دل پسلیوں میں پھڑپھڑانے لگا۔ میری کیفیت کچھ عجیب سی تھی میرے لیے انتظار کی وہ ساعتیں قیامت کی گھڑیوں جیسی طویل اور اذیت ناک ہو چکی تھی جب تک کہ ماما کی آواز دوسری جانب سے مجھے سنائی دے جاتی۔ تیل مسلسل بج رہی تھی مگر ماما فون انٹینڈ نہ کر رہی تھیں۔

میں نے نمبری ڈائل کیا اور انتظار کی اور بھی کڑی کیفیت سے گزرنے لگی۔  
”ہو سکتا ہے ماما سو رہی ہوں۔“ میرے دل نے وجوہات پیش کرنا شروع کیں۔

”اس وقت؟“ میں نے سامنے لگے وال کلاک کو دیکھا۔ دن کے ڈیڑھ بجے ابھی تو اب جان بھی آفس سے نہ آئے ہوں گے۔

”تو پھر وہ نماز ظہر ادا کر رہی ہوں گی۔“ میری محبت ابھی حوصلے میں تھی۔ کچھ دیر کے بعد دوسری طرف سے فون اٹھایا گیا۔

”ماما“ میرے لیوں سے پہلے ہی میرے دل نے پکارا اور پھر میرے لیوں سے نکلا۔  
”ماما!“

”ارے عصمہ بیٹا! یہ ہم ہیں نورامی کیسی ہیں آپ؟ دل تو لگ گیا۔ خوش تو ہیں نا؟“  
دوسری جانب ماما کے بجائے نورامی بول رہی تھیں میرے حوصلے پر اوس پڑ گئی اور میرا خوشی سے ہاتھتا ہوا دل دم سے گر گیا۔

”میں ابھی ہوں ماما۔ آپ کیسی ہیں؟“ میری مری مری ہی آواز نکلی۔  
”ہم سب ٹھیک ہیں۔ آپ کی ماما“ آپ کے پاپا سب ٹھیک ہیں۔“ انہوں نے خود سے ہی ہٹنا شروع کر دیا۔

”ماما کہاں ہیں؟“ میں نے پھر بھی پوچھ ہی لیا حالانکہ میں جانتی تھی کہ وہ وہیں پر ہوں گی اور انہوں نے جان بوجھ کر میرا فون نہ اٹھایا ہوگا بلکہ نورامی کو بات کرنے کے لیے کہہ دیا ہو گا۔ ان کا غصہ مجھ پر ابھی تک باقی تھا۔ وہ مجھ سے ابھی بھی اتنی ناراض تھیں کہ مجھ سے بات کرنا انہیں گوارا نہ تھا۔ مارے شرمندگی اور دکھ کے میرا اندر باہر پانی ہونے لگا۔

”وہ بیٹا! ذرا مصروف ہیں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں نا۔ میں نے رعدی ہوئی آواز میں کہا شدت غم سے اس وقت میرا دل اور میری آواز دونوں ہی پھٹنے کو تھے۔

”اچھا میری جان! خوش رہو۔ آبا د رہو۔“ وہ بھی دوسری جانب رو رہی تھیں۔  
”اپنا خیال رکھنا..... اور..... اور داماد جی کو ہماری دعائیں کہنا۔“ ماما کی جگہ انہوں نے مجھے دعائیں دیں۔ میں نے انہیں اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

”ماما!“ پھر مجھ سے خود پر قابو رکھنا محال ہو گیا اور میں بے اختیار سسکنے لگی۔ میری ماما کی محبتیں مجھے میسر نہ رہی تھیں۔ ان کی دعائیں بھی مجھ سے چھن گئی تھیں۔ میں اس قدر تہی داماں، کتنی حراماں نصیب ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بات پر قائم تھیں۔ انہوں نے تو مجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میری مرضی پوری ہو جانے کے بعد وہ مجھ سے کسی کوئی تعلق نہ رکھیں گی۔ نہ ہی کبھی رابطہ کریں گی۔ صاف



لفظوں میں میں ان کے لیے مرچکی تھی۔

میں عصمہ ممتاز میں تو واقعی مرچکی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو ہاتھوں سے ٹٹولا۔ میرا وجود تو سانس لے رہا تھا۔ بل جل رہا تھا۔ مگر اس کے اندر میں نہ تھی۔ میں..... یعنی اصلی عصمہ ممتاز انکس۔ وہ تو بے حد موذی مرض میں مبتلا اس وجود کی بند کوٹھڑی میں ایک قدرے اندھیرے کوٹھے میں بے بس پڑی سسک رہی تھی۔ اس کی رگوں میں جو مرض گردش کر رہا تھا اور اب ناسور بن چکا تھا۔ ایسا ناسور جولا علاج تھا۔ ایسا خطرناک پھوڑا اس عصمہ کے دل کی بائیں رگ میں سے نمودار ہوا تھا جس نے اس کے بدن میں جانے والے لہو کے ہر قطرے کو متاثر کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ اس کا زہر پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ البتہ اس خالی وجود کے اندر اک دلنشین نامی عورت رہائش پذیر ہو گئی تھی۔ جو اس خالی مکان میں بس جانے پر بہت خوش اور سمجھ رہی تھی کہ یہ مکان اسی کا اصل مسکن ہے۔

”ماما!“ میری نس نس میں گہری اداسیاں پیوست ہوتی جا رہی تھیں اور میرے درد کی

شدت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ماما اس وقت مجھے محض یاد ہی نہ آ رہی تھیں بلکہ میں ان کی کمی کو بھی محسوس کر رہی تھی کمی جو کہ طلب کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔ مجھے بھی اس لمحے ماما کی طلب تھی۔ ان کے سینے سے لگ جانے، بلکہ اس کے اندر سا جانے کی طلب۔ میرے اندر اک الاؤ دہک رہا تھا جسے ماما کے وجود کی ٹھنڈک ہی بجھا سکتی تھی۔ لیکن ماما کی بے رخی نے تو اس الاؤ کو مزید ہوا دے دی تھی۔ اب میرا اپنا دماغ کی نسوں سے لے کر پیروں کے انگوٹھوں تک دھواں دے رہا تھا۔

”ماما! آپ مجھ سے بات کر لیتیں تو آپ کا کیا چلا جاتا آخر کو میں آپ کی بیٹی ہوں مائیں تو درگزر کا نام ہوتی ہیں۔ محبت اور ایثار کے معنی ہی ماں کے وجود سے تعبیر پاتے ہیں۔ مگر ماما آپ آپ کے سینے میں پتھر کیوں ہے؟“ میں اپنی ماں سے شکوہ کناں تھی۔

”ماما! میں نے اپنی پسند سے شادی کر کے آخر ایسا کیا گناہ کر دیا کہ آپ مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگی ہیں۔“

مجھے اس وقت ماما کے روپے پر سخت رنج تھا اور پتا نہیں کہاں سے میرے اندر ان کے لیے برے برے خیال آنے لگے جو میرے جی کو یہ باور کرانے پر مصر تھے کہ میری ماما اچھی ماں نہیں ہیں۔ اور وہ سدا سے میرے ساتھ ایسا ہی سختی والا برتاؤ کرتی آئی ہیں میری غلطیوں کو انہوں نے کبھی

آسانی سے معاف نہیں کیا۔

”کھٹ کھٹ کھٹ.....“ کسی نے اسی وقت دروازے پر دستک دی اور میں سب کچھ بول بھال کے آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھ گئی۔ یہ دستک وجیہ کی ہی تھی اور اب وہ میری متورم و سرخ آنکھیں دیکھے گا تو ناراض ہوگا میں نے تیزی سے دروازے کی چٹخی گرائی اور ”وجیہ! میں بس ابھی آئی فریش ہو کر۔“ کہتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔



ہم لوگ کچھ کئی گھنٹوں سے سفر میں تھے۔ وجیہ ڈرائیو کرتے کرتے اور میں ارد گرد کے خشک مناظر دیکھتے دیکھتے تھک چکی تھی۔ مگر وادی سوات آنے کو نہ تھی۔ میں جی جی میں بے حد شرمندہ تھی کہ میں نے وجیہ سے مری جانے کے بجائے سوات جانے کی ضد کیوں کی تھی۔ اور میں اپنی غلطی پر دبے دبے لفظوں میں وجیہ سے معذرت بھی کر چکی تھی۔ جس پر وجیہ نے بغیر ماتھے پر توری ڈالے بڑے ہی نارمل انداز میں کہا تھا۔

”میشن ناٹ جان وجیہ..... تم کیوں حساس ہو رہی ہو۔ ایک وادی ہے جو اللہ کے دیے ہوئے حسن سے مالا مال ہے۔ اب اس کے دیدار کے لیے آنے والوں کو کچھ تو سفر کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔“

”اچھا چلو ڈرائیو کو سٹائیس۔“ وجیہ نے ایک چمپر ہوٹل پر گاڑی روکی۔

یہ ایک عجیب پر ہیبت سی جگہ تھی۔ انک خورو سے اس سفر میں ویسے بھی اک خوف اور دہرائی خود بہ خود ہمارے ساتھ ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ آری کی چوکیاں اور ان کی مشکوک کچھ ٹولتی ہوئی نگاہیں ہمارے چہروں سے لے کر پیروں تک جاتی تھیں اور ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت سے سوال کرتی تھیں۔ سوات آپریشن کے بعد سے یہی حال تھا۔ پیچھے راستے میں کئی مقامات پر ابھی تک سوات مہاجرین کے کمپ بھی موجود تھے۔ بہت سے لوگ اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے اور بے شمار ابھی کھلے آسمان تلے بے یار و مددگار پڑے اپنے وطن کی پر بہار فضاؤں کو یاد کر کے آہیں بھرتے تھے۔ ہم لوگ جب وادی سوات کے لیے نکل رہے تھے وجیہ کے سارے ہی گھر والوں نے اس کی بھرپور مخالفت کی تھی اور کہا تھا۔

”اب وادی سوات میں کیا دھرا ہے سوائے خاک و خون کی اٹی فضاؤں کے وہاں ابھی

دہشت گردوں کا ڈیرا ہوگا۔ وہاں تو ابھی آرٹی کا ہی قبضہ ہے۔“ کسی نے کہا۔

”حالات وہاں پر اس قدر خراب ہیں کہ جب چاہے فائرنگ ہو جاتی ہے اور کر فلوگ جا تا ہے ایسے میں اس وادی کی سیر کو جانا کہاں کی عقلندی ہے۔“ تیمور کی والدہ ہمارے وہاں جانے کی سب سے بڑی مخالف تھیں اور تیمور ہمارے وہاں جانے کا سب سے بڑا حامی۔ اس نے اپنی ماں ہی نہیں بلکہ باقی سب کے سوالات کا بھی ایک ہی جواب دیا تھا۔

”اوئے دماغ کے مارو..... عقل کے دشمنو اور سیر و سیاحت کے ذوق سے کورے لوگو! مجھے یہ بتاؤ کہ قدرت کو بھلا کوئی طاقت رک پہنچا سکتی ہے خواہ وہ دہشت گردی ہو یا محافظت کے نام پر چلائے جانے والے راکٹ لانچر۔“ وہ سب کو لا جواب کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

کائنات کا حسن اس کا ریگہ کا شاہکار ہے جس کے اک اشارے پر زمین و آسمان سانس لیتے ہیں اور اک ہی اشارے پر آفات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کے بس میں اس کی مصوری کے رنگ چرانا ہرگز نہیں ہیں۔ وادی سوات کا حسن اور سحر اسی طرح قائم و دائم ہوگا اور رہے گا۔ دہشت گردی، دہشت گردی یہ سب انسان کو انسان سے دور کرنے کے ڈرامے ہیں۔ جاؤ بھائی! آپ لوگ جاؤ..... رب راکھا۔

میں بھی آپ کے ساتھ چلا اگر آپ لوگ اپنی مون کے لیے نہ جا رہے ہوتے تو۔“ اس نے یہ فقرہ میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جس پر میں مارے شرم کے خجل ہو کر رہ گئی تھی۔

ہم نے اس چمپر ہوٹل میں چائے پی کچھ دیر وجیہ نے اپنی کمر سیدھی کی اور پھر ہم آگے چل دیے۔ ہم دو دریاؤں کے دورنگ پانیوں کے پہلو بہ پہلو سفر کرتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔ راستے میں کنڈ کے مقام پر پتھر کے بنے ہوئے بے شمار خوبصورت گھروں کو دیکھتے ہوئے۔

نوشہرہ کی سڑکوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے کیونکہ نوشہرہ بھی اچھا خاصا بڑا شہر ہے یہاں پر وجیہ کے ایک میجر دوست کے پاس ہم آدھا گھنٹہ ٹھہرے تھے وہ کھانے کا پروا انتظام کیے بیٹھا تھا مگر ہمارے پاس اس تکلف کے آداب بھانے کے لیے وقت نہ تھا لہذا اس نے سارا کھانا پیک کر داکے ہمارے ساتھ کر دیا تھا جس میں شامی کباب نکال کر ہم نے ابھی ابھی اس چمپر ہوٹل کی چائے کے ساتھ نوش کیے تھے۔

پھر ہم نے گزرتے گزرتے ریشی پر بھی ایک رشک بھری نظر ڈالی تھی جس کے بارے

میں اکثر میری دوست کہا کرتی تھی کہ اگر کسی عورت کے پاس ایک ہینڈ سم بجٹ ہو اور وہ غیر ملکی کپڑوں کے انوکھے پرنٹ خریدنا چاہتی ہو تو اپنی شاپنگ رٹھی سے کرے۔

”ہم یہاں سے واپسی پر سب کے لیے تحائف لیں گے اور خود اپنے لیے تم ڈھیر ساری شاپنگ بھی کرنا۔“ وجیہ نے پھر سے دل کی بات جان کر شرارت سے کہا تھا۔ اور میں نے ایک زندہ دل بھرپور مسکراہٹ سے دیکھ کر شکریہ ادا کیا تھا۔

پھر مردان شہر سے ہوتے ہوئے ہم گھر گزری سے گزرے۔ مردان میں ایک جگہ وجیہ نے گاڑی روکی اور مجھے ساتھ لے کر ایک بڑے سے کمپ تیلے آ گیا۔ یہ کمپ بھی انہی کمپوں میں سے ایک تھا جو پچھلے برس سوات آپریشن کے کڑے وقت پر سوات مہاجرین کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ وہاں ابھی بہت سے لوگ موجود تھے ان کی واپسی کا عمل ابھی تک جاری تھا۔ وجیہ نے وہاں پر کچھ رقم بطور عطیہ جمع کروائی اور ہم دوبارہ سے آگے بڑھ گئے۔

میں دل ہی دل میں وجیہ کی مزید گرویدہ ہوتی جا رہی تھی کہ اس میں اگر بہت سی بری عادات ہیں تو ابھی باتیں بھی تو بے شمار ہیں جیسا کہ دوسروں کی خاموش مدد کرنے کا یہ انداز۔ ”اوئے لڑکی! انیکوں کا حساب کتاب نہیں کرتے۔ ویسے بھی ہم جیسوں کی کوئی نیکی نہ معلوم قبول بھی ہوتی ہے کہ نہیں؟“ اس نے میرے سر پر پیار سے اک چپت لگائی۔

”اولاڈی! تم بھی نا.....“ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس سے مجھے اس کے حسن پر نہیں بلکہ اس کی باتوں پر پیارا رہا تھا۔

”میرا وجیہ ایک اچھا انسان ہے۔“ میرے دل کی دھک دھک گواہی دے رہی تھی۔



تخت بائی کے بعد بے شمار چھوٹے چھوٹے قبضوں سے گزرتے ہوئے ہم نے مالا کنڈ کا خشک درہ بھی عبور کر لیا اب ہم ایک پریچ سڑک پر گھوم رہے تھے جہاں مالا کنڈ کی چڑھائی ختم ہو رہی تھی۔ اور ہمارے چاروں طرف گھنے درخت اور کھیت تھے۔ مناظر میں ایک ساحرا نہ حسن رچتا جا رہا تھا۔ ہماری آنکھیں خوش رنگ اور شغولی ہو رہی تھیں۔

”حوصلہ رکھو! اور دل کو تھام لو اب ہم وادی سوات میں داخل ہو رہے ہیں۔“ وجیہ نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور مجھے لگا میرا دل اسی کے ہاتھ تیلے سانس لینے لگا وہاں سڑک

جیسے نیچے بیٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اسے دیکھ دیکھ ڈر لگ رہا تھا میری کیفیت سے محسوس کر کے وجیہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے خوبصورت نغمے کی لے کچھ اور تیز کر دی وہ ساتھ ساتھ خود بھی گنگنا رہا تھا۔

سریلی اکھیوں والے.....

سنا ہے تیری اکھیوں میں

وہ میری آنکھوں کو اپنی شرارتی آنکھوں سے ہولے ہولے چھیڑ رہا تھا۔ اور میں اس کی اس خوبصورت چھیڑ چھاڑ کے معنی جان جان کر شرمار رہی تھی۔ وہ نیچے کو بیٹھتی ہوئی سڑک ختم ہو گئی اور ایک ہموار سڑک کے ساتھ ہی بٹ خیلہ کا قصبہ شروع ہو گیا۔ ایسا قصبہ جس کا صرف نام ہی قصبہ تھا ورنہ تو یہ شہری سہولتوں سے مزین ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ البتہ اس کی رونق کو کسی کی نظر لگی ہوئی تھی اور بربادی کے آثار اس کے وجود پر لگے زخموں کی طرح نمایاں تھے جو ابھی تک رس رہے تھے۔ دہشت گردی اگرچہ وہاں سے اپنے منحوس سائے ہٹا چکی تھی لیکن اس کے نوکیلے پنجنوں کے نشانات ابھی تازہ تھے۔ وجیہ نے گاڑی ایک بڑے جنرل اسٹور کے سامنے روکی اور وہاں سے اپنے لیے سگریٹ اور میرے لیے کچھ جوس اور چپس کے پیکٹ خریدے۔ میں بھی گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی۔ وہ اسٹور والا ہمیں بڑی ہی خوفزدہ لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ ہمیں بھی دہشت گردوں کے ساتھی ہی سمجھ رہا ہو۔

”صاحب! برانہ مانیں تو اپنا شناختی کارڈ نمبر اور نام تو لکھوا دیں۔“ اس نے ہماری خریداری کا بل پیش کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”وہ جی کیا کریں مجبوری ہے۔ یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“ وہ اپنے کہے کی وضاحت پیش کر رہا تھا جس پر وجیہ نے اپنا اور میرا شناختی کارڈ نمبر اسے لکھوا دیا۔

”کوئی بات نہیں یار تمہاری بھی مجبوری ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں دودھ کا جلا چھانچہ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔“ وجیہ نے اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ڈرا سا ہلکے کھل کر مسکرایا۔

”شکریہ صاحب! یہ آپ کے شناختی کارڈ۔“ اس نے ہمارے شناختی کارڈ واپس کیے۔

”اچھا یار پھر ملیں گے۔ اب تو ہمیں سورج غروب ہونے سے پہلے وادی سوات میں

داخل ہونا ہے۔“ وجیہ نے اسے اللہ حافظ کہا اور ہم دوبارہ اپنے سفر پر رواں ہو گئے۔ ہمیں وادی

میں پہنچنے کی جتنی جلدی تھی۔ اتنی ہی کوئی ناکوئی رکاوٹ آنا شروع ہو چکی تھی، کچھ دور آگے جا کر جہاں بٹ خیلہ کی آبادی ختم ہوئی وہیں پر ہمیں روک لیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس چوکی کے ماتھے پر ایک نام آویزاں تھا۔

”چرچل چوکی۔“ یقیناً یہ انگریزوں کی قائم کردہ چوکی تھی جو ابھی تک ہم پر رعب جمائے سلامت اور موجود تھی۔ اب یہاں پر پولیس اور آرمی دونوں ہی موجود تھیں، جنہوں نے پورا آدھا گھنٹہ ہم سے اچھی خاصی انویسٹی گیشن کی۔ اور صحافت کے کیا۔ کیوں اور کیسے..... پر مشتمل سوالات کر کر کے ہمیں زچ کر دیا۔ ان میں کچھ شخصیات یہاں بھی اپنے چہروں پر ٹھیک وہی آنکھیں رکھتی تھیں جو ہمارے ہاں کے تھانوں میں اکثر ایس ایچ او اور حوالداروں کی ہوتی ہیں۔

دو مختلف زاویوں پر موجود آنکھیں جو مرد کی طرف انھیں تو شک سے بھری ہوئیں اور عورت پر انھیں تو ہوس زدہ .... میں سخت گھبراہٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ وجہ کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

”مسئلہ کیا ہے؟ آپ لوگوں کی تسلی کیوں نہیں ہو رہی ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور یہاں سیر کو آئے ہیں۔ کیا ہماری شکلیں آپ کو دہشت گردوں والی دکھائی دے رہی ہیں۔“

”نہیں جی شکلیں تو آپ دونوں کی ہی دہشت گردوں والی نہیں بلکہ قاتلوں والی ہیں۔ دلوں کو قتل کر کے ڈال دینے والی۔“ ایک ایس ایچ او نے بڑے ہی اوجھے انداز میں کہا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ لوگوں کی واقعی تسلی کرائی پڑے گی۔“ وجہ نے اپنے موبائل پر ایک نمبر ملایا اور اس ایس ایچ او کو موبائل تھما دیا۔ جس کو پکڑ کر پہلو کرتے ہی وہ.....

”جی..... جی..... جی صاحب..... ٹھیک ہے‘ آپ فکر نہ کریں..... سوری سر۔“ کرنے لگا میں نے حیرت سے وجہ کو دیکھا کہ اس نے اس وقت اس کی کس سے بات کرائی ہے۔

وجہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور غصے سے بڑبڑاتا ہوا دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھا۔

”سارا موڈ غارت کر دیا۔“ وجہ نے ایک بری سی گالی دیتے ہوئے چوکی والوں کو کوسا‘ چند لمحے ہم دونوں خاموش رہے۔ یہ خاموشی اپنی اپنی جگہ غصہ کرنے اور کڑھنے کی بدولت تھی جو ہم

دونوں کو ان قوم کے محافظوں پر تھا۔ جو قوم کی حفاظت کم اور ان پر شک زیادہ کرتے ہیں اور اگلے ڈھیر سارے لمحے مجھے حیرت میں غوطے دینے والے اور وجہ کے چہرے پر اک نرم سی مسکراہٹ پھیلانے والے تھے۔

وقت تو رواں تھا، مگر ہماری سانسیں رک چکی تھیں۔

”ہم دونوں کو ہی کچھ ہو چکا تھا۔

جیسے ہواؤں نے ہم دونوں کے ماتھے پر پھونک مار کر ہم پر جادو کر دیا ہو اور ہم اس جگہ پر ہوتے ہوئے کہیں اور ہی چلے گئے تھے۔

یہاں تک کہ ہم دونوں بھی اک دو بجے کے وجود سے بے گانہ ہو چکے تھے۔ ہمارے ہونٹ تو مارے حیرت کے گنگ ہو چکے تھے اب صرف ہماری آنکھیں تھیں جو سو گنہ بھی رہی تھیں۔ سن بھی رہی تھیں اور بول بھی رہی تھیں۔

ہم ایک عجیب وادی میں رک چکے تھے۔

ہمارے سحر زدہ بدن صرف سانس لے رہے تھے۔ اور ہمارے دل دھڑکنا بھول کر سوچنے لگے تھے کہ وادی سوات پاکستان ہی کی کوئی وادی ہے یا پھر زمین کا یہ ٹکڑا کوہ قاف کے اس پار سے اٹھا کر لایا گیا ہے جسے پرستان بھی کہتے ہیں..... یا پھر جادوگری..... یا..... کافرستان..... اک عجیب سا ظلم ہو شر بات تھے جو ہمیں دیوانہ کیسے دے رہا تھا۔

سورج ایک تانبے کا بڑا ساقھال بن کر آسمان کی مغربی گود میں اتر رہا تھا اس کی کرنیں چاروں طرف سنہری جال پھینک رہی تھیں۔ ایسے میں درخت، درختوں کے پتے، ان کے پھول، زمین پر پھیلے ہوئے کمیت اور پہاڑ..... ندی کا پانی..... سب کچھ سنہرا ہو چکا تھا اور ان سب کے بیچ میں ہم دونوں دو خالص سونے کے بت.....

”وادی سوات میں انسان داخل ہوتے ہی اپنے آپ میں نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے۔“ مجھے تیور کا کہا، وہ فقرہ اب حقیقت معلوم ہو رہا ہے حالانکہ وجہ تو کئی بار یہاں آچکا تھا اور یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا..... میں پہلی بار یہاں آئی تھی..... مگر پھر بھی ہم دونوں کی کیفیت ایک سی ہی تھی۔

ایک اجنبی سی خوشبو تھی جو ہمارے نعتوں سے اپنا تعارف کراتی ہوئی ہماری نس نس کو خوش آمدید کہہ رہی تھی..... میں نے ایسی مہک پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی..... یہ مہک یقیناً ان سفید پھولوں کے پتھوں سے پھوٹ رہی تھی جو سڑک کے دور دیہ کھڑے درختوں سے لٹک رہے تھے۔ اور یہ خوشبو ان کھیتوں اور بانوں سے بھی تو امنڈتی چلی آ رہی تھی جو تا حد نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ اس تیرتی..... پھیلتی اور ہازدوں کی طرح واہو کر اپنے ساتھ بھیج لینے والی اس خوشبو کے حصار میں ہم دونوں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہم دونوں کو ہی اس کی خبر نہ ہو سکی۔

سڑک کے ساتھ کھیتوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی ندی مسکرا رہی تھی..... میں تو ہلک کر اس کی طرف بڑھی اور جھک کر اس کے پانی کو چھونے لگی، جیسے مجھے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ وہ منظر جو میری آنکھوں کے سامنے ہے سچ سچ کا ہے۔

”اللہ تیرا شکر ہے کہ میں وادی سوات میں ہوں۔“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا اور نہ تو مجھے یہ سب خواب ہی لگ رہا تھا۔

”وجہ!“ ہوش آنے کے پہلے ہی لمبے میں نے وجہ کو پکارا..... اور دیوانہ دار اپنی بائیں اس کے لیے پھیلا دیں..... جن میں آکر وہ بھی اسی دیوانگی سے سا گیا۔

”جھینک پو کہ تم مجھے یہاں لے آئے۔“  
”جھینکس ٹو پو کہ تم مجھے یہاں لے آئیں۔“ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا شکر یہ ادا کیا اور کلکھلا کر ہنس دیے۔

”وجہ سوات کا سحر کتنا جاندار ہے۔“ میں بے ساختہ کہہ رہی تھی۔

”ہوں..... ہے تو.....“ وہ بھی کہیں اور گم تھا۔

”ان لوگوں کو یہ سب نظر نہیں آتا جو یہاں آتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ وادی سوات تو بس ایک وادی ہے باقی وادیوں جیسی اور کچھ خاص تو نہیں۔“ میں نے اپنی ایک دوست کا کہا وہ فقرہ بتایا جو اس نے یہاں سے واپس جا کر ہم سے کہا تھا۔

”ہر ایک کے دیکھنے اور محسوس کرنے کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے، لیکن پھر بھی جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں..... حالانکہ اللہ نے تو زمین کو بھی جنت کے ٹکڑوں سے پیوند کر رکھا ہے۔“ وجہ نے بڑے خوبصورت انداز میں کہا۔

میں بے حد خوش تھی اور سر دگر پر کیف ہوا میں اپنا چہرہ اوپر کیے لمبی لمبی سانسیں اپنے اندر اتارتی ہوئی دراصل اس خوشبو کو اپنی رگوں میں سو رہی تھی جو مجھے یہاں آکر ہی نصیب ہوئی تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ سفر نامے لکھنے والے لوگ الفاظ کی رنگ آمیزی کر کے مناظر کو حسین نہیں بناتے بلکہ قدرت کے ایسے مناظر تو انہیں خود بہ خود اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہوں گے جیسے اب میں اس خوشبو اور اس نظارے کے جادو میں جکڑی ہوئی تھی۔ میں ہی کیا وجہ کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ ہم دونوں دیر گئے اس حالت میں بت بنے رہے اور زیادہ تر تو میں ہی..... پھر وجہ نے اس ندی کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔



”مسز وجیہ الدین! اب ہوش میں آ جاؤ، یہاں کوئی گھر نہیں ہے، جہاں ہم پڑاؤ کر لیں گے۔ ہمیں ابھی اور آگے جانا ہے۔“

”بس کچھ لمبے اور وجیہ!“ میں نے اس کی سماجت کرتے ہوئے کہا۔

”اگر سورج آج کے دن کے بیت جانے کی خبر نہ دے رہا ہوتا تو ہم یقیناً یہیں پر رکھتے اور اسی ندی کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ مگر وہ دیکھو..... سورج تو الوداع کہہ رہا ہے۔“

وجیہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی جانب ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف کر دیا۔

”لیکن وجیہ! سورج جاتے جاتے چاند کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی تو اٹھا رہا ہے، وہ دیکھو؟“

میں نے بھی اس کا چہرہ آسمان کی طرف کر دیا۔

”ہاں لیکن یہاں شام جس قدر حسین لگ رہی ہے رات خوف ناک بھی ہو سکتی ہے۔“

وہ میرے دیوانگی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”لیکن کیوں؟“ میں وہاں سے جانے کو تیار نہ تھی اس لیے وجہ جاننے پر بضد تھی۔

”سنا نہیں..... پریوں کے دیس میں بھوت اور دیو بھی رہتے ہیں، جنہیں اندھیرے ہی سے شغف ہوتا ہے۔“ وجیہ نے مجھے ڈراتے ہوئے کہا۔ تب میں چپ چاپ اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔



کچھ ہی دیر کے بعد ہم لوگ ایک ریٹ ہاؤس میں موجود تھے، جہاں ہماری خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی..... وہ تو مجھے اب وجیہ نے بتایا تھا کہ یہاں کے رہنے کا انتظام اس کے اسی انجینئر دوست نے کیا تھا جو یہاں پر تعینات تھا اور جس کی بات وجیہ نے اس ایس ایچ او کے ساتھ کچھ دیر قبل موبائل پر کروائی تھی۔ اگرچہ وہ انجینئر صاحب خود وہاں موجود نہ تھے کہ وہ آج کل اس وادی سے آگے نیکورہ گئے ہوئے تھے جو دو روز بعد آ کر ہمیں ملنے اور پھر کسی اور جگہ لے جانے والے تھے..... اب یہ دو روز ہم نے یہیں گزارنے تھے۔

”اف! میں تو بہت تھک گیا۔“ گرم چائے کا دوسرا کپ خالی کرتے ہوئے وجیہ نے کہا۔

اب وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کو مچل رہا تھا، جبکہ اس ریٹ ہاؤس کا ملازم ہمارا سامان گاڑی سے اتار کے اندر ہمارے کمرے میں رکھ آیا تھا اور یہاں ریٹ ہاؤس کے ٹیرس پر ہمارے

لیے چائے لگا دی گئی تھی جو ہم نے بہت مزے سے پی اور ساتھ ساتھ۔ ارد گرد کے نظاروں سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ اب آسمان پر سورج کی جگہ چاند ابھر کے سامنے آ چکا تھا۔ آدھا دھواں مگر حسین چاند۔ آدھے چاند کا حسن کس قدر دلربا ہوتا ہے اور اس کی چاندنی کس قدر سہانی، اس کا ادراک مجھے اس بھیرس پر چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔

”بیگم صاحبہ! اب اندر چلیں اور کچھ آرام کر لیں۔“ وجیہ نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے اٹھالیا۔

’وائے ناٹ لی لارڈ.....‘ میں نے شوخی سے کارنش بجالاتے ہوئے کہا۔  
 ”اپنے اس فقرے کے معنی تو تمہیں اب پتا چلنے والے ہیں..... ذرا مجھے سانس لینے دو۔“ اس نے ذومعنی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے میرے کندھے کے گرد اپنا بازو حائل کر کے مجھے اندر لے جاتے ہوئے کہا..... جس پر میرے قدم من من کے ہو کر زمین سے گلنے لگے اور میرے آنکھیں حیا سے جھک کر میرے قدموں کی زمین کو چھونے لگیں۔



وہ تیسرا گلاس بنا رہا تھا جب میں نے اس کا ہاتھ مجبوراً پکڑ لیا۔  
 ”بس کرو وجیہ..... پلیز..... میں اس سے درخواست کر رہی تھی۔“

”بس اور ابھی سے..... ابھی تو اس کا لطف آنے ہی لگا ہے..... حواسوں پر تو چڑھنے دو۔“ وہ گلاس کو میرے لبوں کے سامنے لا کر اپنے انداز میں تو شرارت پر آمادہ تھا، مگر مجھے اس پہل اس کی گلابی پڑتی آنکھوں اور لڑکھڑاتے لہجے سے الجھن ہو رہی تھی۔ یہ والا وجیہ یکسر طور پر مختلف تھا۔ میرے اس وجیہ سے جوج سے چند لمحوں قبل تک میرا ہم سفر تھا۔ یہ تو وجیہ تھا ہی نہیں یہ تو لاڈی تھا۔ جی کا بڑا بھائی لاڈی۔

”کیوں پیٹے ہو اس ام الخپاش کو؟“ میں نے اس کا گلاس پرے ہٹاتے ہوئے کہا، اس کی بدبو سے میری سانس بند ہونے کو تھی اور کلیجہ الٹ کر باہر آنے کو تیار۔

”کیا کہا..... کیا کہا تم نے اسے؟“ اس نے گلاس میں برف ڈالتے ہوئے پوچھا..... اب یقیناً وہ اس کے حواسوں پر چڑھنا شروع ہو چکی تھی۔

”بتانا ذرا..... کیا نام لیا تھا تم نے اس کا؟“ وہ پوچھنے پر بھند تھا۔ اور میں اسے دوبارہ

دہرانے سے گریز پا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔

”کچھ نہیں..... بس میں تو کہہ رہی تھی کہ یہ اتنی بڑی چیز تم کیوں پیتے ہوئے جس کا سرا سرفنصان ہی ہے۔“ میں نے نرمی سے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”بڑی چیز..... اور یہ..... تمہارا دراصل اس سے واسطہ نہیں پڑانا..... اسی لیے کہہ رہی ہو..... کبھی اسے چکھو تو ہوتا چلے کہ..... کہ..... کہ.....“

اس کا لہجہ اٹکنے کے ساتھ ساتھ قدم لڑکھڑا گئے۔ میں نے جھٹ سے آگے بڑھ کر اسے قہام لیا کہ مبادا وہ گریہ نہ جائے۔

”وہ ایک شعر ہے نا..... کسی پرانے شاعر کا کہ..... کہ.....“ وہ اپنی یادداشت پر زور دینے لگا۔

”چھٹی نہیں ہے کافر منہ کو لگی ہوئی۔“ میں نے توڑ موڑ کر شعر سنایا۔

”ہاں..... ہاں یہی..... واہ..... واہ کیا انداز بیان ہے اور کتنی پیار تشبیہ ہے۔ چھٹی نہیں ہے کافر منہ کو لگی ہوئی۔“ اب اسے واقعی چڑھ چکی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور اسے اپنے سہارے سے لا کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

”اچھا یہ تو بتاؤ کہ شاعر نے کافر کس کو کہا ہے یہاں..... منہ کو یا اس کو۔“ اس نے ذرا فاصلے پر میز پر دھری بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم..... تم! آرام کرو لاڈی! تم بہت تھک چکے ہو۔“ میں نے اس کے پاؤں بیڈ پر کر کے انہیں دہاتے ہوئے کہا۔ میں اس کے پیروں پر اپنی انگلیوں سے ہولے ہولے مساج کر رہی تھی۔

”بتاؤ نا لٹنیں! کافر ہونے کا شہ شاعر کو کس پر تھا؟“ وہ اپنے ہوش مکمل طور پر کھو چکا تھا اور اب اس کی حالت وہی تھی جو ایک پینے والے کی ہوتی ہے اس وقت جب وہ اس کے پینے کا مقصد حاصل کر چکا ہوتا ہے..... کوئی اور موقع ہوتا تو میں شاید اس کی اس بات پر مسکرا دیتی، لیکن اس وقت تو محبوب کی حالت پر مجھے رونا آ رہا تھا۔

”شاعر نے اسی کو کافر کہا تھا۔“ میں نے بھی اسی مکروہ چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا..... تاکہ اس کے سوال کا جواب اسے مل جائے اور وہ بار بار اسے دُہرانا چھوڑ دے۔

”اچھا پھر تو ٹھیک ہے ورنہ میں سمجھا کہ شاعر نے کافر ”منہ“ کو کہا تھا۔ منہ تو میرا بھی ہے

جس سے میں چپتا ہوں..... اور منہ تو ہر کسی کا ہوتا ہے۔ جیسے کہ تمہارا یہ چھوٹے سے دہانے والا منہ۔“ وہ مدھوشی میں میرے ہونٹوں کو اپنی انگلیوں سے چھونے لگا۔

”اور تمہارے یہ بھرے بھرے ہونٹوں والا منہ..... جس کے اندر دیکھتے ہوئے تمہارے حسین اور سفید دانت..... گویا موتیوں کی لڑی۔“ وہ میری تعریف کر رہا تھا اور مجھے اپنے قریب کر رہا تھا۔ اس کے قرب کی گھڑیاں میرے لیے اس وقت بہت کڑی آزمائش کی گھڑیاں تھیں..... بالکل ان گزشتہ گھڑیوں جیسی جواب میری ہر شب کی چادر ہوتی تھیں۔

”وجیہ پلیز.....“ میں نے اسے دوبارہ نیچے پر لٹا دیا۔

”تم مجھے سے مخا ہو؟“ وہ میری سردمہری کو کسی ناراضی سے تعبیر کر رہا تھا۔

”نہیں میں بھی بہت تھک گئی ہوں۔ میرے سر میں بہت درد ہے۔“ میں نے صاف

جھوٹ بولا۔

”اوہ..... سر تو میرا بھی درد سے پھٹا جا رہا ہے، پلیز دہا دو۔“ وہ میرے درد کی فکر کرنے کے بجائے اپنے درد کا ذکر لے بیٹھا، اور میرے ہاتھ اپنے سر پر رکھتا ہوا مجھے دہانے کے لیے کہنے لگا..... میں اس کے بالوں میں ہولے ہولے سے اپنی انگلیاں پھیرنے لگی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہو۔ تمہیں سرد ہانا نہیں آتا۔ میرا دماغ اس وقت بالکل سن ہے، درد سے شل ہو رہا ہے۔ اسے جگاؤ، سلاؤ، مت اگر میں سو گیا تو پھر..... پھر..... میرے پینے کا فائدہ؟“ اس کا لہجہ لڑکھڑاتے ہوئے اجڑ بھی ہو رہا تھا۔ روایتی اور پرانے جاہل جیسا جو محض ایک شرابی ہوتا ہے۔ جس کے حواسوں پر صرف اس کی طلب کی حکومت ہوتی ہے، جسے اس وقت محبت یا محبت نامی کسی بھی نرم خوئی یا نرم لمس کی نہیں بلکہ گرم اور خستہ کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ ایک بھوکے کی خوراک کی مانند..... جو صرف اس وقت پیٹ بھرنے کا خواہاں ہوتا ہے کھانے کی لذت اور زرد ہنسی سے اسے کچھ غرض نہیں ہوتی۔

”افوہ کیا مرے مرے ہاتھ لگا رہی ہو، شموں کی طرح دہاؤ۔“ وہ قدرے بدتمیزی سے پیش آتا ہوا کہہ رہا تھا۔ اور میں واقعی شموں کے انداز میں لاڈی سائیں کا سردہانے لگی، بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ کل میرے سر میں تیل کا مساج کر رہی تھی۔

”شباباش! ایسے بالکل ایسے واہ..... سکون آرہا ہے۔“

”سارا درد ہوا ہو رہا ہے، کیا جادو ہے تیرے ہاتھوں میں، تو کمال ہے، شموں! تو واقعی

جادو کرنی ہے۔“ اس نے میرے دونوں ہاتھ تمام کے اپنے چہرے کے ساتھ رگڑنے شروع کر دیے اور میں خود کو شموں کی جگہ پر بہت بچ اور گھٹیا محسوس کرنے لگی۔



دوسری صبح ہم دونوں کے لیے مختلف زاویے کے ساتھ طلوع ہوئی تھی۔ وجہ خود کو بے حد تروتازہ اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، اس کی ایک لمبے اور سخت دشوار سفر کی محکم اتر چکی تھی۔ جبکہ میری نس نس میں اک تھکاوٹ نے ڈیرہ جمالیا تھا۔ ایسی تھکان جو انسانی جسم کے ہر خلیے میں سرایت کر جاتی ہے اور جو یونہی نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کی وجہ کوئی بہت غیر معمولی واقعی یا سانحہ بن جاتا ہے اور ایسے میں انسان اپنے ہی اندر کے خلاؤں میں اندھروں میں اور دیروں میں بھٹک بھٹک کر تھک جاتا ہے۔

یہ سفر وہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لیے شروع کرتا ہے اور اپنی ہی تلاش میں وہ اپنے وجود کا کونا کونا چھان مارتا ہے۔ وہ خود کو یا تو تلاش کر لیتا ہے یا ہمیشہ کے لیے کھودیتا ہے اور کبھی کبھی وہ ان دونوں کے درمیان معلق ہو کر رہ جاتا ہے، ہر ایک صورت میں اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ، شکست و ریخت کی سی کیفیت سے دوچار محکم اس کی رگ رگ میں پیوست ہو کر رہ جاتی ہے۔ میری گزشتہ رات بھی ایسی ہی قیامت اور اذیت کی رات تھی، صدیوں کے سفر پر محیط ایک رات..... جس میں میں خود کو تلاشتی اپنے ہی اندر بھٹکتی رہی میں کیا تھی، کون تھی۔

عصمہ ممتاز الحسن، دلشیں بیگم یا پھر شموں؟ میں جو بھی تھی، قابل رحم تھی..... ناقابل بیان تھی، ہر صورت میں میرا مقام بچ اور گرا ہوا تھا..... اور کیوں تھا؟؟؟ اس کا جواب گزشتہ رات کے بیتے ہوئے ہر ہل سے میں نے پوچھا تھا۔ مگر مجھے نہیں ملا تھا..... میں تھک گئی تھی.... اس جستجو میں بھٹک بھٹک کر۔

میری ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی۔

میرے ریشے ریشے میں درد تھا۔

اس معرکہ جسم و جاں میں میں ہار گئی تھی۔ اس لیے میری یہ صبح ہر گز بھی سہانی نہ تھی۔ حالانکہ میں پچھلے ایک گھنٹے سے ٹیرس پر کھڑی سامنے پہاڑوں کی تاحہ نگاہ اور افق کو چھوٹی سفید برف کو ٹھنکی باندھے دیکھ رہی تھی جو دیکھنے میں لگتا تھا بس چند فرلانگ کے فاصلے پر ہوں گے، مگر

جانے کتنے کوس دور تھے۔

میں ان درختوں کو دیکھ رہی تھی جن پر کچے کچے پھل لدے ہوئے تھے اور ان کی خوشبو انسانی معدے میں بھوک کی تحریک پیدا کرتی تھی۔

اور میں تو ان سفید پھولوں کے پتھوں میں بھی کب سے اپنی نگاہیں پھنسائے ہوئے تھی جو آسمان پر لٹکے تاروں جیسے دکھائی دیتے تھے۔

اور اس ریٹ ہاؤس کے قریب سے گزرنے والی ندی کا جھاگ اڑاتا پانی بھی مج سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے میں مگن تھا۔ لیکن ناکام تھا۔ وہ نظارے میری آنکھوں کے سامنے تو تھے مگر انہیں ٹھنڈا نہ کر رہے تھے۔ ہواؤں میں سرشاری موجود تھی۔ مگر میرا دماغ ٹھنڈا بن چکا تھا۔ فضاؤں میں جنگلی پھولوں کی مہک سرایت تو کیے ہوئے تھی، لیکن میرے احساسات کو نہ گداگداری تھی۔

میں اپنی بے جان سی ہانہوں میں اپنا ٹوٹا پھوٹا جسم سمیٹ کے کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے؟

اس ٹوٹے پھوٹے وجود کے اندر مجھے کس کس کے اور کتنے جسم بھرنے ہوں گے اور ان کی کینچلیاں بار بار تہدیل کرنے کا عمل مجھے کب کب اور کتنی بار کرنا ہوگا؟ اور کیوں؟؟؟

”دلنشین! میری جان!“ وہ ٹیسر پر آیا اور خوشی سے میرے ساتھ لپٹ گیا۔

”میں بہت خوش ہوں۔ اور خوش نصیب بھی کہ تم مجھے ملیں..... سوچتا ہوں کہ اگر مجھے نہ ملتیں تو میرے زندگی کیسی بے رنگ اور بور ہوتی۔“ وہ اپنی کہتا ہوا میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”ارے یہ کیا تمہاری آنکھیں تو آج پھر متورم ہیں اور لال بھی..... کیا تم رات بھر روتی رہی ہو؟“ وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں.....“ میرے مردہ جسم سے مری ہوئی آواز نکلی۔

”تو پھر یہ مر جھایا ہوا چہرہ اور لال آنکھیں؟“ وہ میری ناک کو اپنی انگلیوں میں دبا تا ہوا

بولتا۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی لگتا ہے زکام ہو گیا ہے۔“ میں نے اداکاری شروع کی۔

”اوگا ڈ..... زکام..... بابا جلدی سے اندر چلو اور دوا لو..... ورنہ یہ یہاں کا موسم میں اور بڑھ جائے گا اور پھر مجھے تو خود یہ بہت جلد ہو جاتا ہے۔“ وہ میرے گرد ڈھکی ہوئی شال کو درست کرتا

ہوا بڑی ملائمت سے بولا۔

”چلو اندر چلو، کافی پیتے ہیں۔“ وہ مجھے اندر لے آیا اور انٹرکام پر دو کافی کا آرڈر بھی

دے دیا۔

”اچھا تو اب کہو کہ آج کا کیا پروگرام ہے؟“ وہ میرے بخ ہاتھوں کو اپنے گرم ہاتھوں

میں لے کر مسلتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”کیسا پروگرام؟“ میں نے اجنبیت سے اسے پوچھا۔

”بھئی کہاں کہاں چلنا ہے؟ وغیرہ وغیرہ؟“ وہ میرے طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا،

شاید پوچھنا چاہ رہا تھا کہ میرے سر پر ابھی تک کوئی خمار باقی ہے جو میں یوں بدحواس نظر آ رہی

ہوں۔

”میرا مطلب ہے مجھے ان انجان راستوں کی کیا خبر کہ یہ کہاں جاتے ہیں۔ ویسے بھی

سنگ میل تو تم ہو۔ میرے تو محض قدم ہیں۔“

”اوہ اوڈا نیلاگ..... جذباتی فقرے..... ٹھیک کہتا تھا ممی..... یاں ہر شخص پر ٹونے

ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں اور زبانیں ان کے چہروں کا ساتھ نہیں دیتیں۔“ وہ اپنے مخصوص

انداز میں میرے گالوں پر چٹکی لیتا ہوا بولا۔ کافی آگئی تو ہم دونوں نے کافی پی۔

”چلو اب فنافٹ تیار ہو جاؤ..... چلو ناشتا کسی اور جگہ چل کر کریں گے..... کچھ مختلف

اور ایسا جو ہم نے پہلے نہ چکھا ہو..... جس کے ذائقے سے ہم نا آشنا ہوں۔“ وہ اپنا پروگرام ترتیب

دے کر مجھے بتاتا جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں مختصراً کہا اور تیار ہونے چل دی۔

”سنو کیا پہنو گی؟“ وہ میرے ساتھ ہی چلا آیا۔

”جو تم کہو۔“ میں نے اپنا چہرہ دوسری جانب کیے کیے جواب دیا۔

”وہ پہنو..... نیلی جینز پر سرخ ٹی شرٹ۔“ وہ اپنی پسند بتانے لگا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں الماری میں ٹھیکے بیگروں میں سے اس کا بتایا ہوا لباس اتارنے

لگی۔ حالانکہ میں نے کبھی جینز وغیرہ نہیں پہنی تھیں۔

”جینک یو مائی ڈیزر۔“ وہ خوش ہوتا ہوا بولا اور خود بھی تیار ہونے چل دیا۔

وجیہ نے یہاں ریٹ ہاؤس سے ایک جیب لے لی تھی جو اس کے اسی دوست کی بدولت اسے میسر ہو گئی تھی۔ اب اس جیب کو وجیہ بہت دیر دیر چلا رہا تھا اور بار بار میرے طرف پیار سے دیکھ کر شوخ فقرے اچھالتا اور کہتا کہ.....

”خوب صورت موسم.... دلفریب نظارے اور دلنشین ساتھی میں ڈرائیور کروں یا دل پر ہاتھ دھروں۔“ میں بس مسکراتی ہوئی ہوں ہاں کرتی جا رہی تھی اور ایک مصنوعی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر دھری تھی۔

”سوچ لو لاڈی تمہارے پہلو سے لگی جو بیٹھی ہے وہ دلنشین ہی ہے۔“ ایسے ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”کیا مطلب؟ دلنشین ہی تو ہے اور کون ہوگی۔“ وہ میرے زانو پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا۔  
 ”ہو سکتا ہے شموں ہو..... میرا مطلب ہے کہ تمہیں شموں دکھائی دے رہی ہو؟“ میں نے طنز کو نرمی اور محبت کے غلاف میں لپیٹ کر پھینکا۔

وہ بھی وجیہ تھا۔ کوئی عام سا آدمی نہ تھا کہ اسے محسوس نہ کرتا..... لیکن ایک بات تھی اس کے اندر قحط بھی تھا۔ پینے پر آتا تو وہ کسی کی بھی خطا مسکرا کر پی جاتا اور اسے اف تک نہ کہتا، البتہ پکڑتا تو ذرہ برابر غلطی پر بھی اگلے کا حشر کر دیتا۔

مارا جو تو نے پھول وہ پتھر سے کم نہیں  
 دنیا ہزار زخم دے اس کا غم نہیں  
 مارا جو تو نے پھول وہ پتھر سے کم نہیں  
 وہ باقاعدہ لہک لہک کر گنگنا نے لگا۔

”اچھا جناب معافی! جو ہوا سو ہوا! اب غصہ تھوک دیں۔“ وہ میرے بات کی گہرائی جان کر سوری کر رہا تھا۔

”میں بھی کہوں میڈم کو ہوا کیا ہے۔ مسکرا کر کہنے لگیں زکام۔ جبکہ اندر تو حسد کے الاؤ دھک رہے ہیں۔“ وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی بڑی بات نہ ہو بلکہ معمولی سی بات ہو۔

”وجیہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ میں بے پھر سے اقرار محبت کرنا شروع کر دیا کہ



میں بھلا اور کربھی کیا سکتی تھی۔ اس محبت نے واقعی مجھے بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔  
 ”میں جانتا ہوں میری حیات..... ہر وقت کہہ کر اس کے لطف کو کیوں کم کرتی ہو۔“ اس نے جیب کو ایک طرف روک کر میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔  
 ”ادھر دیکھو میری طرف؟“ اس نے مجھے مکمل طور پر اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کندھوں سے تمام کے اپنے سامنے کر لیا۔

”کیا میری آنکھوں میں تمہارا عکس نہیں، بولو؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں اس وقت میری ہی تصویر تھی۔  
 ”ہاں ہے۔“ میری آواز فرط جذبات سے رندھنے لگی۔

”مجھے بھی تم سے محبت ہے، سچ، آج تم اس بات کا یقین کر لو اور مجھ سے جو وعدہ چاہے لے لو کہ میں کبھی تم سے بے وفائی نہ کروں گا، اور اس کے بعد پھر کبھی مجھ پر شک مت کرنا۔ یہ روز، روز انظہار محبت کرنا، قسمیں کھانا، وعدے کرنا، یہ سب قلمی باتیں ہیں جو مجھے پسند نہیں۔“ اس کے اقرار محبت میں بھی اپنی ہی مرضی تھی، حکم تھا، سختی تھی، لیکن سچ بھی تھا، اگرچہ یہ سچ بھی اس کے اپنے طریقے کا ہی تھا۔

”اور یہ بھی جان لو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ شموں اور علینا جیسے کھلونے میری زندگی کی شاہراہ پر جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ ان سے نہ مجھے محبت ہے اور نہ ہی ان کی میرے لیے کچھ اہمیت ہے، پھر بھی میرا گزارا ان کے بغیر نہیں ہوتا۔ اور رہ گئیں تم۔“

تو تم واقعی میری دلنشین ہو، میری محبت، میرے گھر کی عزت ہو، تمہارا مقام میرے دل میں ہے اور تمہاری جگہ میرے خاندان کی عورتوں کے ساتھ ہے، بس یہی ہے حقیقت، بولو قبول ہے؟ منظور ہے؟“ وہ اپنی آنکھوں میں میری آنکھوں کو سنبھالے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں وہم و گمان کے بیچ معلق تھی۔

کہ کیا کروں۔ بھروسہ کروں یا نہ کروں، اور ایسی محبت کہ ایسے مقام کو ایسی وفا کو قبول کروں یا نہ کروں جس میں ہوا رہے ہی بنا رہا تھا۔ شراکت ہی شراکت تھی اور ملاوٹ ہی ملاوٹ تھی۔  
 ”تم میری دلنشین ہو، دلنشین ہو، اس دل میں جو گوشہ تمہارے لیے مختص ہے، اس میں کسی کو جھانکنے کی بھی اجازت نہیں۔“ اس نے میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھ دیا تھا۔

دلنشین میں نے تم سے نکاح کیا ہے، میرے وارثین تم میں سے ہی ہوں گے، متاؤ اور تم

کیا چاہتی ہو؟ اپنے تئیں وہ مجھ پر اپنی مہربانیاں گنوارہا تھا۔ اس وقت وہ ایک بگڑا ہوا مرد ہی دکھائی دے رہا تھا۔

”اچھا چلو ایک اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اب کسی اور سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔“ اس نے ایک اور احسان کرتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز اور شکل ایسی بھولی بنی ہوئی تھی کہ مجھے ناچاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

”یہ ہوئی ناپات؟“ اس نے چٹکی بجا کر ہستے ہوئے کہا۔

”زندگی کو خوشی سے گزارنا چاہیے، جیو اور انجوائے کرو جو ہے وہی تمہارا نصیب ہے، اسی پر شکر ادا کرنا چاہیے اور جو نہیں ہے اس پر روتے رہنے کا فائدہ.....“ وہ اپنے نظریات بیان کر رہا تھا جن پر وہ زندگی گزارنے کا قائل تھا، اور میں اس کے نظریات پر عمل کرنے کے خود کو فی الحال تیار نہ پاری تھی، لیکن اس کے مخالف چلنے سے بھی تو کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔

”اب چلیں؟“ اس نے اپنا بازو آگے بڑھاتے ہوئے پیار سے کہا اور میں اس کے بازو میں اپنا بازو ڈال کر اس کے ساتھ چل دی۔

ہماری جیب جس راستے پر جارہی تھی وہاں سڑک کے دونوں طرف پھلوں کے باغ تھے اور ایک جگہ پر تو یہ باغ آپس میں یوں مل گئے تھے کہ سڑک غائب ہی ہو گئی، ان باغات کے اندر گلابوں کی ایک سرزمین تھی اتنے گلاب جیسے کسی نے وہاں بچھا دیے ہوں۔

بہار و پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے وجہ کو پھر شرارت سوچھی اور وہ میری طرف اشارے کر کر کے متکثانے لگا۔ اور میں ان گلابوں کے اس جنگل کو دیکھ کر حیران ہوئی جارہی تھی نیچے زمین پر گلاب..... حتیٰ کہ وہاں سے نظر آنے والے گھروں کی چمتوں پر گلاب، بھلا اتنے گلاب بھی ہو سکتے ہیں، میں چاروں طرف دیکھتی جارہی تھی اور سوچتی جارہی تھی کہ وادی سوات میں اپریل کا مہینہ تو گویا موسم بہار کے مکمل معنوں کے ساتھ کھلتا ہے۔ ہم پھر سڑک پر آچکے تھے..... یہاں پر ہمیں کہیں کہیں سواتی بچے اور بچیاں بھی نظر آئے اور بہت سے گھروں کی جگہ ہم نے تباہ شدہ بلے کو دیکھا۔ یہ سوات آپریشن کی نشانیں میں سے تھے جہاں سوات میں اس وقت پھول اور پھل مہک رہے تھے وہیں پر یہاں اٹھائی گئی قیامت کی کہانیاں بھی بکھری پڑی تھیں۔ بلے ہوئے باغات، برباد گھر اور ویران راستے.....

”وجہ! اگر یہاں وہ دہشت گردی اور فوجی اور آپریشنز والی قیامتیں نہ گزرتیں تو یہاں پر

جنت کی شاہت اور بھی گہری ہوتی، ہے نا؟“ میں نے رنج اور راحت کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

”ہاں یار پہلے تو یہاں صرف اور صرف خوشیاں اور رفعتیں ہی ہوا کرتی تھیں، لیکن شکر ہے اللہ کا اب پھر سے حالات اچھے ہو رہے ہیں، لوگ اپنے گمروں کو واپس آ گئے ہیں، کچھ آرہے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ وادی پھر سے بس جائے گی، اسی طرح سے آباد اور شاد ہوگی۔“ وجیہ نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے وادی کے دوبارہ آباد ہونے کی دعا بھی دی۔

”ان شاء اللہ تعالیٰ۔“ میرے بھی دل سے دعا نکلی..... پھر اگلے ایک گھنٹے تک وجیہ مجھے اس حسین وادی کے مختلف حصوں کی سیر کراتا رہا۔

میں نے سرسوں کے کھیتوں میں گل لالہ کا احتراز زردگی میں پہلی بار دیکھا تھا، جسے دیکھ کر میں اور بھی محو حیرت ہو گئی تھی۔

ہم نے وہاں سے کافی آگے جا کر ایک معمولی سے ہوٹل میں چار پائٹوں پر بیٹھ کر کھانا کھایا، اور پھر دودھ پتی پتی مجھے دریائے سوات دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا، یہاں سے دریائے سوات ہمیں کہیں کہیں پر دکھائی تو دینے لگا تھا، مگر وہ خاصے فاصلے پر تھا۔

”ڈارلنگ! اب دریا پر ہم کل چلیں گے، اب میں تھک گیا ہوں، واپس چلیں۔“ وجیہ نے شام کے پھیلنے سائے دیکھ کر کہا۔

”ہوں..... ہاں چلیں۔“ میں نے گم سمی حالت میں جواب دیا۔

”ریسٹ ہاؤس پہنچتے پہنچتے ہمیں رات آ ہی لے گی۔“ وجیہ بتاتا رہا تھا اور رات کی آمد کا سن کر میرے دل و دماغ پر بھی سیاہیاں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔ وجیہ کا خوب صورت ہنستا مسکراتا سراپا رات کی سیاہی کے پس منظر میں پھر سے سیاہ ہونے لگا، اور میرے وجود کا چپا چپا اور اس کی ہڈی ہڈی پھر ایک قیامت کے ساتھ معرکہ آرا ہونے کے خوف سے کاٹھنے لگی۔



اسلام آباد میں پانچ روز بسر کر کے آخر کار ہم لوگ واپس گھر آ ہی گئے تھے۔ جس وقت ہم حویلی میں داخل ہوئے اس وقت رات کا تقریباً ایک بج رہا تھا۔ وجیہ بھی بہت زیادہ تھک چکا تھا اور خود میں بھی..... اس لیے ہم لوگ سیدھے اپنے کمرے میں آئے.....

”سلام بی بی!“

”سلام سائیں!“ شموں جو ہمارے کمرے میں ہمارا انتظار کر رہی تھی، ہمیں دیکھتے ہی تعظیم اور خوشی سے سلام کرتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے میرا ہینڈ بیگ میرے ہاتھ سے لے کر سائینڈیجبل پر رکھا اور میری چادر تہ لگا کر الماری میں..... وجیہ آتے ہی صوفے پر گر گیا تھا۔

”ڈنشیں بیگم! تم نے تو میری بس کرا دی ہے۔“ وہ جھکن سے چوڑے مگر شرارت سے کہہ رہا تھا۔ شموں بجلی کی تیزی سے آگے بڑھی اور وجیہ کے پیروں میں سے جوتے اتارنے لگی۔

”سائیں! میں نے گیزر چلا دیا تھا، آپ شاور لے لیں۔“ وہ بڑے ادب سے کہہ رہی تھی۔

”نہ بابا نہ ابھی شاور نہیں پہلے تو کافی پلا اچھی سی ذرا ہڈیرو تو کھلیں، کچھ آنکھیں تو چاٹنا دیکھیں۔“ وہ آنکھیں موندے موندے بولا۔

”حاضر سائیں! بس پانچ منٹ۔“ وہ اسی تیزی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ تیزی اور پھرتی سے جو اس کی ذات کا حصہ تھی اور یقیناً یہی پھرتی اور چستی اس کے اس قدر سٹول جسم کی خوراک بھی تھی۔

”ویسے سائیں! کھانا بھی تیار ہے۔“ وہ دروازے میں جا کر اپنی ایڑیوں پر گھومی۔

”سائیں! پکچن ننگہ اور ہنٹر بیف ہے ویسے دال چاول بھی ہیں۔“ اس نے ذرا مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔ میں یہ عجیب سا ڈنر میونس کر جیران تھی۔

”سائیں! لمبے سفر سے واپس آئیں تو یہ ہی پسند کرتے ہیں۔“ اس نے میرے چہرے سے فوراً ہی میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔

”اچھا جا لے.... پہلے کھانا لے آ۔“ وجیہ کو شاید بہت بھوک لگ رہی تھی اس لیے جلدی کھانے پر آمادہ تھا۔

”جی سائیں!“ وہ لمحوں میں غائب ہو گئی۔

”وجیہ! کیا ہوا؟ کیا بہت تھک گئے ہو۔“ میں اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”ہاں بہت۔“ اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

”میں نے بہت تنگ کیا ہے نا؟ میری ضد پر تم نے اتنے لمبے سفر کیے؟“ میں اس کا سر ہولے ہولے دبائے لگی۔

”اوں..... ہوں۔ بالکل بھی نہیں، تمہاری ضد کہا تھی یہ تو میری اپنی مرضی تھی اور تمہارا حق تھا۔“ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح سے میرے کندھے سے ڈھلک کے میری گود میں آ گیا۔

”حق؟“ میں نے اس کی بند آنکھوں کو اپنی انگلیوں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بھی بیویوں کو بہت سے حقوق ہوتے ہیں اپنے شوہروں پر، جن کا خیال رکھنا شوہروں پر فرض ہوتا ہے“ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑا اپنے ہونٹوں پر ڈھانک لیے۔

”اچھا جی! شوہروں کے کیا کیا فرائض ہوتے ہیں، بتاؤ گے ذرا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”یہی کہ وہ ان کے نان نفقے کا خیال رکھے۔“ اب وہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

”اور.....“ میں نے اپنے ہاتھ اس کے ہونٹوں سے ہٹا کر پھر سے اس کے بالوں کو سہلانا شروع کر دیا۔

”اور یہ کہ انہیں خوش رکھے، گھمائے، پھرائے، زندگی آرام اور آسائش دے، ٹھیک ویسے ہی جو وہ خود کے لیے پسند کرتا ہے۔“ اس نے تفصیل بتادی۔

”اور بیوی کے کیا فرائض ہیں؟“ میں پھر پوچھا۔

”وہ اپنے شوہر کو ہر طرح سے مطمئن اور راضی رکھے اور اس کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔“ اس نے میری ناک کو اپنی دو انگلیوں درمیان دبا تے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس سے پہلے کہ میں ”بیوی“ کے حقوق اور فرائض پر اصل بات کرتی شموں کھانے کی ٹرے لے کر آ چکی

تھی۔

”واہ شموں! کتنا مزے دار ہنٹر بیف ہے، تم نے بتایا ہے نا؟“ وجیہ نے کھانے کی ٹرائی پر سے پہلے ہنڑاٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے تعریف کی۔

”جی سائیں!“ وہ پھولے نہ سائی ہوئی آگے بڑھی اور گلاس میں کوک ڈالنے لگی۔

”تیری کیا بات ہے شموں؟ تو لا جواب ہے؟“ وہ اسکی تعریف کر رہا تھا اور اس وقت میرے دل میں نہ جانے کیوں دھواں سا ہونے لگا۔

”شموں! اب تم جاؤ۔“ میں آگے بڑھ کر وجیہ کو خود کھانا سرور کرتے ہوئے کہا۔

”سائیں! میں جاؤں؟“ میری بات کو نظر انداز کر کے اس نے وجیہ سے اجازت طلب کی تو مجھے اور بھی برا لگا۔

”میں نے کہا نا کہ جاؤ اب۔“ نہ چاہتے ہوئے میری آواز میں غصہ آ گیا۔

”وجیہ؟“ میں نے برا سا منہ بتالیا۔

”صدقے جاواں! سوئی کو غصہ بھی آتا ہے۔“ وہ میری حالت سے محفوظ ہو رہا تھا۔

”وہ ایک معمولی ملازمہ ہے اور میں تمہاری بیوی۔“ میں نے اسے کچھ یاد کرانے کی کوشش کی۔

”ہاں مجھے پتا ہے۔“ وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے کھانا کھاتا رہا۔

”اور بیویوں کے حقوق جو تم نے ابھی بتائے تھے وہ؟“ میں نے اسے طنز سے سوالیہ

نظروں کے ساتھ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور وہ شوہروں کے حقوق؟ تم بہت بھلکدو ہو کیا؟ اتنی جلدی بھول گئیں۔“ وہ میرے ہی

انداز میں بولا اور پھر قبضہ لگا کر ہنس پڑا۔

”جند میری اے! ایسی ذرا ذرا سی باتوں پر جلنا، کڑھنا شروع کر دو گی تو حسن کے اس

گلاب کو کھلاتے دیر نہیں لگے گی، اور وہ پھول ہی کیا جو تازہ مہک نہ دے۔“ اس نے شرارت ہی

شرارت کے انداز میں مجھے بہت بڑی اور گہری بات کہہ دی۔ جس پر میں غلج سی ہو کر رہ گئی۔ پھر

کھانے کی طرف میرا جی مائل نہ ہوا اور میں ہاتھ دھونے کے بہانے ہاتھ روم میں گھس گئی۔

”آنسو مت بہا کے آنا۔ مجھے پتا چل جائے گا۔“ میرے پیچھے ہی اس کی آواز آئی تو

میں اپنی آنکھوں کا سارا پانی واپس اپنے اندر پلٹ دیا۔ جو میری آنکھوں کو ہی نہیں بلکہ حلق کو

دیواروں کو بھی چیرتا ہوا گیا۔



وجیہ نے بالکل ٹھیک کہا تھا میرے لائے ہوئے تحائف کو کسی نے بھی اہمیت نہ دی۔ زینت میرا زادہ وجیہ کی والدہ یعنی بڑی امی نے تو صاف کہہ دیا۔

”دلشیں! یہ کیا اٹھالائی ہو نہ کوئی رنگ نہ کوئی کوالٹی۔“ انہیں کرے کلر کا پورشنوں کا بے حد ڈسینٹ پرنٹ والا سوٹ ذرا بھی نہ بھایا تھا۔

”آپی! یہ آپ کو احساس دلانا چاہتی ہے کہ اب آپ بوڑھی ہو رہی ہیں، تبھی تو ایسا رنگ اور پرنٹ اٹھالائی ہے۔“ فکر النساء وجیہ کی چھوٹی ممانے موقع غنیمت جانتے ہوئے مجھ پر طنز کرنا اپنا فرض سمجھا۔

”بوڑھے ہوں میرے دشمن۔“ ان کے جواب پر زینت نے میرا دیا ہوا سوٹ بچ کے ایک طرف رکھ دیا۔

”اور یہ تو دیکھیں، میرے لیے کیسا نایاب تحفہ ہے؟“ انہوں نے اپنا ایک تیرنشا نے پر لگتا دیکھ کر فوراً ہی دوسرا بھی کمان چڑھالیا۔

”یہ..... یہ لائی ہے تیرے لیے؟“ بڑی امی نے فخر النساء کے ہاتھ سے میری دی ہوئی ساڑھی سمجھنی۔

”ہاں جی یہی لائی ہے۔“ وہ کاٹ دار انداز میں مسکرائیں۔

”دفع.....“ انہوں نے وہ ساڑھی بھی اپنے سوٹ کے ساتھ شیخ دی۔ یعنی چھوٹی ماما کا دوسرا تیر پہلے سے بھی زیادہ گہرائی لیے ہوئے تھا۔ میں تو تڑپ کر رہ گئی۔ زارا بی بی بھلا کب چپ بیٹھتیں وہ ناک بھوں چڑھاتی ہوئی آگے بڑھیں۔

”اور بھر جائی! یہ تو آپ رکھ ہی لیں۔ مجھے ایسے کپڑے دیکھ کر ہی الرجی ہونے لگتی ہے۔“ زارا نے بھی اپنا سوٹ واپس کر دیا۔

اس قدر بے عزتی، اور ایسا انداز ذلت، میں تو زمین میں گڑھ کر رہ گئی تھی۔

”یہ بیچاری بھی کیا کرے، اسے بھلا کیا پتا ہوگا کہ شاپنگ کیسے کرتے ہیں۔ اسکی ماں ایسے ہی بہنٹی ہوگی نہ! اسی لیے یہ لائی ہے۔“ فخر النساء نے مجھے چھوڑ کر میری ماما کو نشانہ تنقید بنالیا۔

”سوری ماما!“ میں نے بمشکل اتنا کہا اور تیزی سے اپنے کمرے میں کی طرف پلٹ آئی۔  
کیونکہ اب مجھ سے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا بے حد دشوار ہو گیا تھا۔ میری پشت پر ان کی خطرناک ہنسی  
آگ کی طرح لپکتی تھی۔

میرے دل و دماغ بڑی طرح سلگنے لگے۔ میں اپنے بستر پر اوندھی پڑی سسک رہی  
تھی۔ تبھی کسی کے نرم نرم ہاتھوں نے مجھے چھوا۔

”بھرجائی! بھرجائی۔“ منو باریہ میرے قریب بیٹھی مجھے پکار رہی تھی۔

”ہاں..... ہاں۔“ میں نے اپنے آنسو صاف کر کے اس کی طرف دیکھا اور سیدی می

ہو کر بیٹھ گئی۔

”سوری بھرجائی۔“ وہ شرمندہ تھی۔

”کس لیے؟“ میں نے پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”یہ لوگ پہنچے نہیں کیوں ایسے ہی کرتی ہیں۔“ وہ نادرہ بیگم اور فخر النساء کے رویہ سے

تالاں تھی۔

”خیر ہے، ہوتا ہے، تم نہ پریشان ہو۔“ میں نے اس کی اپنے لیے مثبت سوچ کو بہت

بڑی نعمت سمجھتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”پھر بھی..... سوری ان سب کی طرف سے۔“ وہ بدستور شرمندہ تھی۔

”کہا نا..... مینشن ناٹ۔“ میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ نگاہیں

چرائے بیٹھی تھی۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دی۔

”گڈ گرل۔“ میں نے پیار سے اس کے گال پر ہلکے سے چٹکی لی۔

”وہ تو میں ہوں۔“ وہ ایک دم سے شریر ہو گئی۔

”اچھا تو میرا تھو؟“ اب وہ میرے سامنے اپنا ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔

”وہ..... وہ اگر تمہیں بھی نہ پسند آیا تو؟“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”نہ پسند آیا تو میں اپنی پسند کا لے لوں گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے، میں ایسے ہی کرتی ہوں جتنے سوٹ ہیں سب تم کو دکھاتی ہوں جو تمہیں

پسند آئے۔“

مجھے بھی اس کی اس بات پر اطمینان ہوا کہ وہ اپنی پسند کا سوٹ لے لے تو یہ زیادہ اچھا



ہے۔ میں نے سارے کپڑے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے جو میں رکھائی سے خریدے تھے۔  
 ”لو پسند کرو۔“ میں نے خوشی سے اسے دعوت دی  
 ”ہوں..... ہوں کیا کروں، کون سا والاوں۔“ وہ سارے کپڑے دیکھتی ہوئی تذبذب کا شکار تھی۔

”یہ تو سارے ہی بہت حسین ہیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔  
 ”تو ٹھیک ہے تم سارے ہی لے لو۔“ میں نے واقعی دل سے کہا۔  
 ”یہ والا لیتی ہوں یہ تو سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔“ اس نے ایک سوٹ کا دوپٹہ کھول کر اوپر اوڑھتے ہوئے بڑے ستائشی انداز میں کہا۔  
 ”اف۔ اس کا پرنٹ کیسا زبردست ہے اور کپڑا؟ کپڑا تو اتنا نرم اور ہلکا کر واقعی مٹھی میں بند کر لو۔“ وہ دل سے تعریف کر رہی تھی پھر بھی مجھے لگا وہ میرا دل خوش کرنے کو زیادہ کہہ رہی ہے۔

”میں بتاتی دلتی نہیں کسی کو بڑی صاف گو ہوں۔“ وہ میری بات سن کر ذرا اکڑ کر بولی۔  
 ”آخر کو فخر النساء کی بیٹی ہوں۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بچتے ہوئے کچھ اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔  
 ”مگڈ گزل۔“ تب اس نے میری نکل کرتے ہوئے میری گال پر چٹکی لی اور ہم دونوں ہی ہلکھلا کر ہنس پڑیں۔  
 ”اچھا جی تو تمہیں یہ سوٹ پسند آیا ہے۔“ میں نے وہ سوٹ تہہ کر کے اسے پیش کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سب سے زیادہ پسند آیا ہے ورنہ تو باقی سبھی بھی بہت اچھے ہیں۔“ اس نے سوٹ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔  
 ”تو میڈم ایک بات بتاؤں آپ کو؟“ میں نے باقی کے کپڑے اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”جی..... جی بتائیں؟“ وہ دل چسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔  
 ”تم یقین کرو میں نے یہی سوٹ تمہارے لیے خریدا تھا۔“ میں نے سچ کہا تھا جس پر وہ بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”بھرجانی! آپ بہت اچھی ہو آپ پر بھروسہ کرنے کو جی کرتا ہے۔“ اس کی بات میں ایک اور بات تھی کیا؟ میری چھٹی حس نے اٹھرائی لی۔

”اچھا! تو پھر کرو نہ بھروسہ کس نے منع کیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

”کروں گی ضرور کروں گی“ آپ پر نہیں کروں گی تو کس پر کروں گی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”اچھا کب؟“ مجھے اس کا حال دل جانے کی کھد بد ہونے لگی۔

”مناسب وقت آنے دیں۔“ وہ میرے کندھے اور آنکھیں ایک ساتھ چھوڑتی ہوئی بولی۔

”چلو ٹھیک ہے، میں اس مناسب وقت کا انتظار کروں گی۔“ میں نے ذرا بھی ضد نہ کی کہ وہ مجھے اپنے دل کی بات بتائے۔ مجھے معلوم گیا تھا کہ اب وہ اپنا حال دل مجھ سے ہی کہے گی۔

صوباریہ اپنا تھنہ لے کر خوش خوش چلی گئی اور میرے جی کا بار بھی ہلکا کر گئی۔ ورنہ تو جانے میں کتنی دیر تک پریشان ہوتی رہتی۔



تیور کے الگینڈ جانے کے کاغذات مکمل ہو چکے تھے اس کا داغ دہاں کی ایک بہترین تعلیمی درس گاہ میں ہو چکا تھا۔ لہذا آج کل وہ بے حد خوش تھا۔ وہ اپنی ہی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس لیے کم ہی نظر آتا تھا۔ وجیہ بھی پچھلے تین روز سے حویلی میں موجود نہ تھا۔ کہاں گیا تھا مجھے خبر نہ تھی۔ جب وہ جا رہا تھا تو میں نے پوچھا تھا۔

”وجیہ! کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا تھا۔

”وجیہ کی جاناں! بہت سے کام ہوتے ہیں مردوں کو زمینوں کے ہزار مسئلے مسائل ہوتے ہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جہاں بھی گیا لوٹ کر تمہارے پاس ہی آؤں گا۔“ اس نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔

میں اس سے مزید وضاحت مانگ ہی نہ سکی اور وہ مجھے چند روز تک واپس آ جانے کی تسلی

دے کر چلا گیا، میرا دل بہت اداس تھا۔ کبھی میں ٹی وی دیکھتی، کبھی کتابیں پڑھتی، کبھی فون پر اپنے دوستوں کے ساتھ ڈیروں باتیں کرتی، مگر مجھے قرار آ ہی نہ رہا تھا۔ وجہ کو فون میں خود کر ہی نہ سکتی تھی کہ اس نے منع کر دیا تھا۔

”لیکن وجہ یہ کیا بات ہوئی۔ میں تمہیں فون کیوں نہ کروں؟“ میں نے بڑے لاڈ سے خفا ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

”تمہیں کیا خبر! باہر میں کہاں پر ہوں، جب تمہارا فون آئے، یار دوستوں میں ہوں، کسی دفتر میں ہوں، کسی وکیل کے پاس بیٹھا ہوں۔“ اس نے مجھے آرام سے جواب دے دیا۔

”لہذا میں جب بھی فارغ ہوں گا، تمہیں خود ہی فون کر لوں گا اور خود ہی منبج کرتا ہوں گا۔“

”وجہ! میں بہت اداس ہو جاؤں گی تمہارے بغیر وقت کیسے گزاروں گی؟“ میں اسے جلدی سے والپس آنے پر اکسار ہی تھی۔

”یار! اب کیا ہم دونوں ہر وقت ساتھ رہیں گے؟“ اس نے نرمی سے ہی یہ بات کہی تھی، مگر مجھے جھپتی ہو محسوس ہوئی۔

”وجہ! یہ کیا بات کی تم نے۔ ہم دونوں نے تو عمر بھر ساتھ رہنا ہے۔“ میں اس کی بات کا مطلب جاننا چاہتی تھی۔

”بھئی وہ تو رہیں گے ہی، میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ مجھے اور بھی تو کام کرنے ہیں، وہ کیا کہتے ہیں، ہر وقت تو تمہارے گودے سے لگ کر نہیں بیٹھ سکتا۔“ وہ ہنسے ہوئے کہہ رہا تھا، مگر مجھے سکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں پھر چپ ہو گئی اور میں نے اس کے جانے تک کوئی سوال نہ کیا۔

”اوئے کڑیئے!“ جب وہ جا رہا تھا تو میری طرف اپنی پانہیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے میں نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا اور اس کا بیک خوا خواہ درست کرتی رہی۔

”کمال ہے یار! میں جا رہا ہوں اور تم مزے سے منہ پھیرے بیٹھی ہو۔“ اب وہ میرے ہاتھ سے بیک لے کر ناراضی سے بولا۔

”تو کیا ہر وقت سینے سے چپکی رہوں۔ اور بھی کام ہوتے ہیں عورتوں کو؟“ میں نے اسی کے انداز میں ایسی کو چڑانے کو کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”جی خوش کیا اسی سوئی اے۔“ اس نے مجھے کھینچ کے اپنے ساتھ لگا لیا اور پیار سے

بولاً۔

”اوہ پاگل لڑکی! تم تو میری جان ہو، سنو! خود محسوس کرو۔“ اس نے میرا سر اپنے دھک دھک کرتے دل پر لگا دیا۔

”ڈنٹش! ڈنٹش کی آوازیں آرہی ہیں نا؟“ اب وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”محبت کی ہے میں نے بیوی بنایا ہے اپنی عمر بھر یہاں اس کے سنگھاسن پر بٹھائے رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔“ اس نے اپنے سینے پر ٹھیک دل کی جگہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”اور وہ جو اس سنگھاسن کے ارد گرد کا مجمع ہے؟“ میں نے شرارت سے پوچھا۔

”وہ تو چھوٹی موٹی کنیزیں ہیں بے چاری، اور کچھ نہیں۔“ وہ بھی ڈھٹائی سے بولا۔ اور ہم دونوں ہنس دیے۔

”دیری ٹیک کیئر آف یور سیلف۔ میں آؤں تو مجھے پہلے سے زیادہ فریش لگو۔“ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور باہر گاڑی تک لے آیا۔

”اچھا رب راکھا۔“ اس نے میرا ہاتھ زور سے دبا کر چھوڑ دیا اور پھر آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا کر گاڑی میں بیٹھا۔ رب راکھا کہنے کے بعد اس نے مجھے پلٹ کر نہ دیکھا تھا، حالانکہ میں کافی دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی تھی۔



ابھی ابھی اس کا ایک بے حد خوب صورت مسج آیا تھا۔ جسے پڑھ کر میرا دل اور بھی اداس ہو گیا تھا۔ میں نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی میں آگئی اور اسے بے ساختہ ہی کھول دیا۔ حالانکہ مجھے وجہ نے سختی سے منع کیا تھا کہ رات کو کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے سوؤں، بلاوجہ باہر نہ نکلوں اور شموں کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں شموں پہلی دو راتیں تو میرے ساتھ ہی رہی، وہ نیچے قالین پر چادر ڈال کر سو جاتی تھی۔ مگر آج اسے بخار تھا۔ میں نے خود منع کر دیا تھا اس لیے وہ حویلی کے پچھواڑے والے سروٹ کو اڑ میں ہی تھی، جہاں صرف شموں کا کوٹھانہ تھا، بلکہ دس، پندرہ چھوٹے چھوٹے گھرتے، جو اس حویلی کے ملازمین کے تھے۔

رات کے ایک بجے کا وقت ہونے کو تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، مجھے یہ ایئر کنڈیشنڈ سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ جی چاہا اپنے کمرے کے پچھلے میز پر چلی جاؤں۔ رات

یوں بھی چاندنی تھی۔ میں کھڑکی میں کھڑی آسان کو ہلکنے لگی۔ کھڑکی سے آسان کو تکتا میرا پرانا مشغلہ تھا۔

اوپر بہت اوپر ایک لامحدود..... نیکراں..... نیلی چھت..... جس کا کوئی ستون نہیں، اور پھر بھی یہ چھت تھی ہوئی ہے، اور اتنی بلند ہے کہ ہزاروں فٹ اونچے پہاڑ بھی اس کے تلے ذرے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے دل میں پھر آج میری دہلی ہوئی خواہش سلگنے لگی، جی چاہا میرے بازو پر بن جائیں اور میں اڑتی چلی جاؤں، اوپر آسان کی طرف، اوپر..... اوپر اور بہت ہی اوپر..... یہاں تک کہ میں اس نیلی چھت کو چھو لوں۔

میں نے اپنے کمرے کے اس چھوٹے دروازے کو کھولا اور ٹیس پر نکل آئی، کھلی فضا ٹھنڈی اور پر کیف ہوا اور روشن آسان۔

مجھے لگا ایک سحر زدگی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنے دونوں بازوؤں کو کھولا اور آسان کی طرف منہ اٹھائے کھڑی ہو گئی۔ میرے پیچ پیروں میں تازہ آئینہ بھر رہی تھی اور مجھے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور میرا دماغ، میرے محسوسات، میرے اعصاب سے نکل کر اس نیلی چھت کے سحر کی طرف محو پرواز ہو گئے، میں کتنے لمبے، کتنے ہل، یا کتنی دیر اس طرح کھڑی رہی مجھے اس کا احساس نہ تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میں کسی اور ہی دنیا میں ہوں، میں نے اپنا سارا دھیان باندھا اور وجیہ کا تصور نقطے پر رکھ لیا۔ میں اسے اپنے تخیل سے باہر محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں مجھے اپنے قریب اس کے قدموں کی ہلکی اور دہلی دہلی سی چاپ محسوس ہونے لگی۔

”وجیہ! میرے لیوں سے بے ساختہ نکلا۔

”دلنشین!“ ایک نرم و گداز سی سرگوشی میرے کانوں کی لوؤں کو چھونے لگی اور دو بازو میری کمر کے گرد حائل ہو گئے۔

”دلنشین!“ کوئی مجھے پیچ چھو رہا تھا۔ مس کر رہا تھا اپنے ہاتھوں کو میری گردن سے اور مجھے اپنے ساتھ لگائے کھڑا تھا۔

”وجیہ!“ میرے فضا میں پھیلے ہوئے بازو نیچے گرے۔ میں اپنے تخیل کے باوجود کو چھو کر یقین کرنا چاہتی تھی کہ ہے یا نہیں۔

”دلنشین!“

”دلنشین! آئی..... لو..... یو۔“ میں کسی کے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں تھی۔  
 ”کک..... کک..... کون۔“ میں تڑپ کر پرے ہٹی وہ میرا تخیل ہرگز نہ تھا، بلکہ سچ  
 سچ کوئی تھا۔

”وجہ نہیں..... وجہ جیسا۔“

”اصل نہیں..... نقل.....“

”چھوڑو..... مجھے چھوڑو پلیز۔“ میرا دم اس کی سخت گرفت میں گھٹ رہا تھا۔ اس سے قبل  
 کہ میرے حلق سے ایک چیخ بلند ہوتی، اس نے میرے لیوں پر اپنا مضبوط ہاتھ ایک شکنجے کی طرح  
 کس دیا۔  
 ”ت..... ے..... م..... و..... و..... ر۔“ میں ایک لمحے میں سر سے پاؤں تک پسینے میں  
 شرابور ہو گئی۔

ہاں..... وہ تیسرے ہی تھا۔

”دلنشین!“ وہ ڈھٹائی سے مجھے دبوچے کھڑا تھا۔

”تم..... چھوڑو مجھے۔“ میں نے اپنے پورے زور سے اسے پرے دھکیلا۔

”تم..... تم یہاں اور اس طرح؟“ میں اپنے وجود کو اپنے آپ میں چھپانے کی کوشش  
 کر رہی تھی جو ابھی بھی اس غیبیٹ کی ہانہوں میں تھا۔  
 ”ہاں میں اور یہاں۔“ وہ بے شرمی سے مسکرایا اور دوبارہ میرے قریب آنے کی کوشش  
 کرنے لگا۔

”خبردار! میرے نزدیک مت آنا۔“ میں بری طرح سے خوف زدہ تھی۔

”ارے دلنشین بھر جائی! تم بھی نا، بڑی ہی ڈر پوک ہو۔“ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو  
 سے تھاما اور گھسینا ہوا اندر کرے میں لے گیا۔

”دیکھو! دیکھو تمہی! یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ میں شور مچا دوں گی۔“ میں خوف اور  
 شرمندگی سے قرقر کر رہی تھی۔

”کیا بھر جائی! شور مچا دوں گی۔“ اس نے میرے نقل اتاری اور میرے کمرے کا پچھلا  
 دروازہ بند کر کے چٹنی چڑھانے لگا۔

”تیسور..... جاؤ یہاں سے..... ورنہ۔“ میں نے سینٹر ٹیبل پر پڑی فروٹ کی ٹوکری سے

جھری اٹھالی۔ مجھے اس وقت اپنے بچاؤ کے لیے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔  
 ”افو! کیا بد تمیزی ہے اور کیا فلمی ڈائلاگ اور پھویشن۔“ اس نے ایک دم سے جھری  
 میرے ہاتھ سے جمیٹ لی اور مجھے نہایت بد تمیزی سے صوفے پر دھکیل دیا۔  
 ”لگتا ہے آپ فلمیں بہت دیکھتی ہو۔“ اب اس کے چہرے پر سے وہ لمحہ بھر پہلے والی  
 خباثت ہٹ چکی تھی اور غصے کی کئی گہری لکیریں اس کی پیشانی پر نمایاں تھیں۔  
 ”تم.... تم جاؤ یہاں سے۔“ میں رونے کو تھی اس لمحے مجھے اپنا آپ بے حد کمزور اور  
 حقیر دکھائی دے رہا تھا۔

”جار ہا ہوں.... زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو میں تمہارے ساتھ ایک  
 کپ کافی پینے آیا تھا۔ مجھے نیند نہ آ رہی تھی سو چاؤ را کپ شپ ہو جائے۔ یہاں آ کر دیکھا تو آپ  
 جذباتی کیفیت میں وجیہ! وجیہ! پکار رہی تھیں۔ بس میں نے ذرا شرارت کر لی دیکھوں تم بھاجی سے  
 کتنی محبت کرتی ہو۔ تم اسے مس کر رہی تھیں میں نے سوچا ذرا میں ہی کمپنی دے دوں۔“ وہ بڑی ہی  
 بے حیائی سے کہہ رہا تھا اسے اپنی اس ذلیل حرکت پر ذرہ برابر بھی شرمندگی نہ تھی۔  
 ”میں نے کہا تم یہاں سے جاؤ پلیز۔“ میں نے اپنا پورا زور لگا کے چیخا چاہا، کیونکہ  
 میرے اعصاب اس وقت میرے حواس کا ساتھ نہ دے رہے تھے اور میرا وجود برف ہوا جا رہا تھا۔  
 ”جار ہا ہوں جار ہا ہوں زیادہ جیجومت۔“ اس نے میرے سامنے پڑی اس پھلوں کی  
 ٹوکری میں سے ایک سیب اٹھا لے ہوئے بڑے ہی آرام سے کہا۔  
 ”اور ہاں.... بھاجی کو یہ بات اپنے اس فلمی انداز میں بتانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ؟“ وہ  
 جاتا جاتا پھر کا اور بڑے ہی عجیب مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ورنہ وہ بہت نہیں گے اور تمہیں پاگل سمجھیں گے۔“ اس نے اپنی ادھوری بات کو پورا  
 کیا اور باہر نکل گیا۔

میں بھلی کی تیزی سے اٹھی اور میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے لاک کیا اور  
 سینئر نیل کھینچ کر مزید اس کے آگے کر دی۔ یہ سب کچھ ایسا آنا فانا ہو گیا تھا کہ مجھے سمجھ ہی نہ آ سکی کہ  
 میرے ساتھ کیسے اور کیوں ہو گیا۔ اس وقت مجھے کمرے کی ہر چیز سے خوف آ رہا تھا۔ اور اپنے بے  
 بس ہونے پر روتا۔

”وجیہ! وجیہ!“ میں وہیں میز کے ساتھ زمین پر ڈھسے گئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں چلا

چلا کر روؤں جنہیں ماروں اور اس غمیٹ آدمی کا مکروہ چہرہ سب کے سامنے بے نقاب کر دوں۔  
وہ بدنیت تھا۔ اس کی آنکھیں اس کے اندر کی غلاطی کی غماز تھیں۔ جب وہ مجھے اپنی  
بانہوں میں بچھنے میرے چہرے کو تک رہا تھا۔  
”جھی.....“ مجھے کھن آگئی۔

”میرا وجود ایک غیر..... ایک نامحرم کے ساتھ..... تھو.....“  
اس وقت مجھے اپنا آپ بھی غلط لگ رہا تھا۔

وجیہ کے سوا کسی اور نے مجھے وجیہ ہی کے انداز میں چھو لیا تھا..... اف..... میرے ساتھ  
یہ کیا ہو گیا تھا۔ کتنی غیر محفوظ تھی میں اپنے ہی گھر بلکہ اپنے ہی کمرے میں۔ اگر..... اگر میری ناموس  
کی حرمت پر..... نہیں، نہیں۔ ایک سردلہر نے میری ریزہ کی ہڈی کو سنسنا دیا۔  
”اس کی یہ جرأت اتنی ہمت آخر اس نے مجھے سمجھا کیا تھا؟ کیا سوچ کر اس نے اس  
قدر کہی حرکت کی؟“ میرا رواں رواں جل رہا تھا۔ مجھے اس وقت لگ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں  
اس میں سما جاؤں۔

”وجیہ! تم آ جاؤ..... پلیز ابھی آ جاؤ۔“ میں بے بسی سے رونے لگی۔

”میں..... میں اسے بتاتی ہوں۔ اس سے کہتی ہوں کہ وہ آ جائے، ابھی آ جائے، مجھے  
بہت ڈر لگ رہا ہے، میں یہاں نہیں رہوں گی۔“ میرا دماغ بے شمار سوچوں سے پک رہا تھا۔ میں نے  
قریب پڑا موبائل فون اٹھایا اور وجیہ کا نمبر ملا لیا۔ میری حالت اس وقت ناقابل بیان حد تک بری  
تھی۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے، کچھ دیر بعد دوبارہ کوشش کریں۔“ دوسری جانب  
سے آنے والی کمپیوٹر کی آواز نے مجھے مزید بے بس کر دیا، تنہا اور غیر محفوظ ہونے کا احساس مجھ پر  
رقت طاری کر گیا۔ میرے لبوں سے نکلتی وجیہ! وجیہ! کی آوازیں۔

ماما! ماما! پکارنے لگیں..... اور پھر میں پاگلوں کی طرح انہیں یاد کر کے روتی رہی۔ اس  
وقت میرا جی شدت سے چاہا کہ یہاں سے اس کمرے کا دروازہ کھولوں اور بھاگ جاؤں، اتنا تیز  
بھاگوں، اتنا تیز کہ کوئی مجھے پکڑ نہ سکے اور میں اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

میں ہانتی ہوئی جا کر اپنی ماں کے سینے سے لگ جاؤں۔ ان کی گود میں چھپ جاؤں،  
وہاں جہاں پھر ایسی ہوس زدہ بے حیا اور بے غیرت آنکھیں مجھے دوبارہ نہ دیکھ سکیں۔ حفاظت کے



اس مضبوط حصار میں پھر کسی کے کردہ ہاتھ مجھے نہ چھو سکیں۔ اور کسی شیطان کی نیت مجھے اپنی بھوک کا نوالہ نہ سمجھ سکے۔

”ماما! میری ماما!“ میں ہچکیاں لیے جا رہی تھی، اور میرا کاغذ، لرزتا وجود خود پر لگے ان انگلیوں کے نشانات کو چھپانے سے بالکل قاصر تھا جو کسی کے اندر کی غلاطت میں سنی ہوئی تھیں۔  
عصمہ سے دلنشین ہونے کا جرمانہ مجھ پر عائد ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے پاکباز وجود میں سے خود اپنی شناخت کو رد کر دیا تھا۔ اس کا تاوان تو مجھے اب دینا ہی تھا۔

میں اب دلنشین تھی۔ کسی کا بھی دل مجھ پر آتا، اور کسی بھی نیت سے آتا، یہ اب ممکن تھا۔  
لہذا ناممکن کی فہمیل سے باہر اب میں ایک ہر اس عورت تھی۔ جس کی ناموس، ردا اب کانٹوں کی جھاڑیوں پر تھی۔

”ماما! میری ماما!“ میں جانے کب تک سسکتی رہی۔ میری نوک زباں سے لے کر میرے لبو کے آخری قطرے تک میری ماں میرے اندر سرایت کرتی رہی، اور میں پھر بھی اسے چھو لینے کو ترستی رہی، مچلتی رہی۔



اگلی صبح جب شموں نے آ کے میرے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا تو میں وہیں پر دروازے کے آگے بیٹھی تھی۔

”کک..... کون؟“ میرے وجود کے خالی کوٹھے سے ایک اجنبی آواز نکلی۔

”بی بی جی! میں ہوں شموں؟“ دوسری طرف شموں تھی، میں نے بمشکل اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور میز کھسکا کر ایک طرف کی۔

”سلام بی بی!“ وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ مجھے چپ پا کر وہ اور شاید میرے چہرے پر رات بھر کے آنسوؤں کی واضح لکیریں دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”کیا ہوا آپ کو؟“ اس نے فوراً آگے بڑھ کر مجھے تھاما، کیونکہ مجھ سے اس وقت اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں اس کے سہارے کے ساتھ اپنے بیڈ تک آگئی۔

”ارے! آپ کو تو بخار ہے بہت تیز۔“ شموں نے میرے پاؤں اوپر کر کے مجھے بستر پر

لٹایا اور میرے سر ہانے بیٹھ کر میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

”شموں! مجھے چکر آرہے ہیں۔“ میں نے اپنا گھومتا ہوا سر تھامتے ہوئے کہا، وہ میرا سر اپنے زمر زمر ہاتھوں سے دبانے لگی۔

”شموں! شموں! اب تم کہیں مت جانا، میرے پاس ہی رہنا۔“ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کے مت کرنی شروع کر دی۔

”کیا.... کیا ہو گیا آپ کو..... اتنی ڈری ہوئی کیوں ہیں؟“ وہ میری ایسی حالت کو دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔

”بس تم کہیں مت جانا، ایک لمحے کو بھی کہیں مت جانا۔“ میری آنکھیں بری طرح سے دکھ رہی تھیں اور بند ہوئی جا رہی تھیں۔

”میں تو یہیں پر ہوں، کہیں نہیں جاؤں گی، آپ..... آپ آرام کریں، میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

”نن..... نہیں..... نہیں جاؤ کہیں..... میں نے چائے نہیں پینی۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اچھا نہیں جاتی۔“ وہ مسکرا کر بولی اور میرا سر دبانے لگی۔

”بھر جانی!“ کچھ ہی دیر کے بعد صوبی مجھے آوازیں دیتی ہوئی آگئی۔

”ارے یہ کیا۔ آپ تو ابھی تک سو رہی ہو؟“ اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بی بی جی کو بخار ہے۔“ میرے بولنے سے قبل ہی شموں نے بتا دیا۔

”بخار.....“ وہ پریشان ہو کر مجھے چھونے لگی۔

”اوئی میرے اللہ! اتنا تیز؟“ میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کے اچھل پڑی۔

”نی مر جانی اے..... ڈاکٹر کو فون نہیں کیا تو نے؟“ وہ شموں پر غصہ کرنے لگی۔

”میں تو کر رہی تھی جی انہوں نے ہی منع کر دیا۔“ وہ بے چاری سہم کر بولی۔

”پوچھ لیس دلشیں بی بی سے؟“ صوبی کو اپنی طرف گھورتا پا کر وہ مجھے حمایتی انداز میں

دیکھتی ہوئی بولی۔

”میں نے ہی منع کیا تھا۔ ڈاکٹر کیا کرے گا اگر معمولی سا بخار ہے اتر جائے گا۔“ میں

نے شموں کی حمایت کی۔

”اسے تو بکواس کرنے کی عادت ہے۔ میں خود کرتی ہوں فون۔“ وہ میرے منع کرنے کے باوجود اٹھی اور اس نے ڈاکٹر کو فون کیا۔

”جمل اب جا یہاں سے اور جا کر کوئی چائے بسکٹ وغیرہ لے کر آ۔ بھر جائی کے لیے ڈاکٹر آ کر انجکشن لگائے گا تو کیا خالی پیٹ لگائے گا؟“ اس نے شموں کو میرے پاس سے اٹھا کر چائے بنانے بھیجا اور خود میرا سر دبانے لگی۔

”نہ..... نہ صنوبی! تم مت دباؤ۔“ میں نے پیار سے اسے روکا۔

”واہ جی! میرے کیا ہاتھوں پر کانٹے لگے ہوئے ہیں۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔

”نہیں یہ تو پھول ہیں۔ مोजے کے سفید پھول۔“ میں نے اس کے ہاتھ تھام کے اپنے

گالوں سے لگا لیے۔ ”تو وہ شرمگنی۔“

”تم بھی بھر جائی! بڑی خراب ہو۔“

”اور تم بہت پیاری ہو۔“ میں نے اس کے گلابی پڑتے گالوں کو دیکھ کر کہا اور ہم دونوں

مسکرا دیں۔

”بھر جائی! آج تو تمہیں خوب آگے بڑھ کر کام کرنا تھا اور آج ہی تم پیار ہو گئی ہو۔“ وہ

گلابی سے سرخ ہوتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”آج کیا ہے؟“ میں پریشان ہو گئی اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو مارے فضاہت کے اٹھنا مشکل ہو

گیا۔

”آج وہ آرہے ہیں نا؟“ اس کا پورا چہرہ گلاب بن چکا تھا۔

”کون..... صنوبی! کون آرہا ہے آج؟“ اب تو میں اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

”وہ تم لوگ سیر کو گئے ہوئے تھے نا، اس لیے تمہیں خبر نہیں، بھائی کو تو آتے ہی وہ مل گئے

تھے تم کو شاید پتا نہ چل سکا ہو۔“ وہ اصل بات بتانے کے بجائے تمہید باندھ رہی تھی۔

”صنوبی! مجھے واقعی کچھ بھی نہیں پتا تم بتاؤ پلیز۔“ مجھے وہ جاننے کی جلدی تھی جو واقعی

مجھے کسی نے نہ بتایا تھا۔

”بھر جائی! مراد اور شہاب ماموں آرہے ہیں آج۔“

”مراد.....“ میں نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے زیر لب کہا۔

”ہائے بھر جائی! تم بھی کمال کرتی ہو مراد کو بھول گئی ہو۔ آپ کو بتایا نہیں تھا کہ مراد

شہاب ماموں کا بیٹا ہے وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔“ اس نے منہ بنا کر مجھے یاد کرایا۔

”اوہ..... سوری..... سوری! مجھے یاد آگیا۔“ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ جوانی زویا کا منگیتر بھی ہے وہی نا؟“ میں نے بات آگے بڑھائی۔

”وہ بچپن کی منگنی ہے۔ خواہواہ ہی گھر والوں نے زبردستی کر دی تھی۔“ وہ بے زاری سے

بولی، مجھے اس کے یوں کیے گئے رد عمل پر بڑی حیرت ہوئی۔

”کیا مطلب زبردستی؟“ اب میں پریشان ہو رہی تھی۔

”زویا کی ضد ہے ورنہ وہ تو زویا کو پسند ہی نہیں کرتا ہے۔ کہاں وہ اتنا پڑھا لکھا اور میں

جوان (شیر جیسا) اور کہاں زویا..... یہ اتنی سی۔“ اس نے زویا کے چھوٹے قد اور کم تعلیم پر سیدھی

سیدھی چوٹ کی۔ جبکہ مراد کی تعریف کرتے ہوئے اس کے چہرے پر قوس و قزح کے سبھی رنگ کھل

رہے تھے۔ میرا دل ایک نجانے سے خوف سے لرز گیا۔

”بی بی جی! ڈاکٹر صاحب آگئے۔“ شموں چائے کی کڑائی اور ڈاکٹر کے آنے کی خبر ایک

ساتھ ہی لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

”تو کتنے مر گئی تھی اتنی دیر لگا کے چائے لائی ہے۔“ وہ پھر شموں پر غصہ کرنے لگیں۔

”بلا..... چل بلا پہلے ڈاکٹر کو۔“ اس نے اپنے سر پر دوپٹہ لے کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے

کہا۔

”جی.....“ شموں بے چاری مر اساً” جی“ کہہ کر ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ ڈاکٹر نے آکر

چیک اپ کیا۔

”بخار بہت تیز ہے۔“ وہ تھرمائیٹر پر ایک سو تین بخار دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب ان کے سر میں بہت درد ہے اور چکر بھی آرہے ہیں۔“ میرے بجائے

شموں نے میری کیفیت بتائی۔ میری حالت تو اس وقت بھی بڑی خراب تھی مجھ سے ٹپک لگا کر بیٹھنا

اور صوبلی کی باتیں سننا بھی بے حد محال تھا۔ زبان خشک ہو کر اکڑ رہی تھی۔

”یہ سب بخار کی تیزی کی وجہ سے بھی ہے اور انہیں کوئی شدید دھن دہاؤ بھی ہے۔“ ڈاکٹر

نے مجھے انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔ پھر دوائیں دے کر شموں کو سمجھایا کہ کس طرح سے خوراک دینی

ہے۔ میری تو آنکھیں آگ ہو رہی تھیں۔ کھل ہی نہ ہیں تھیں۔ میں پھر سے لیٹ گئی۔

”اٹھو بھر جائی! چائے تو پی لو دوائی کھانی ہے۔“ صوبلی نے چائے کا کپ میری طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرادل کسی چیز کو نہیں چاہ رہا۔ تے ہو جائے گی مجھے۔“ میں نے چائے کا کھونٹ بھرتے ہوئے کہا جو مجھے بے حد برا لگا تھا۔ لگتا تھا کہ سب کچھ اندر سے باہر آ جائے گا۔

”پر یہ دوائی نہیں کھاؤ گی تو شام کو کیا کرو گی؟ جب وہ لوگ آئیں گے۔“ وہ مجھے زبردستی ٹیبلٹ دیتے ہوئے بولی۔ میں نے زبردستی وہ گولیاں اپنے مطلق سے اتاریں۔

”اچھا بھر جائی! اب تم آرام کرو میں پھر چکر لگاؤں گی۔“ کچھ ہی دیر کے بعد وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی اور جاتے جاتے شموں کو میرا خیال رکھنے کی ہدایت بھی کر گئی۔

❖ ❖ ❖

شموں مسلسل مجھے دبا رہی تھی میرا سر.... ہاتھ.... پاؤں.... کندھے.... اور اس کے دبانے سے مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں بڑی ہی گداز تھیں۔ جب وہ انہیں ایک خاص انداز سے میرے سر پر رکھ کے ہلکا سا دباتی اور اپنی نرم انگلیاں میری کنپٹیوں پر ہلکے سے پیوست کرتی تو بے حد آرام ملتا۔ اب میرے سر میں بہت معمولی سا درد تھا۔ بخار بھی کافی کم ہو چکا تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا ایک نقاہت میرے روم روم میں رچ گئی ہے۔ جیسے کسی نے میرے جوڑ جوڑ کو پیٹا ہو۔

میں بے دم تھی اور میرادل ایک اندھے کنویں کی طرح خالی تھا۔ جس کے اندر پانی تو نہیں تھا، مگر اس کی مٹی کے ہر مسام میں اتنا جس تھا کہ اگر وہ پھٹتا تو طوفانی ریلا بن جاتا ہے۔

میرے وجود کے وہ حصے جنہیں تیور کی ناپاک انگلیوں نے بری نیت سے چھوا تھا۔ پھوڑا بن کے پک رہے تھے۔ درد کی تیز دھار ٹیسوں نے میرے لہو کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کسی تیز دھار چاقو سے اپنے جسم کی کھال وہاں وہاں سے چھیل ڈالوں جہاں سے اس نے مجھے.... چھی.... تھو۔ میرادل اس کے خلاف نفرت سے متلانے لگا اور میرے سر کا درد پھر سے بڑھ گیا۔

”دلنیش بی بی! آپ سونے کی کوشش کرو۔“ میرے چہرے پر میری اندرونی اذیت کا عکس دیکھ کر شموں نے اپنے ہاتھ میری آنکھوں پر ڈھانک دیئے اس کے ٹھنڈے اور نرم ہاتھ میری جلن پر برف میں بھیکے پھاہوں کی طرح لگے۔

”میرا موبائل دینا شموں!“ میں نے اس سے اپنا موبائل مانگا جسے اس نے فوراً ہی مجھے  
تعمادیا۔

وجہ کے تین مسج آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے بہت یاد کر رہا تھا۔ وہ میرے بغیر زیادہ دیر  
نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے پہلو سے زیادہ نرمی اسے اب کہیں اور نہ ملتی تھی۔ اس لیے وہ واپس آ رہا  
تھا۔ شام تک پہنچ جانے کا پیغام تھا۔ میں نے موبائل پر ایک پیغام لکھا اور اسے جواب دے دیا۔ وہ  
چار دنوں کے بعد آ رہا تھا۔ کل تک جو میرا اک اک لمحہ اس کی یاد سے اور اداسی سے بھرا ہوا تھا اور  
مجھے اس کے لوٹ آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ آج جانے کیوں مجھے یہ پیغام پڑھ کر ذرا بھی خوشی  
نہ ہوئی اور میرا دل مزید گم سم سا ہو گیا۔

”وجہ شام تک پہنچ جائے گا۔“ میں نے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے شموں کو بتایا۔  
”ٹھیک ہے، میں ان کے لیے کھانا بنا لیتی ہوں۔ اور ان کے غسل کی تیاری کر دیتی ہوں“  
آپ کے کپڑے بھی نکال دوں، آپ بھی نہالو۔ ذرا فریش ہو جاؤ گی۔“ شموں نے میری طرف  
اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تم جاؤ، میں کچھ دیر تک غسل کروں گی۔“ میں نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔  
”ننن.... نہیں شموں! سنو۔“ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا، جیسے ہی میں نے آنکھیں  
موندیں میری پلکوں تلے تیور کی وہ خبیث مسکراہٹ آگئی اور میں بری طرح ڈر گئی۔  
”اچھا! آپ سو جاؤ کچھ دیر کے لیے میں پہلے کمرے کے کام کر لیتی ہوں۔“ شموں نے  
پیارے کہا اور جا کر وجہ کی وارڈ روب دیکھنے لگی۔ اور میں اپنے الجھے ہوئے دماغ کی گرہیں کھولنے  
لگی۔

”ایسے تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ میں نے اپنے غم زدہ دل پر قابو پاتے ہوئے اپنی  
سائیکلو تھراپی شروع کی۔

”وجہ آئے گا تو میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔“ میں نے سوچا۔  
”اس سے کیا ہوگا۔ وجہ میرے بات کو مذاق میں سمجھے گا اور فس پڑے گا یہ کہتا ہوا کہ  
تمہی بھی باز نہیں آتا شرارتوں سے، ابھی اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں نا، اس لیے ویسے وہ دل کا  
بہت اچھا ہے۔“

”اچھا.... اف توجہ.... منافق اور عیار کے لیے لفظ اچھا مجھے زہر لگا۔“

”میرے اللہ! میں کیا کروں؟“ مجھے لگا بے بسی پھر مجھ پر طاری ہو رہی ہو۔  
 ”چلو دفع کر دوہ تو دو چار روز میں دفع ہو جائے گا۔“ میں نے خود کو تسلی دی۔  
 ”آہ! مگر پھر بھی؟ اس کے اس سنگین جرم کا کیا؟ جو اس نے کیا؟ اور میری اذیت کا کیا؟  
 جس نے مجھے خود اپنی نظروں میں گرا دیا ہے؟“ مجھے بالکل بھی قرار نہ آ رہا تھا۔  
 ”اس نے مجھے جنسی طور پر ہراساں کیا تھا اور یہ ایک سنگین اور ناقابل معافی جرم تھا۔  
 میری ناموس کی طرف اس کی گندی نگاہیں ہی نہیں بلکہ ہاتھ بھی بڑھے تھے۔  
 میں.... میں اسے کبھی معاف نہ کروں گی۔“ مجھے لگا میں اس وقت کانٹوں کے بستر پر  
 ہوں۔

”اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہارے ساتھ کچھ اور نہیں ہوا، ورنہ خدا ناخواستہ....“ میرے  
 روکتے کھڑے ہو گئے اور میری ریڑھ کی ہڈی برف ہو گئی۔  
 ”لیکن وہ میرے ٹیس پر آیا کیسے؟“ اب میں حقائق پر غور کر رہی تھی جو کہ ہرگز بھی  
 اچھے نہ تھے۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد تھا اور  
 میرے ٹیس پر آنے کا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ سوائے اس دروازے کے جو میرے کمرے سے باہر  
 کی طرف کھلتا تھا۔  
 ”یعنی؟“ میری روح تک خشک ہونے لگی۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس کے پاس میرے کمرے کے لاک کی دوسری چابی تھی۔ لیکن  
 دوسری چابی تو وجیہ کے پاس رہتی ہے ہر وقت کہ جب وہ رات کو لیٹ آتا ہے تو مجھے ڈسٹرب نہیں  
 کرتا، بلکہ وہ خود ہی لاک کھول کر اندر آ جاتا ہے۔

”یعنی وجیہ کی چابی؟“ میرے دماغ میں سانپ رینگنے لگے۔  
 ”اس کا مطلب ہے وہ عیاش اور عیار ہونے کے ساتھ ساتھ چور بھی ہے۔“ وہ مجھے اور  
 بھی خطرناک لگنے لگا۔

”میں.... میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ وجیہ سے کہوں گی ہم لوگ لاہور شفٹ ہو  
 جاتے ہیں۔“ میں نے خود کو تسلی دینے کو سوچا۔

”مگر وہ اپنی حویلی.... اپنی زمینیں اور اپنا گھر چھوڑ کر مستقل شہر نہیں جائے گا۔“ مجھے خود  
 ہی اپنی سوچ کی تردید کرنی پڑی، کیونکہ میں اس حقیقت سے واقف تھی۔

”تو پھر؟ پھر میں کیا کروں گی۔“ مجھے اپنی بے بسی پر پھر سے رونا آنے لگا۔ اس وقت غم و غصے کی شدت سے میری جو حالت تھی وہ صرف وہی لڑکی محسوس کر سکتی تھی جسے Sexual Harassment کی آزمائش سے گزرنا پڑا ہو۔

”اللہ تعالیٰ کسی بھی آزمائش سے دوچار نہ کرے۔“ میری تڑپتی ہوئی روح نے دعا کی اور میرے جسم کے ریٹھے ریٹھے سے آمین نکلا۔ جو اس وقت اسی آزمائش کی سولی پر لٹکا ہوا تھا۔



شام کو گھر پر ایک بھرپور دعوت تھی۔ وجہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی پہنچا تھا۔ میں نے اس کے آنے تک خود کو کافی حد تک نارمل کر لیا تھا۔ میں یہ اتنی بڑی اور گنیمبات اس کے ساتھ آرام سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اپنی ماما کی ایک بات یاد آگئی تھی وہ مجھے سمجھایا کرتی تھیں۔

”شادی کے بعد سب سے اہم نقطہ جو ایک بیوی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے وہ یہ ہے کہ کبھی بھی اپنے شوہر کو گھر آتے ہی کوئی مسئلہ یا بری خبر نہ سناؤ بلکہ اگر کبھی کوئی بہت ایمر جنسی کی اطلاع بھی ہو تو اسے کچھ دیر بعد..... بہت آرام سے حکمت سے بتانی چاہیے ورنہ ایک تو اس بات کے اثرات مزید برے سامنے آ سکتے ہیں دوسرا شوہر کی تھکن جو اسے گھر سے باہر کاموں میں ملی ہوتی ہے دگنا ہو کر غصے میں بھی بدل سکتی ہے۔“ میں نے اسی حکمت کے پیش نظر خود پر قابو پا کر فی الوقت اس صدمے سے خود کو باہر نکالنے کی کوشش کی اور وجیہ کا استقبال خوشدلی سے کیا۔

”ارے تم تو بہت گرم ہو اور یہ تمہاری صورت کو کیا ہوا؟“ مجھے گلے لگاتے ہی اس نے میری کیفیت کو پالیا تھا۔

”بس وہ ذرا بخار ہو گیا تھا۔“ میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ذرا بخار..... یہ بخار ہے، تپ رہی ہو آگ کی طرح سے اور ذرا اپنی حالت تو دیکھو؟“ دلنیش میں صرف چار دن باہر رہا ہوں اور تم برسوں کی بیمار لگ رہی ہو۔“ وہ بے حد پریشان ہو گیا تھا اور بڑی محبت سے مجھے ڈانٹ رہا تھا۔

”ڈاکٹر کو بلا لیا تھا؟“

”ہاں ڈاکٹر تو آیا تھا، دوا بھی لی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”نکما ہے وہ ڈاکٹر جس کی دوا کے باوجود بخار باقی ہے۔ یہی کہاں کہاں تھا کسی اچھے اسپیشلسٹ کے پاس لے جاتا۔“ وہ تیمور پر ناراض ہو



رہا تھا۔

”میں تو یہیں تھا بھائی! مگر مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں، کوئی بتاتا تو سہی اور یہ بھرجائی! یہ تو مجھے دیے ہی غیر سمجھتی ہے۔“

وہ میرے کمرے میں آ رہا تھا وجیہ کی بات سن کر بولا، وہ مجھے مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اس وقت میری جان کھینچ کر گویا میری آنکھوں میں ایک گئی تھی۔ نفرت کا اک الاؤ میری نس نس میں ایلنے لگا تھا۔ جی چاہا آگے بڑھ کے ایک زوردار چائنا اس مکروہ شخص کے منہ پر دے ماروں۔

”لگتا ہے بھرجائی! کچھ تو بخار ہے اور کچھ ٹینشن میں بھی ہو، کیا ہوا؟“ اس نے بڑی ہی ڈھٹائی سے میرے سامنے آ کر کہا، اور لفظ.... کیا ہوا۔ ادا کرتے ہوئے بڑی بے شری سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”ٹینشن! کیسی ٹینشن، کیا ہوا، کیا ہوا، لٹنیں؟“ وجیہ تو بہت ہی پریشان ہو گیا اور مجھے اپنی طرف گھماتا ہوا سر سے پاؤں تک یوں دیکھنے لگا جیسے میری ٹینشن کی وجہ میرے ماتھے پر لکھی ہو کی۔

”مجھے تو کوئی ٹینشن نہیں ہے، بس ذرا بخار ہے۔“ میں نے وجیہ سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”چلو شکر ہے کہ آپ کو ٹینشن نہیں ہے ورنہ تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہیں آپ....“ اس نے پھر مسکرا کر کہا اس کا انداز بے حد تشکیک آمیز تھا اور وہ ذومعنی جملوں میں مجھے کچھ باد کر رہا تھا۔ کیا؟ یہ صرف میں جانتی تھی یا وہ خود.....

”بھائی! اب چلیں بھی آپ تو آتے ہی باتیں کرنے لگے۔ ساری رات پڑی ہے بھرجا جی کا حال چال پوچھنے کے لیے۔ کرتے رہنا پیار بھری باتیں۔“ ایک دم سے وہ بے غیرتی پر اتر آیا اور کھلی زبان سے کہنے لگا۔

”ٹھہر جا یا راد! دیکھتا نہیں ہے دلنشین سچ بچا ہمارا ہے۔“ وجیہ کو اس وقت تیمور کا لاڈ اچھانہ

لگا۔

”بھائی! ایک کاٹنا ہے سب آگئے ہیں۔ چلو نا؟“ صنوبی بھی آ کر شور مچانے لگی تھی۔

”چلو وجیہ! میں بہتر ہوں۔“ میں نے وجیہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے چلنے کو کہا۔

”تم رہنے دو۔ یہاں آرام کرو تمہاری طبیعت خراب ہے۔“ وہ مجھے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

”ارے بھر جائی! بیٹھی رہنا وہاں صوفے پر.... یہاں اکیلی گھبراؤ گی۔ خواخواہ کے برے خیال پریشان کریں گے۔“ تیمور پھر طنز سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ مجھے مسلسل ہراساں کر رہا تھا۔ پہلے اس کا نشانہ میرے جسم کی طرف تھا اور اب میرے ذہن کو مجروح کر رہا تھا۔

”ہاں بھابی! چلو نا اٹھو..... صنوبی نے میرا بازو تھاما اور مجھے زبردستی بڑے ہال کمرے کی طرف لے گئی۔ وہ وجیہ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ہمارے پیچھے پیچھے ہی تھا وہ اپنے انگلیٹڈ جانے کی باتیں کر رہا تھا کہ کب کی سیٹ کنفرم کروائے۔

”سیٹ بھی کروا لیتا یا! پہلے مامے سے تو بیٹ لے جو تیرا نکاح کرنے کے سر ہوا کھڑا ہے۔“ وجیہ کا موڈ اس وقت اچھا نہ تھا۔ وہ میرے وجہ سے پریشان تھا اور یقیناً بے حد تھکا ہوا بھی تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ کوئی اچھے طریقے سے بات نہ کر رہا تھا۔

”واہ جی واہ! میرا نکاح کیوں؟“ وہ بھی اکڑ کے بولا۔

”وہ کہتے ہیں تم وہاں جا کر خراب ہو جاؤ گے۔ کہیں کسی میم سے شادی نہ کر لو۔ اس لیے نکاح کر کے جاؤ اور پھر افشاں کے کاغذ بنوا کر اسے بھی جلدی بلا لو۔“ وجیہ اسے بتا رہا تھا۔

”جب مراد گیا تھا پڑھنے تو کیا ہم نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ زویا نکاح کر کے جائے۔“ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے مثال پیش کی۔

”اور میں کوئی پاگل ہوں کسی میم سے شادی کروں..... ویسے بھی بھابی! نکاح کرنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہوتی ہے۔“ اس نے بڑے لچر پن سے کہا یہ خیال کیے بغیر کہ اس کی جوان بہن بھی اس کی بات سن رہی ہے۔

”اچھا۔ اچھا کرتے ہیں ان سے بات۔“ وجیہ نے مختصر جواب دے کر بات ختم کی۔ اب ہم لوگ ہال کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔



آج صنوباریہ کی سالگرہ بھی تھی۔ اس کا علم مجھے وہاں ہال میں آ کر ہوا۔ صنوبی صبح بار بار جس سر پرانز کا ذکر کر رہی تھی وہ یہی تھا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ آج اس نے ڈریس بھی بے حد خوب

صورت پہن رکھا تھا۔ سیاہ مون لائٹ کی بڑی ہی اسٹائلش میکس پر خوب صورت میک اور رول کے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ بلاشبہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ وہ پیاری تھی بھی۔ اس کی شباہت وجیہ کے ساتھ تھی۔ خصوصاً گوارنگ اور دراز قد۔ میں اسے تحریری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لگ تو زردیا بھی بہت پیاری رہی تھی۔

آج تو اس نے بھی تیار ہونے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ مارڈرن اور خوب صورت لگنے کے سارے ہی ہنراپنا کر وہ تیار ہوئی تھی۔ آخر کو آج اس کا منگیتر بھی تو اس محفل میں موجود تھا۔ لیکن پھر بھی صنوبی کے سامنے وہ کچھ ماند ہی تھی۔ میں ان دونوں بہنوں کو مقابلتا دیکھ رہی تھی۔ پہلے میں نے کبھی انہیں اس طرح نہ دیکھا تھا۔ مگر آج ایک تو صنوبی کے صبح والے جلے اس وقت میرے ذہن میں محو م رہے تھے۔ جو اس نے اپنی بہن کے لیے ناگواری سے کہے تھے۔ ”ہونہہ! زویا کا بھلا مراد سے کیا جوڑ؟ کہاں مراد اور کہاں وہ؟“ اور دوسرا ان دونوں کے اطوار سے بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں آج ایک دوسرے کی بہنیں نہیں بلکہ شاید حریف ہیں۔

”گڈ ایوننگ بھابی۔“ کسی نے بڑی تہذیب سے مجھے ماڈرن سلام کیا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔

”بھرجائی! یہ مراد ہے اور مراد یہ دلنشین بھرجائی ہے۔“ صنوبی جو اس کے ساتھ بڑی کھڑی تھی ہمارا آپس میں تعارف کروا رہی تھی۔

”السلام علیکم! آپ کیسے ہیں مراد بھائی؟“ میں نے بڑے اخلاق سے جواب دیا، جس پر وہ اعتماد سے بولا۔

”وعلیک السلام بھرجائی! میں اچھا ہوں، بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ وہ مجھے جواب دے کے وجیہ کے گلے لگ گیا۔

”بھرجائی! دیکھنا مراد کتنا خوبصورت ہے؟“ صنوبی نے فوراً جھک کر میرے کان میں کہا۔

”ہاں ماشاء اللہ سے۔“ میں بے دو بارہ ایک نظر سامنے وجیہ کے ساتھ کھڑے مراد پر ڈالی۔ وہ مردانہ وجاہت کی نعمت سے واقعی فیض یاب تھا۔

”صنوبی! او صنوبی! ادھر آ کے کیک کاٹ جلدی سے..... پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔“

زویا نے دور سے ہی آواز دے کر اسے بلایا۔ وہ مجھ سے کم ہی بات کرتی تھی، آج تو ویسے ہی بہت غرے میں تھی۔

”آؤ مراد۔“ صنوبی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتی ہوئی اپنے ساتھ اسٹیج کی طرف لے گئی۔

”آؤ نا بھالا ڈی! تم کیوں یہاں بیٹھ گئے۔“ وجیہ کو میرے ساتھ بیٹھتا دیکھ کر مراد نے اسے بھی بلایا۔

”یار! میں بہت تھک گیا ہوں، تم لوگ انجوائے کرو، یہ سالگرہ والا گرہ کا شوشا مجھے ویسے بھی پسند نہیں۔“ وجیہ نے مسکراتے ہوئے اسے ٹالا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

”لاڈی! کیا بات ہے تو کیوں یہاں بیٹھا ہے۔“ فوراً ہی لاڈی کی اماں زینت بیگم وہاں آگئیں اور مجھے نظر انداز کرتی ہوئی بولیں۔

”اماں! میرے سر میں بڑا درد ہے۔“ وجیہ نے مختصر اُکھا۔

”سر میں درد ہے یا زن مریدی میں آگیا ہے؟“ انہوں نے میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، جیسے میں نے وجیہ کو اٹھنے سے منع کیا ہو۔

”میں نے ایسی دواہیات باتوں سے چڑتا ہوں، پتا ہے نا، پھر بھی کہنے سے باز نہیں آتی۔“ وہ ذرا بدتمیزی سے بولا تو مجھے اچھانہ لگا۔

”اور یہ کیوں بیٹھی ہے یہاں بیگم بن کے۔ اسے پتا نہیں برادری ساری اکٹھی ہے وہاں، سب کیا کہیں گے؟“ انہوں نے وجیہ کے نظر انداز کرتے ہوئے اگلا تیر مجھ پر پھینکا۔

”جی.... جی وہ میری طبیعت خراب تھی۔“ میں شرمندہ سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پتا ہے صبح ڈاکٹر آیا تو تھا۔“ وہ اسی نخوت سے بولیں، اور واپس وہیں چلی گئیں جہاں ایک بہت بڑی میز کے گرد ایک جم غفیر صنوبی کے ایک کاسٹے کا منتظر تھا۔

”آ جاؤ وجیہ!“ میں نے زبردستی وجیہ کو اٹھایا اور ہم دونوں بھی ادھر ہی آ گئے۔

”گڈ مارننگ بھر جانی، افشاں نے بھی مراد کی طرح انگریزی میں سلام کیا۔

”افشاں! بھر جانی ماڈرن نہیں اسلامی ہیں، السلام علیکم کہو۔“ مراد نے شرارت سے کہا۔

”ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا مراد! یہ کیا ان کا تو پورا خاندان ہی اسلامی ہے، تبھی تو اس کی شادی بھی اسلامی طریقے سے کی تھی اس کے ماں باپ نے۔“ سچ مچ کے چار بندوں کے درمیان

کلاچ ہوا تھا۔“ ہتا نہیں آج زینت آنٹی کو کیا ہو گیا تھا، وہ مجھ سے اتنا سخت کیوں پیش آرہی تھیں، ان کی زبان پر آج میرے لیے طنز اور تحارت ہی تھی۔ اتنی بڑی محفل میں اپنا یوں مذاق بننے پر میں تو زمیں میں ہی گر گئی۔

”اماں! وہ میری خواہش تھی اس کے ماں باپ کی نہیں اور تم اس وقت کیا چاہتی ہو، میں یہاں رہوں یا جاؤں اپنے کمرے میں۔“ وجیہ نے میری زرد پڑتی رنگت کو دیکھ کر اپنی ماں کو خود جواب دیا۔ جس پر لکھ بھر کو سب چپ ہو گئے۔

ماحول کو خراب ہوتا دیکھ کر صنوبی نے فوراً ہی ایک پرچھری پھیر دی، اور ہر طرف....  
 ”پہلی برتھ ڈے ٹوپ، پہلی برتھ ڈے ٹوپ۔“ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ صنوبی نے ایک کا ایک ٹکڑا کاٹا اور سب سے پہلے وجیہ کے منہ میں اور پھر میرے منہ میں ڈال دیا۔  
 ”جیتی رہ، لمبی عمر اور خوشیاں نصیب ہوں۔“ غصہ بھول کر وجیہ نے بہن کو پیار سے دعا دی اور اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ اپنی بہنوں سے بہت محبت کرتا تھا۔  
 ”میرا اتھہ بھاجی؟“ اس نے پیار سے اتراتے ہوئے اپنی تھیلی بھائی کے سامنے پھیلا دی۔

”تھہ بھی لایا ہوں، جیون جوگی۔“ وجیہ نے ایک ہلکی چپت اس کے سر پر رسید کی۔  
 ”نی شموں!“ ساتھ ہی اس نے شموں کو آواز دی جو وہیں پرکھڑی تھی۔  
 ”جی وڈے سائیں!“ وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر تھی، اس کے ہاتھ میں دو مٹلیں ڈبے تھے۔ وجیہ نے ایک چھوٹی سی ڈبیا اٹھا کر بہن کے آگے کر دی۔  
 ”اومائی گاڈ؟“ وہ ایک نازک اور نفیس سی ڈائمنڈ رنگ دیکھ کر بے حد خوش ہو گئی اور دوبارہ بھائی کندھے سے لگ گئی۔ وجیہ نے مجھے آنکھ کے اشارہ کیا تو میں نے وہ دوسرا ڈبیا اٹھا کر صنوبی کو تھما دیا۔ اس نے بے تابائی سے ڈبیا کھولا۔ جس میں کیا ہے یہ مجھے بھی خبر نہ تھی۔  
 ”اومائی سویٹ بھابی جان۔“ ڈبے میں ایک لاکٹ سیٹ تھا جو بہت حسین اور قیمتی تھا، وائٹ گولڈ کے نازک سے دل میں ایک ننھا مناسا ڈائمنڈ چمک رہا تھا، یہ ہو بہو یسا ہی لاکٹ تھا جیسا کچھ دن پہلے وجیہ نے مجھے دیا تھا اور جسے صنوبی نے بہت پسند کیا تھا۔

”لاڈی بھاجی!“ وہ اپنے بھائی کی معنی خیز مسکراہٹ کو دیکھ کر جان مٹی کہ اس نے وہ لاکٹ کیوں خریدا ہے؟

پھر تیمور نے اسے تختہ دیا اور باری باری یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ کھانا شروع ہوا تو میرادل گھبرانے لگا۔ پتا نہیں کھانے خوشبو میں میرے دماغ کو چھو رہی تھیں اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے قے ہو جائے گی۔

وجیہ اور تیمور اپنے دونوں ماموؤں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ ان کے درمیان وہی شادی بیاہ کا موضوع چل رہا تھا۔ افشاں اور دودیا دونوں ایک طرف کو بیٹھی ہوئیں اپنی شادی کی مصروف ہونے والی تاریخ کے سننے کو بے تاب تھیں۔ زینت بیگم اور فخر النساء برادری کی دوسری خواتین کے ساتھ کپڑوں اور زیور کی باتوں میں مصروف تھیں ہر ایک دوسری پر زیادہ مہنگی اور زیادہ معیاری یعنی ملک اور ملک سے باہر کے بڑے بڑے موٹر سے کی گئی خریداری کا رعب جمانے کی کوشش میں تھی۔ میں چپ کر کے ہال سے باہر چلی آئی۔ میں پچھلے سبزہ زار میں جانے کے لیے کوریڈور میں تھی۔ اس وقت چونکہ تیمور وجیہ کے ساتھ موجود تھا تو میرا ذہن اس کی طرف سے بھی ریلیکس تھا۔

”تم.... تم بہت پرے ہو۔“ صنوبی کے کمرے سے اس کی دبی دبی سی آواز آرہی تھی۔  
 ”بس بھی کرو یا ر! اب مان بھی جاؤ۔“ مجھے زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ یہ آواز مراد ہی کی تھی، میں ٹھٹھک کر رک گئی، اور اس کی کھڑکی سے کان لگا دیے۔  
 ”تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے اور آج تمہارے نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو جائے گی۔“ وہ غصے میں ہونے کے باوجود در رہی تھی۔

”صنوبی پلیز رومت۔ میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔  
 ”تم کچھ نہیں کرو گے اور تمہاری سچ پر زو یا بیٹھی ہوگی اور میں میں خودکشی کر لوں گی۔“ وہ ہکلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”خودکشی۔“ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ”زو یا اور مراد؟“

”صنوبی اور مراد؟“ میرے دماغ کی لسیں الجھنے لگیں۔

”یہ.... یہ سب کیا تھا؟ اور کیا ہونے جا رہا تھا؟“ میرا سر چکر اٹھا۔ اور میں گرنے کو تھی جب کسی نے مجھے ”بسم اللہ“ کہہ کر تھام لیا؟

”خود کو سنبھالیں بی بی جی۔“ شموں نے مجھے گرنے سے پہلے ہی تھام لیا تھا۔  
 ”تم؟“ مجھے اس کا اپنے پیچھے ہی کھڑا ہونا کچھ عجیب سا لگا۔  
 ”وہ آپ آرہی تھیں ہال سے باہر تو دوڑے سائیں نے مجھے اشارہ کیا کہ آپ کے ساتھ  
 رہوں۔“ وہ تمہید باندھنے لگی۔

”وہ.... وہ جی آپ کی طبیعت خراب تھی نا اس لیے۔“  
 ”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ میں نے خود کو سنبھالا۔  
 ”آئیں اپنے کمرے میں چلیں۔“ شموں مجھے وہاں سے لے آئی۔  
 ”یہ لیں جی پانی پئیں..... ٹھنڈا اور اپنے دماغ کو سکون دیں۔ ڈاکٹر نے آپ کو ٹینشن  
 لینے سے منع کیا ہے۔“ کمرے میں آتے ہی اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور پانی کا گلاس پیش کر  
 دیا۔

”مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے۔“ میں نے پانی کے دو تین گھونٹ بمشکل بھرے اور گلاس  
 واپس اسے تھما دیا۔  
 ”اللہ نہ کرے جی کہ آپ کو کوئی ٹینشن ہو۔“ وہ میرے پیچھے کھڑی ہو کر میرے کندھے  
 دبائے لگی۔

”آپ اپنی آنکھیں اور کان بند کر کے رہیں جی یہاں جو ہوتا ہے ہونے دیں۔“ اس  
 نے آج خود ہی گھر کے معاملات پر بات شروع کر دی۔  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے سامنے کر  
 لیا۔

”وہ جی۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“ اس نے مجھ سے نظریں چرانا چاہیں۔

”دیکھو شمنوں! بات مت بدلو اور سیدھی طرح سے مجھے وہ سب کچھ بتا دو جو تم جانتی ہو۔“  
میں نے ذرا سختی سے کہا۔ تو وہ بجائے خوف زدہ ہونے کے مسکرا دی، بڑی گہری اور معنی خیز  
مسکراہٹ۔

”اوہ جی آپ کہتی ہیں تو بتا دیتی ہوں..... ورنہ آپ نے ہی منع کیا تھا۔ مگر کی کوئی بھی  
بات بتانے سے۔“ وہ ذرا اتر آ کر بولی۔

”ہل اب غرے نہ کر اور بتا کہ یہ صنوبریہ اور مراد کا کیا معاملہ ہے۔“ میں نے زیادہ  
ادھر ادھر بات کو گھمانے کے بجائے سیدھا سیدھا ہی پوچھ لیا۔

”وہ دلنشین بی بی!“ اس نے پہلے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ پھر میرے قریب  
بیٹھتی ہوئی کہنے لگی۔

”صنوبریہ بی بی اور مراد صاحب کا تو بڑے عرصے کا چکر ہے..... اور بڑا گہرا چکر  
ہے۔“ وہ لفظ ”گہرا“ کو کچھ زیادہ ہی کھینچ کر بولی۔

”اوہ جی! یوں سمجھ لیں کہ یہ تو چھوٹے ہونعیاں کا ساتھ ہے۔“ وہ مجھے بتا رہی تھی اور  
مجھے یقین نہ آ رہا تھا۔

”اچھا اگر یہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو اتنا چاہتے تھے تو پھر گھر والوں نے  
زویا کی مگنی کیوں کر دی مراد کے ساتھ۔ صنوبریہ کی کرتے؟“ میں نے اپنے ذہن کو الجھا دینے والا  
سوال شمنوں سے کر دیا۔

”وہ جی زویا بی بی بڑی ہیں نا صنوبی بی بی سے۔“ وہ اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہوئی ناک  
چڑھا کر بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ مجھے اتنی بے وقوفانہ وجہ پر غصہ آ گیا۔  
”اور پھر زویا بی بی بے حد ضدی بھی تو ہے۔ دونوں بہنوں کی بے حد لگتی ہے آپس میں“  
آپ کو نہیں ہوتا جی۔ یہ تو ایسے اک دوسرے سے لڑتی ہیں جیسے کہ سوتیلی ہوں، جان بوجھ کر اک  
دوسرے کو ستانے والے کام کرتی ہیں۔“ وہ مجھے ان دونوں بہنوں کے بارے میں بتانے لگی۔

”یعنی زویا کو یہ معلوم ہے کہ صنوبی مراد کو پسند کرتی ہے؟“ میں نے اپنا ذہن صاف  
کرنے کو پوچھا۔

”اوہاں جی..... اور کیا..... ان کو سب ہتا ہے، بالکل سب کو ہی ہتا ہے کہ ان دونوں



کالوکا چکر ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتی ہوئی بولی مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہ لگا۔

”اچھا اچھا..... آرام سے بات کرو۔“ وہ کچھ شرمندہ ہو گئی۔

”سوری دلنشین بی بی۔“

”اچھا خیر دفع کرو۔“ میں نے بات ختم کرنی چاہی مگر میرا دل نہ مانا، میں اندر سے اور

بہت کچھ جاننے کو بے تاب تھی۔

”میرے اور آپ کے دفع کرنے سے کیا ہو گا بی بی جی..... یہاں تو اب بہت بڑا پھنڈا

پڑنے والا ہے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”کیا..... کیا پھنڈا؟“ مجھے بھی وحشت ہونے لگی کہ آخر کون سی مصیبت آنے کو تیار

کھڑی ہے۔

”وہ جی! صنوبی بی بی نے کل رات اپنی ماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اسے مراد نہ ملا تو

پھر زویا کی ڈولی کی جگہ میرا جنازہ اٹھے گا..... جنازہ۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں منہ بناتنا کر کہنے لگی کہ

کبھی وہ مجھ سے بات کرتی اور کبھی دروازے کو دیکھنے لگتی۔

”تو پھر کیا کہا آنٹی نے؟“ میں نے اپنے خشک لبوں پر زہان پھیرتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا کہیں گی جی..... وہ تو رونے لگیں..... کہنے لگیں پھر جنازہ اکیلا نہیں اٹھے گا، یہا

ں تو قیامت آ جائے گی۔“ بات کرتے کرتے شموں نے اٹھ کر میرے کمرے کا دروازہ کھول دیا باہر

کو ریڈور میں جھانکا اور پھر دروازہ بند کر کے میرے قریب آ گئی۔

”دلنشین بی بی! آپ سمجھائیں صنوبی بی بی کو در نہ سچ سچ یہاں بندوقیں چل جائیں گی۔“

وہ دوبارہ میرے کندھے دھاتے کھڑی ہو گئی تھی۔

”دیکھ شموں! مجھے زیادہ نہ ڈرا۔ میں تو پہلے ہی پریشان ہو گئی ہوں۔“ میں نے اپنے

لڑتے کانچے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا جو بندوقوں کا نام سن کر سہم گیا تھا اور مجھے تو

ابھی سے اپنے ارد گرد خون ہی خون نظر آنے لگا تھا۔

”دلنشین بی بی! آپ کو ایک اور بات کے بارے میں نہیں معلوم۔“ شموں نے کسی اور

نئے دھماکے کی خبر دینی چاہی۔

”کیا؟“ میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

”یہ جو صنوبی بی بی ہے نا..... یہ اپنے وڈے ابا کے کمر مٹکی ہوئی ہے۔“ وہ خالص اپنی

زبان میں بولی۔ پھر فوراً ہی وضاحت کرنے لگی۔

”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ صنوبی بی بی کی مگنی اپنے تایا کے بیٹے فضل کریم سے ہو چکی ہے۔“ شموں نے واقعی میرے سامنے ایک اور دھماکہ کر دیا تھا، جس نے میرے دماغ کو بالکل ہی دھنک کے رکھ دیا تھا۔

”اپنے تایا کے گھر؟“ میرے منہ سے لفظ نہ نکل رہے تھے۔

”اور کیا جی..... اور یہ مگنی وڈے سائیں نے اپنی مرضی اور پسند سے کی تھی۔ یہ بات ان کے جیل جانے سے پہلے کی ہے۔“ وہ احمد بخش صاحب یعنی وجیہ کے والد کا ذکر کرنے لگی۔  
”لیکن شموں ان لوگوں کے ساتھ تو ان کے تعلقات ہیں ہی نہیں۔“ میرے دل و دماغ کی کتھی پھر الجھنے لگی۔

”وہ تو جی ان کے ناکوں کی چالوں کی وجہ سے ہے۔“ وہ وجیہ کے خیمال کی وجہ تازمہ بتانے لگی۔

”اوہ..... اوہ میرے خدا یا! یہ سب کیا ہے، کس طرح سے ہے، میری تو سمجھ سے باہر ہے اس خاندان کی گجٹک۔“ میں نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔  
”اوجی! آپ پریشان نہ ہوں، اپنا دماغ خراب نہ کریں، دفع کریں جی۔ بس اپنا آپ بچا کر رکھیں، اور..... لاڈی صاحب کو سمجھا تی رہیں وہ نہ غصہ کریں نہ ہی ان کے معاملے میں زیادہ پڑیں۔ وہ بہت بھولے ہیں جی، اور یہ سوتیلے بڑے پھلتر ہیں جی۔“ شموں میرا سر دباتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”کیا..... کیا مطلب ہے تمہارے کہنے کا..... کون لوگ وجیہ کے ساتھ قتل نہیں ہیں؟“ وجیہ کے بارے میں سن کر میری جان پر بن گئی۔

”سوائے زینت بی بی کے اور کوئی بھی نہیں..... وڈے سائیں تھے تو انہیں بھی ان لوگوں نے جیل کرادی۔“ شموں نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

”بی بی جی! یہ جو فقر النساء بی بی ہیں نا..... یہ بہت بری چیز ہیں..... انہوں نے پہلے وڈی بی بی کا پتا صاف کیا..... اور اپنا فٹ کیا..... اور پھر۔“ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر ڈنک کرنے کا اشارہ دیتے ہوئے مجھے جو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی، اسے سمجھ کر میرے روکنے بچ بچ کانٹنے بن کر میرے مساموں میں کھڑے ہو گئے۔ کانٹے بھی ایسے جن کے منہ میرے گوشت میں

پیوست تھے۔

”لگتا ہے کوئی ادھر آ رہا ہے۔“ وہ بات کرتی کرتی لپک کے دروازے کی طرف بڑھی اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر دروازہ کھول دیا اور خود آ کر میرے کندھے دبائے گئی۔ میں اس کی چمٹی حس کے تیز ہونے پر حیران رہ ہی رہ گئی، کیونکہ اگلے ایک منٹ سے بھی پہلے وجیہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا، جس کے پیچھے پیچھے مراد اور تیمور بھی تھے۔

”کیا ہوا بھر جانی! تم نے کھانا بھی نہیں کھایا.... اور یوں محفل کو چھوڑ کر آ گئیں۔“ تیمور نے آتے ہی سوال کر دیا۔ اس کا انداز بظاہر محبت اور ہمدردی والا ہی تھا، مگر اس کے اندر کی کاٹ کو میں ہی محسوس کر سکتی تھی۔

”اف! صرف ایک رات میں یہ شخص کس قدر بدل گیا تھا۔ بلکہ اس کے چہرے کا ماسک اتر گیا تھا اور یہ اس قدر بھیاں تک دکھائی دینے لگا تھا۔“

”بھابی جان! کیا ہوا..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، وہاں سے کیوں چلی آئیں؟“ وہی سوال مراد نے بھی مجھ سے کیا، مگر انداز نہایت شائستہ اور تہذیب یافتہ تھا۔

”جی وہ کل سے کچھ ٹھیر چکا ہے، اس لیے سر میں درد اور داسٹنگ (تے) ہو رہی تھی۔ سو رہی، مجھے وہاں سے مجبوراً آنا پڑا۔“ میں نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

”نو..... نو..... اس آل رائٹ..... پلیز پوٹک کیر آف یور سیلف۔“ وہ بڑے دھیمے انداز میں بولا اور دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”سائیں! کافی ادھر ہی لے آؤں؟“ اتنے میں اللہ وسائی نے میرے کمرے کے دروازے پر آ کر پوچھا۔

”نہیں تو رہنے دے، چل نی شموں! جا تو جا کر کافی بنا کر لا۔“ تیمور نے اسے واپس جانے کا اشارہ کر کے شموں کو حکم دیا۔

”اور سن!“ وہ جانے کو لپکی تو اس نے پھر روک لیا۔

”جی سائیں!“ وہ بے چاری اپنی ایڑیوں انک گئی تھی۔

”کافی دل سے بنائیں..... جیسے بھابی کے لیے بناتی ہے، پچھانہ چھڑانا۔“ اس نے کمال بدتمیزی سے کہا۔

”جی بہتر۔“ شموں کے منہ سے دبی دبی سی آواز نکلی اور وہ برق رفتاری سے باہر نکل گئی۔

”چلیں نا بھاجی! اب آپ تو موڈ ٹھیک کریں۔“ وجیہ جواب تک بالکل خاموش بیٹھا تھا اسے دیکھ کر تینوں نے بات شروع کی۔

”بس کریا! تو نے تو آج مجھے بہت ہی نچا کر دیا۔“ وجیہ کو تینوں پر ہی غصہ تھا۔ مگر کس بات کا؟ یہ بات ابھی کھلتی باقی تھی۔

”کمال کرتے ہو بھاجی! میں اور آپ کو نچا کروں گا“ میں مرنہ جاؤں ایسا سوچوں بھی تو۔“ وہ وجیہ کے گھٹنوں کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرنے لگا۔ میں سمجھ سکتی تھی وہ بھی اس کی ایکٹنگ ہی ہے۔ وہ وجیہ کے ساتھ غلط نہ تھا اور یہ سب دکھاوا تھا۔ اگر وہ کھرا ہوتا تو کیا مجھ پر گندی نظر رکھتا۔ میرے لہو میں پھراک سنسنی سی دوڑ گئی۔

”آپ ہی سمجھاؤ نا بھاجی کو..... بھلا یہ کوئی بات ہے اتنا غصہ کرنے کی۔“ اس نے مراد سے اپنی سفارش کرانی چاہی۔

”بتاؤ اس نے کیا قباحت ہے! اگر تم نکاح کر کے چلے جاؤ تو؟ میں نے سمجھا کہ تم میری بات کی لاج رکھو گے“ اس لیے میں نے بڑے ماموں سے وعدہ کر لیا تھا..... اور..... اور تو نے تو صاف چٹا جواب دے کر میرے عزت مٹی ہی کر دی۔“ وجیہ نے اپنے غصے کی وجہ بتاتے ہوئے مزید ناراضی سے کہا۔

”بھاجی! تسی وی گل سمجھن دی کوشش کرو۔“ مراد نے خالص اپنی مادری زبان استعمال کرتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ ایسی ہی زبان بولتے تھے، کبھی کبھی اچھی اردو ورنہ ملی جلی اردو اور ان کی علاقائی پنجابی..... بلکہ جب آپس میں غصہ کرتے تو اپنی مادری زبان میں ہی زیادہ سہولت سے ابلاغ کا کام لیتے۔ اس ابلاغ کا جس میں اکثر گالی گلوچ کی آمیزش بھی ہوتی تھی۔

”یار! تسی مینوں کی سمجھاؤ نا چاہندے او..... دسو..... اچ دو مینوں۔“ (یار! تم لوگ کیا سمجھنا چاہتے ہو مجھے بتاؤ آج بتاؤ مجھے)

وجیہ تو بے حد غصے میں تھا۔ ان دونوں سے ہی شاک۔

”تم اپنی کر رہے ہو..... اور یہ اپنی..... تم دونوں کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔“ وہ ان دونوں سے مخاطب تھا۔

”سائیں! کافی لے آؤں؟“ وجیہ کو زور زور سے بولنا پا کر شموں نے کافی کی ٹرالی کمرے میں لانے سے قبل اجازت مانگی۔

”لے آ..... لے آ..... کہاں مرگئی تھی، اتنی دیر لگا دی۔“ تیمور کو کچھ اور نہ سوچھا تو وہ شموں پر چڑھ دوڑا۔ وہ ڈری سہی آکر کافی بنانے لگی۔

”اچھا بھائی! ہن ٹھنڈے ہو دو..... اللہ خیر کرے گا۔“ مراد نے وجیہ کی طرف کافی سے پہلے ٹھنڈے پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یار میں تے ٹھنڈا ای آں..... تسی خیال کرو۔“ وجیہ نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے پھر اسے خشکیں لگا ہوں سے دیکھا۔

”اچھا! آپ بتائیں ذرا..... اس میں کیا خرابی ہے، اگر میری اور تیمور کی شادی ایک سال بعد ہو جائے تو؟ ایک سال..... صرف ایک سال۔“ اچانک ہی مراد نے مجھے اس معاملے میں تھسٹ لیا تو میں بوکھلا کر وجیہ کو دیکھنے لگی، جس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔

”دیکھیں نا..... تیمور وہاں جا کر ذرا سیٹ ہو لے اور میں وہاں اپنی نوکری پکی کروں، تاکہ ہمیں کوئی پر اہلم نہ ہو۔“ وہ اب بھی مجھے ہی سمجھا رہا تھا یا پھر میری آڑ میں وجیہ کو۔

”اویار! رہنے دے! ونٹیش کو مت تھسٹ۔ یہ ہمارے اور اپنے خاندانی مسئلے ہیں، یہ باہر کی ہے، اسے کیا پتا کہ اصل بات کیا ہے۔“ وجیہ نے ایک دم سے مراد کو مجھ سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن اس کا انداز میرے لیے بہت غیروں والا تھا۔ ”باہر والی“ کے لفظ نے تو مجھے ایک پل میں ہی ان سب کے درمیان سے اچک کر علیحدہ کر دیا تھا۔ میں تو مارے شرمندگی کے منگ ہو کر رہ گئی۔ اس وقت میری حالت اپنے ہی کمرے میں ایسی تھی جیسے میں کسی تیسری دنیا میں تنہا کھڑی ہوں اور سائر بھی نہ ہوں۔ مجھے کچھ اور نہ سوچھا تو میں محذرت کر کے باہر ٹیرس پر جانے کو بڑھی۔

”ایکسکوز می پلیز..... مجھے کچھ گھبراہٹ ہو رہی ہے، آپ لوگ ہاتھ کریں۔“

”میرے کہنے کا مطلب تھا کہ تم ان کے دلوں کے چور نہیں جان سکتی ہو۔“ میں جانے لگی تو وجیہ نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے کہے کی وضاحت کرنا چاہی۔

”نو پراہلم.....“ میں نے مسکرا کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور ٹیرس پر چلی گئی۔

”شموں! ونٹیش کی کافی وہیں لے جا، اور دیکھ اسے کچھ کھانے کو بھی دے۔“ وجیہ نے شموں کو ہدایت کی، جو جاتے جاتے میرے کانوں نے سنی تھی۔ مگر مجھے اس وقت وجیہ کے لہجے میں اپنے لیے محبت کم اور خود کے لیے خیالت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

”ہونہہ! اداکاری..... یہاں ہر شخص ادا کار تھا۔ کوئی مجھا ہوا اور کوئی باب ادا کاری کا

درس لیتا ہوا، جیسے کہ وجہ۔“ میرے دل کے ایک کونے سے آواز آئی، اور میں اداسی اور پریشانی کے طے جلے جذبات کی گردش اپنے لہو میں محسوس کرنے لگی۔ پھر وہ لوگ کتنی دیر اس بحث میں الجھے رہے، کیا کیا کہتے سنتے رہے، مجھے کچھ پتا نہ چلا۔ مجھے اس وقت اپنا گھبراہٹ آ رہا تھا۔ اور اپنی ماں یا دادا رہی تھی۔ اتنی شدت سے کہ اس کے آگے ہر خیال، ہر شبیہ اس وقت دھندلا چکی تھی۔

✱ ✱ ✱

آج پھر وجہ گھر سے باہر تھا، رات کا ایک بجنے کو تھا اور اس کا کوئی فون یا پیغام مجھے موصول نہیں ہوا تھا۔ میں نے بھی آج اسے کوئی فون نہ کیا تھا۔ وہ تینوں میرے کمرے میں میرے میسر پر جانے کے بعد بھی کوئی ایک گھنٹہ بیٹھے رہے، پھر کہاں گئے..... تینوں ایک ساتھ گئے یا علیحدہ علیحدہ، مجھے کچھ علم نہ تھا۔ میں تو جب کمرے میں واپس آئی تب وہ خالی تھا۔ میرا دل اداس اور پریشان سا تھا، اس لیے میں نے ایک ٹیبلٹ سکون کی لی اور سو گئی۔ اب میری آنکھ کھلی تھی تو مجھے کچھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ شموں بھی جانے کہاں تھی، میں ہمت کر کے خود ہی اٹھی، تاکہ کچن سے کچھ لے کر آؤں۔ یا کم از کم شموں کو ہی دیکھوں کہ وہ کہاں ہے۔

میں ابھی کچن کی طرف جا رہی تھی، جب بڑی مامی نادرا بیگم سخت غصے کے عالم میں فخر النساء بیگم کے کمرے سے بڑبڑاتی ہوئی نکلیں۔

”نی دفع ہو دو..... تسی ساریاں! میرا جن ورگا مراد..... کئی اے اینوں کڑیاں دیاں۔“ وہ بے حد غصے میں تھیں۔ میں تو سہم کے وہیں راستے میں ہی ایک طرف ہو گئی۔

”بھابی! بھابی! بھابی! ڈوڑی! ڈوڑا رک تے سہی..... گل تے سن!“ ان کے پیچھے ہی فخر النساء نکلیں، وہ انہیں منانا چاہ رہی تھیں۔

”رہن دے..... فخر! رہن دے، تیری زویادی زبان بڑی نکھی اے۔“ وہ رک تو گئیں، مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے فخر النساء کو اپنے قریب آنے سے روک دیا تھا۔

”کی اے مامی! میری کلی دی زبان نکھی اے۔ افشاں دے منہ وچ کیڑے گلاب بھرے نہیں۔“ زویا تو پورا پورا مقابلہ کر رہی تھی، اپنی ناصرف مامی سے بلکہ اپنی ساس سے بھی۔

”بس کر! زویا..... تے میری زبان دے گلاب گلاب نہیں رہن گے؟“ فخر النساء کے ساتھ ہی کمرے سے افشاں نکلی تھی جواب آ کر اپنی ماں کے ساتھ کھڑی تھی، اب وہ زویا کے ساتھ دو

دو ہاتھ کرنے کو تیار تھی۔ میرا وجود تو انہیں یوں لڑتا دیکھ کر قہر قہر کا پھٹنے لگا۔  
 ”بھابی! بس کرو..... تم تو میری بات سنو۔“ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر غرغرائی سے انہیں  
 زبان کو ذرا سنبھالا۔

”بات کی سنی..... بس تو اب ہمیں جانے دے..... ختم کر سب کچھ۔“ وہ بھی ذرا  
 سنبھلیں، مگر ان کے چہرے کی تیوریاں پھر بھی کم نہ ہوئیں۔

”اچھا! آؤ کمرے میں چلو..... آرام سے بات کرو..... باہر کوں شور مچا رہی ہو۔ سنا  
 نہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں..... اچھے تے ساڑی شرکین دی کھڑی اے۔ غرغرائی سے انہیں  
 آگے بڑھ کر تارہ مائی کو زبردستی ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف کھینچا اور مجھے کھا جانے والی  
 نظروں سے دیکھ کر گہرا ہلکا کیا۔

”نی صنوبی! کتنے مگر گنیں ایں..... آکے کچھ اے کیوں اپنے کمرے سے باہر آئی  
 کھڑی ہے ایس ویلے۔“ جاتے جاتے انہوں نے صنوبی کو آواز دی تاکہ وہ مجھے دیکھے۔

انہیں میرا وہاں موجود ہونا سخت ناگوار گزرا تھا اتنا کہ ان سے برداشت ہی نہ ہو رہا تھا۔  
 مجھے پھر اپنی بے حد بے عزتی محسوس ہوئی۔ میں مارے شرم کے پانی پانی ہو رہی تھی کہ وہ سب لوگ  
 مجھے آخر اس طرح کیوں کہہ دیتے تھے منہ بھر کے۔ آخر میں ان کے لیے اتنی غیر اور کتر کیوں تھی۔  
 میں اب تک ان کے لیے خاندان کا ایک فرد کیوں نہ بن سکی تھی۔

”بھرجائی! کیا ہوا؟ یہاں کیوں کھڑی ہی؟“ میں سخت صدمے سے دو چار تھی جب  
 صنوبی نے مجھے دھیرے سے چھو کر پوچھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سرخ متورم  
 آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے ساتھ بھی اندر کمرے میں بہت کچھ ہوا ہے۔

”ہاں..... ہاں وہ میں..... میں کچن میں جا رہی تھی..... چائے بنانے۔“ میں نے اپنے  
 حلق میں اٹا آئے نمک کے ان گولوں کو نکلنے ہوئے کہا جو میری آنکھوں میں آکر پہنچنے کو بالکل تیار  
 تھے۔

”آپ چلیں اپنے کمرے میں، میں شموں کو دیکھ کر بھیجتی ہوں۔“ اس نے بھی مجھ سے  
 نظریں چراتے ہوئے کہا..... میں کوئی بھی سوال جواب کیے بغیر واپس اپنے کمرے کی طرف چل  
 دی لیکن اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ میری ٹانگوں کے ساتھ میرے پیڑ بھی نہیں ہیں..... میں خود کو  
 بے شکل تھکیت کر اپنے کمرے میں لائی تھی۔

”یا اللہ! میری حیثیت..... میری وقت بس اتنی سی ہے.....؟ اتنی حقیر.....؟“ میری آنکھوں میں نلک کھلنے لگا اسے میں قابو نہ کر سکی نہ ہی میں نے ایسا چاہا۔

”ماما! اما جان!“ میں نے اپنا چہرہ نیچے میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔  
 ”ماما! آپ بالکل ٹھیک کہتی تھیں کہ صرف وجہ کی محبت سے زندگی نہیں گزرے گی۔ حقیقت میں جینے کے لیے عورت کو معاشرے میں عزت اور وقار کی ضرورت، محبت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔“ مجھے اپنی ماما کی نصیحتیں یاد آنے لگیں..... جب میں نے وجہ سے شادی کی ضد میں کھانا پینا بند کر کے خود کو اپنے کمرے میں محصور کر لیا تھا تو وہ ایک رات گھنٹوں میرے ساتھ بیٹھی رہیں اور مجھے مختلف مثالوں سے سمجھاتی رہی تھیں مگر اس وقت میرے دل و دماغ گونگے اور بہرے ہو چکے تھے۔ تب مجھے سوائے وجہ کو پانے کے کوئی اور چیز اہم نہ لگ رہی تھی..... اور آج، آج.....؟  
 ”ماما! آپ کتنی دور اندیش تھیں۔ آپ کو یہ ساری باتیں پہلے سے معلوم تھیں کہ میرے ساتھ یہ سب ہوگا..... جیسی تو..... جیسی تو آپ بار بار مجھے کہہ رہی تھیں۔

”وجہ کی ضد چھوڑ دے عصمہ!“

”آپ اپنی ضد چھوڑ دیں نا ماما؟“

جب انہوں نے مجھے نرمی سے کہا تھا تو میں نے سختی سے جواب دیا تھا۔  
 ”میں اپنی ضد چھوڑ دیتی عصمہ! اگر وجہ کا خاندانی پس منظر اچھا ہوتا تو.....“ وہ پھر بھی نرم ہی رہیں..... مگر میری اکڑ جوں کی توں ہی تھی۔

”مجھے اس کے خاندان سے کیا لینا دینا.....؟“

”کیسی باتیں کرتی ہو عصمہ؟“ وہ پیار سے میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

”بیٹی! شادی کے بعد خاندان ہی تو عورت کا مان اور محافظ ہوتا ہے..... خاندان کی طرف سے ملنے والی محبت اور عزت ہی عورت کو ازدواجی زندگی کے مسائل اور مصوہتوں میں حوصلہ دیتے ہیں اور اگر سسرال کی طرف سے کسی عورت کو عزت نہ ملے تو شوہر کی محبت بھی ادھوری اور بے معنی سی لگنے لگتی ہے۔ جب عورت ماں بنتی ہے..... اس کے بچے ہوتے ہیں اور وہ حقیقت میں زمانے کے بچ آکر جیے لگتی ہے تو اسے سسرالی رشتوں کی اشد ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ان کے بغیر بچوں کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔“ وہ مجھے بڑی گہری اور سچی باتیں سمجھا رہی تھیں جو مجھے تب تو محض نصیحتیں لگ رہی تھیں مگر آج سمجھ میں آ رہی تھیں۔



”اما!“ میں سسکنے لگی وہ مجھے شدت سے توکل ہی سے یاد آ رہی تھیں مگر اب تو ان کی یاد میرا کلیجہ پھیلنے لگی تھی..... جی چاہ رہا تھا کہ فوراً ان کے پاس چلی جاؤں اور جا کر اپنی ہر نادانی ہر غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لوں۔

”بھر جائی!“ کسی نے مجھے تھمی ہو لے سے پکارا۔

”صوبی تم؟“ میں اسے اپنے پاس دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔

”بھر جائی! چائے لے لیں۔“ وہ چائے کی ٹرے میرے سامنے رکھتی ہوئی بولی۔

”تم نے بتائی چائے.....؟ وہ شموں کہاں ہے؟“ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ میرے

لیے وہ خود چائے بنا کر لائی تھی۔

”چائے تو شموں نے ہی بتائی ہے مگر میں نے اسے کہا تھا کہ میں خود لے کر جاتی

ہوں۔“ وہ میری پلیٹ میں پڑا رکھتی ہوئی بولی۔

”صوبی! کیا ہوا۔ تم پریشان لگ رہی ہو؟“ میں نے اسے پیار سے اپنے پاس بٹھالیا۔

”بھر جائی! بس.....“ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی اور پھر اس کی زبان اس کی آنکھوں میں آ

کر پانی ہو گئی۔

”ارے..... ارے تم رورہی ہو۔ مگر کیوں؟“ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا میری اتنی

سی محبت پا کر وہ جھرجھرونے لگی۔

”بھر جائی! میں مراد کے بغیر مر جاؤں گی۔ میں اس کو بہت چاہتی ہوں..... وہ بھی

وہ..... میرے ساتھ..... وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے۔“ وہ بغیر کسی حیلے بہانے یا تمہید کے اقرار

محبت کر رہی تھی۔

”اچھا..... اچھا ٹھیک ہے۔“ میں اسے پچکار کے چپ کرانے لگی۔

شکر ہے اس نے میرے آنسو نہ دیکھے جو میں نے اسے گلے سے لگا کر صاف کر لیے

تھے۔ وہ کچھ دیر پچکیاں لے کر روتی رہی۔ میں نے بھی اسے رونے دیا جب وہ اپنا دل ہلکا کر چکی تو

میں نے ایک کپ چائے اس کی طرف بڑھائی اور دوسرا کپ اپنے لیے بنایا۔

”چلو اب بتاؤ! کیا مسئلہ ہے۔“ میں نے اسے حوصلہ دیا..... میرے لیوں پر مسکراہٹ

دیکھ کر وہ بھی کچھ نارمل ہوئی۔

”تم نے خود کہا تھا کہ تمہارا جی کرتا ہے کہ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ تو میری جان! میری

”دوست! تم بے فکر ہو کر مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو۔“ میں نے اس کی گلابی پڑ جانے والی ناک کو پیار سے کھینچا۔

”بھرجانی! میری کوئی دوست نہیں ہے۔ سچ کچ کوئی بھی نہیں۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔  
 ”پھر بھرجانی! ابھی ہم دونوں دوست ہیں تو تم میرا نام لے سکتی ہو۔“ میں نے بھی اس کی صورت میں اپنے لیے ایک دوست کو دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔  
 ”ناپا پانا..... وہ لاڈلی بھابی تو مجھ سے ناراض ہی ہو جائیں گے اگر میں نے آپ کا نام لیا تو..... وہ ویسے بھی آج مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہو گئے ہیں۔“ وہ کچھ سکھ کر بولی۔  
 ”وجہ کو میں سمجھا دوں گی..... ویسے بھی تمہیں بہت پیار کرتا ہے۔“ میں نے اس کا ڈر دور کرنے کی کوشش کی۔

”ڈنٹیشن بھابی!“ وہ مصومت سے بولی۔  
 ”یہ ٹھیک رہے گا..... میں آپ کو اس طرح سے بلا لوں۔“ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”تم بہت پیاری ہو..... بہت معصوم.....“ میں نے اس کے ہاتھ کو پیار سے بوسہ دیا۔..... میری محبت مزید پاکر وہ پھر سے جذباتی ہونے لگی۔  
 ”ڈنٹیشن بھابی! آج میں نے سب کو بتا دیا ہے کہ مراد اور میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں یہی کر سکتی تھی اور کیا کر سکتی تھی اور کیا کرتی....؟“ وہ اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں چلنے لگی۔  
 ”مراد نے تو اتنی ہمت کرنی نہیں تھی..... میں نے اسی لیے اپنی زبان کھولی ہے۔“ وہ مجھے بتا رہی تھی۔

”اچھا تو بڑی مای اور آنٹی خیر النساء کے غصے کی وجہ یہی تھی؟“ میں نے کچھ دیر پہلے کا منظر یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... مای تو خود بھی یہی چاہتی ہے کہ مراد کی شادی مجھ سے ہو.....؟“  
 ”تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ باقیوں کو کیوں اعتراض ہے؟“ مجھے واقعی اس سیدھے سے معاملے میں کوئی ایسی رکاوٹ نظر نہ آ رہی تھی جو گنجلک بن جاتی۔  
 ”مسئلہ یہ ہے کہ یہ سارے کے سارے فضل کریم سے ڈرتے ہیں.... اور کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے فضل کریم کا نام بڑی ہی حقارت سے لیا۔

”فضل کریم کون؟“ میں نے کچھ جانتے کچھ نا جانتے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہ تائے محمد بخش کا بیٹا ہے جسے ہاڑ بردستی میرا سنگیتر بنانا چاہتا تھا۔“ اس نے اپنے والد کا نام بھی اسی طرح ناک چڑھا کر کہا..... جو اس کے دل میں چھپی ہوئی نفرت کا ہلکا سا اظہار تھا میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنا دل ماضی کی کسی بری یاد میں الجھائے اس لیے میں نے اس کا دھیان ہٹایا۔  
 ”منوبی! وہ تو سب کچھ ٹھیک ہے کہ جو وہادہ سر اسر زیادتی تھی لیکن اب کیا ہو گا؟“  
 ”ڈنٹیش بھابی! اگر تم بھابی کو سمجھا کر مٹا لو تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے..... بھابی کی مرضی کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا۔“ وہ منت والے انداز میں بولی۔  
 ”وجہ سے میں بات کروں گی تم فکر نہ کرو۔“ میں نے اس کی تسلی کرائی۔  
 ”ہاں تم نا ان کا اچھا موڈ دیکھ کر بات کرنا۔“ وہ مجھے سمجھا رہی تھی۔  
 ”اچھا میری بھابی جان ان کا موڈ دیکھ کر ہی بات کروں گی۔“ میں نے پیار سے اس کے گال پر چٹکی لی۔

منوبی! منوبی! کتنے مر گئی ایں۔“ یہ فخر النساء آئی کی آواز تھی۔  
 ”آئی ماما۔“ وہ ان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی باہر کو لپکی۔  
 ”ڈنٹیش بھابی! اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“ جاتے جاتے بھی اس نے مجھے یاد کرایا۔  
 ”اللہ بلیس یو..... فیک کبیر۔“ میں نے اسے مسکرا کر دعا دی۔  
 ”سیم ٹو یو.....“ اس نے جاتے جاتے مڑ کر جواب دیا اب وہ اپنی سرخ آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

مجھے اسے مسکراتا دیکھ کر دلی اطمینان ہوا۔ اگر میری کوئی بہن ہوتی تو یقیناً ایسی ہی ہوتی۔  
 اچانک میرے ذہن میں اک خیال آیا۔

”بہن! آہ کاش میری کوئی بہن ہی ہوتی جس کے ساتھ میں اپنا دکھ سکھ کر لیتی۔“  
 بہنیں کیا ہوتی ہیں؟ ان کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ کیوں مانیں یہ چاہتی ہیں کہ اس کی اگر بیٹیاں ہوں تو دو ہوں۔ مجھے اس کا احساس آج شدت سے ہو رہا تھا..... مجھے یاد آ رہا تھا کہ کس طرح سے میری ماما بھی اللہ سے دعائیں مانگا کرتی تھیں جب میں چھوٹی تھی۔ کہ اللہ انہیں ایک بیٹی اور دے دے۔ میری بہن تو کیا میرا تو بھائی بھی نہ تھا۔ اکلوتے بچے کو احساس محرومی ہوتا ہے۔ مجھے پھر سے یہ کی شدت سے محسوس ہونے لگی۔

”ماما! میری ماما۔“ میں نے پھر سے ٹکیے میں منہ چھپا لیا..... پتا نہیں کیوں آج ماما کو یاد کر کے بار بار رونا مجھے اچھا لگ رہا تھا..... ماما میرے اندر جذب ہو رہی تھیں.... اور ان کی نرمیوں کی چاپ میرے دل کی بے قراری کو چھو رہی تھی..... ”ماما جان!“ میری رگ و پے میں اک دو اثر رہی تھی اور میں اندر تک شانت ہوتی جا رہی تھی۔



وجیہ کا موڈ پچھلے دور روز سے بالکل بھی اچھا نہ تھا اور وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا میں نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ وجیہ نے دور روز سے میرے ساتھ بھی کوئی اچھا وقت نہ بتایا تھا۔ یہ بات میری تقریباً آٹھ ماہ کی اس ازدواجی زندگی میں بہت ہی انجینے کی تھی کہ وہ میرے بے حد قریب ہونے کے باوجود بھی مجھ سے کوسوں دور تھا۔ خدا جانے اس کا دل و دماغ کن الجھنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی یہ حالت محض صنوبی والے مسئلے کی وجہ سے نہیں تھی۔ کیونکہ صنوبی والی بات تو اب تقریباً دب چکی تھی۔ اور وہ دو تین بار وجیہ کے ہوتے ہوئے میرے کمرے میں چکر لگا چکی تھی۔ وجیہ کو کافی بھی بنا کر دے چکی تھی اس کا مطلب تھا کہ وجیہ کو صنوبی پر اب وہ غصہ نہ تھا جو پہلے روز تھا۔ اب بھی ہم دونوں اپنے ٹیرس پر بیٹھے چائے پی رہے تھے وجیہ کے سامنے آج کا تازہ اخبار پھیلا ہوا تھا اور وہ خاموشی سے اخبار پڑھ رہا تھا۔

”وجیہ!“ اس نے اپنے چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹائے بغیر جواب دیا۔

”تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے لے لو۔“ میں نے اخبار اس کے سامنے سے ہٹا کر

چائے کا کپ آگے کیا۔

”اوہاں.....“ اس نے ذرا سا مسکرا کر مجھے دیکھا اور چائے کا کپ تمام لیا جس سے

مجھے کچھ حوصلہ ملا۔

”وجیہ! ایک بات کروں.....؟“ جانے کیوں آج مجھے اس سے بات کرنے کے لیے

اجازت لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

”ایک بات کیوں دس باتیں کرو۔“ آج وہ اچھے موڈ میں تھا بلکہ اپنے اس موڈ میں ہی

تھا جس میں وہ میرے ساتھ پچھلے آٹھ ماہ سے پیش آرہا تھا۔

”تم کچھ پریشان ہو! خیر تو ہے؟“ میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

”ہاں میں پریشان ہوں۔ لیکن تم فکر کیوں کرتی ہو؟“ اس نے صاف بتا دیا۔  
 ”کمال کرتے ہو وجیہ! بھلا تم پریشان ہو اور میں فکر نہ کروں یہ کیسے ممکن ہے۔“ میں نے  
 اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ہم لوگوں کے بہت سے فٹڈے ہوتے ہیں۔ اور بہت سے شریکے.... ہم اپنی عورتوں  
 سے انہیں شہر نہیں کرتے.... اس لیے تم اس معاملے سے خود کو دور رکھو۔“ وہ بالکل نارمل انداز میں  
 مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اس لیے مجھے اس کی بات بری نہ لگی۔

”وجیہ! اچھے میاں بیوی وہ ہوتے ہیں جو بہترین دوست بھی ہوں اور ان کے دکھ سکھ  
 سنا لیتے ہوں۔“ میں نے پھر بھی اس کی بات سے اتفاق نہ کیا اور اس کی پریشانی کو بانٹنے کی ضد کی۔  
 ”تمہارا دل بہت نازک ہے اور پھر تم جتنی حساس ہو.... بہتر ہے خواہ مخواہ کی ضد نہ  
 کرو۔ یہ خالص ایک سیاسی معاملہ ہے اس لیے تمہاری دلچسپی کا بھی نہیں، چھوڑو اور خوش رہو۔“ اس  
 نے میرے ہاتھ کو پیار سے چھکی دیتے ہوئے کہا۔

”اچھا تم تو بہت دنوں سے گھر میں بند ہو ایسا کرو کہیں ہو آؤ.....“ اس نے میرا دھیان  
 ہٹانے کو کہا۔

”کہاں؟“ میں نے اداسی سے پوچھا۔

”بھئی شاپنگ پر چلی جاؤ۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”مجھے شاپنگ کا کوئی شوق نہیں تمہیں معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو سینما چلی جاؤ.... مصنوعی اور زویا کے ساتھ پروگرام بنالو.... ذرا دل ہی بہل جائے

گا۔“ اس نے ایک اور مشورہ دیا۔

”فلمیں تو مجھے بہت بور کرتی ہیں۔ تمہارا ساتھ اگر جانا ہو تو سوچا جاسکتا ہے۔“ میں  
 نے اسے ریپلیکس کرنے کے خیال سے کہا۔

”نہیں یا ر مجھے تو دو چار دن کے لیے کہیں جانا پڑ رہا ہے۔ ورنہ چلتے۔“ اس نے مجھے پھر  
 سے اپنے کہیں جانے کا تکرار پھر سے پریشان کر دیا۔

”وجیہ! تم کہاں جا رہے ہو میں تو پہلے ہی اداس ہوں۔“

”اچھی بیویاں اداس نہیں ہوتیں اور نہ ہی اپنے شوہروں کے پیروں میں بیڑیاں ڈالتی  
 ہیں۔“ اس نے میرے ہاتھ کو لمبوں سے لگا کر محبت سے کہا۔

”وجیہ! میرا تو سارا دھیان تم میں رہتا ہے۔ تمہاری ذرا سی چپ میری جان لے لیتی ہے اور تم کہتے ہو کہ میں تمہاری فکر نہ کروں؟“ میں نے اپنا حال دل کہہ ہی دیا۔

”مجھے پتا ہے۔ پتا ہے میری جان! لیکن تم بھی تو سوچو نا کہ آخرا ب ہماری شادی کو آٹھ ماہ ہو گئے ہیں بڑا البیانی مون منالیا ہم نے.... اب مجھے زمینداری نہیں پتا وہ میرے چاچے! وہ اس بار ہمارے مقابلے میں انیکشن لڑ رہے ہیں۔ تمہی چلا گیا ہے اور میں اکیلا ہوں۔ اتنے مسئلے ہیں اب میں اگر زن مرید بنار ہا تو نا صرف انیکشن ہار جاؤں گا بلکہ.... خیر۔“ وہ کہتے کہتے رکا اور اپنے موبائل پر بجنے والی مسج رنگ کی طرف متوجہ ہو گیا.... خدا جانے کس کا مسج تھا وہ پڑھ کر فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔

”سومائی ڈارلنگ! وائف پلیز یو مائنڈ اینڈ ٹیک کیئر.... سی یوسون....“ اس نے جھک کر میری پیشانی پر اپنے لب رکھے اور جانے لگا۔

”وجیہ! مجھے ماما بہت یاد آ رہی ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ماما!....“ وہ لمحہ بھر کو چپ ہو کر مجھے دیکھتا رہا پھر ہنس پڑا۔

”تم نے دیر نہیں کر دی یہ کہنے میں....؟“ وہ مجھے چھینٹ رہا تھا۔

”میں تو بہت دفعہ سوچ چکا تھا کہ تم نے ابھی تک مجھے سے یہ کیوں نہیں کہا۔“

”وجیہ پلیز؟“ مجھے کچھ شرمندگی ہونے لگی۔

”جاؤ ڈارائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔ جا کر مل آؤ۔“ اس نے مجھے فوراً ہی اجازت دے دی تو میں اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگی کہ کہیں وہ ناراضی سے تو نہیں کہہ رہا.... مگر وہ تو بالکل نارمل تھا اور مسکرا رہا تھا اس کی مسکراہٹ میں شرارت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”تم ناراض تو نہیں ہو؟“ پھر بھی میں نے اپنی تسلی کو پوچھا۔

”ہرگز بھی نہیں۔ وہ تمہارے والدین ہیں.... ان سے ملنے کو میں تمہیں کیوں روکوں گا

.... جاؤ اور جا کر انہیں منالو۔“ وجیہ نے سنجیدگی اور پیار سے کہا۔

”تھینک یو وجیہ! تم بہت اچھے ہو۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”اچھا بس مسک نہیں۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”سنو! میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں پرسوں کریڈٹ کر دیا تھا۔ اپنا اے ٹی ایم لے

جانا.... اور ہاں شموں کو ساتھ لے جانا۔“ اس نے ہاتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ہدایات

دیں۔

”اچھا بابا! لے جاؤں گی..... تم فکرت کرو۔“  
 ”ڈنٹیں! میرا کوئی ہلکا پھلکا ڈریس تو نکال دیتا۔ میں ذرا نہالوں۔“ اس نے ہاتھ روم کا دروازہ بند کرنے سے پہلے درخواست والے انداز میں۔

”یس! مائی لارڈ.....“ میں نے مسکرا کر کالش بجاتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”پوآر آل سو سو سوئیٹ.....“ اس نے ایک فلائنگ کس میری طرف اچھالا اور ہاتھ روم کا دروازہ بند کر لیا۔

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور سکون دیکھ کر مجھے دلی راحت محسوس ہو رہی تھی۔



”ڈنٹیں بھابی! آپ کہاں جا رہی ہو.....؟“ شام کو جب میں اپنی ماما کے پاس جانے کو تیار ہو رہی تھی تو مصوبی کو جانے کہاں سے خبر ہو گئی تھی۔ وہ میرے پاس آ کر لاڈ سے پوچھنے لگی۔  
 ”وہ..... وہ میں مصوبی! میں اپنی ماما سے ملنے جا رہی ہوں۔ وہ مجھے کئی روز سے یاد آ رہی ہیں۔“ میں نے جھوٹ بولے بغیر کہہ دیا۔ حالانکہ میں کوئی بہانہ بھی کر سکتی تھی۔  
 ”ڈنٹیں بھابی! تم مجھے ساتھ لے جاؤ گی؟“ وہ میرے گلے میں ہانپیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

”کہاں..... کہاں جانا ہے تم نے؟“ میں نے اس کے بازو تھام کے اسے اپنے سامنے کر لیا۔

”بھرجائی! میں نے اپنی ایک دوست کو ملنے جانا ہے آپ مجھے ادھر ڈراپ کر دینا اور واپسی پر لے لیتا..... بس۔“ وہ مسکرا کر میرے سامنے بیٹھ گئی اور ڈرینگ ٹیبل سے میرا کاسٹیکلس اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے تم آئی سے اجازت لے لو۔“ میں نے لپ اسٹک کا ایک ہلکا سا شیڈ اپنے لگانے کے لیے منتخب کرتے ہوئے کہا۔

”وہ بھرجائی! ماما کو میں نے کہا ہے کہ میں آپ کو ساتھ لے کر اپنی دوست سے ٹوش

لینے جارہی ہوں اور میں نے بازار سے کچھ کتابیں بھی لیتی ہیں۔ آپ بھی ماما کو یہی بتانا انہیں یہ نہ بتانا کہ آپ اپنی ماما کے کمر جارہی ہو۔ ورنہ وہ مجھے نہیں جانے دیں گی۔“ اس نے مجھے بھی جھوٹ بولنے پر اکسایا۔

”لیکن صنوبی! انہیں پتا چل گیا تو.....؟“ میں ڈر رہی تھی۔

”نہیں چلے گا..... بخت کی مجال کہ وہ کسی کو کچھ بتائے۔“ اس نے ہمارے ڈرائیور کا نام

لیا۔

”لیکن پھر بھی یہ غلط ہے؟“ میرا دل پھر بھی آمادہ نہ ہو رہا تھا۔

”بس دلنشین بھر جائی! تم تو کہتی تھیں کہ ہم دونوں دوست ہیں..... اتنی سی بات پر ہی تم

نے ساتھ چوڑ دیا..... آگے تو بہت مرحلے پڑے ہیں دوستی بھانے کے.....“

”اچھا..... اچھا تم نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہے میں ان سے کچھ بھی نہیں کہوں گی نہ ہی ان

کے سامنے جاؤں گی.... تم جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔“ میں نے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

جو چہ بجارہی تھی۔ مجھے اپنی ماما سے ملنے کی جلدی تھی اور پھر رات بھی تو ہو رہی تھی۔

”بس میں یوں گئی اور یوں آئی۔“ اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور وہ تیزی سے میرے

کمرے سے نکل گئی۔



”میں اپنی ماں کو دیکھوں گی تو..... تو کیا ہوگا.....؟“ میری حالت تو ابھی سے اتنی جذباتی

ہو رہی ہے۔“ میں راستے میں سوچ رہی تھی۔

”اور ماما.....؟ وہ مجھ دیکھ کر کیا کریں گی.....؟ کیا مجھے سینے سے لگا لیں گی یا پھر سے منہ

پھیر لیں گی؟“ میں خود سے سوال جواب کرنے میں گم تھی۔

”میں خود ہی ان کے سینے سے لگ جاؤں گی اور ہاتھ ہاتھ کے معافی مانگ لوں

گی..... تب وہ میری طرف سے منہ نہ پھیر سکیں گی..... میری ماما ایسی بھی کٹھور ہیں۔“ میں نے اپنے

جی کو تسلی دی۔

”بخت! یہاں گاڑی روکو“ صنوبی نے بخت کو گاڑی روکنے کو کہا اس نے گاڑی کے

بریک دیں پر لگا دیے۔



”اچھا بھر جائی! جب آپ اپنی ماما کے گھر سے نکلیں تو مجھے موہا ل پر بتادیں میں یہیں پر آ جاؤں گی۔“ وہ بالکل ہی اچانک راستے میں اتر گئی۔

”یہ..... یہ کہاں اتر رہی ہوتی..... کون سی جگہ ہے یہ؟“ میں نے گھبرا کر گاڑی کے شیشے نیچے کیے۔

ہماری گاڑی جہاں رکی تھی وہ مین روڈ ہی تھا۔

”اچھا بھر جائی! اللہ حافظ..... فکر نہ کرنا میں آ جاؤں گی۔“ صنوبی نے میری بات بالکل سننی اور گاڑی سے اتر کر چیزی سے روڈ کراس کر گئی حالانکہ میں اسے کہتی ہی رہ گئی کہ شموں کو ساتھ لے کر جائے۔

”بی بی جی! وہ چلی گئی ہے آپ آوازیں مت دو۔“

شموں نے میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ دے کر مجھے آوازیں دینے سے روکا ورنہ تو اس وقت اس قدر بوکھلا گئی تھی کہ اسے زور زور سے پکارنے لگی تھی۔

”شموں! وہ کہاں گئی؟“ مارے پریشانی کے میری توجہ جان لیوں پر آ گئی تھی۔

”وہ آجائے گی.....“ شموں کو جانے کیوں یقین تھا وہ میری بھی تسلی کرانے لگی۔

”مگر گئی کہاں اور کس کے ساتھ؟“ مجھے اپنی ذمہ داری کا خوف مارے دے رہا تھا۔

”بی بی جی! وہ سامنے دیکھیں۔“ شموں نے مجھے سامنے کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ مراد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی مجھے ہاتھ ہلا کر بائے کر رہی تھی۔

”اوہ! تو اس کی یہ سہیلی تھی جس کے پاس اس نے نوٹس لینے آتا تھا۔“ مجھے اس کے جھوٹ بول کر آنے پر برا لگا۔ اس نے نہ صرف اپنی ماں سے جھوٹ بولا بلکہ مجھ سے بھی جھوٹ کہا تھا۔ کم از کم وہ مجھ سے تو نہ جھوٹ بولتی..... میرا دل اس کے اس عمل پر دکھ گیا تھا..... مگر وہ سامنے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگتی دکھائی دی تو مجھے بالکل معصوم لگی۔

”یہ محبت بھی نا..... انسان کو کیسا بنا دیتی ہے..... کہیں پر بھی بزدل نہیں رہنے دیتی۔“

مجھے اس وقت صنوبی بالکل اپنے جیسے دکھائی دے جیسے وجہ کی محبت نے مجھے ہر رشتے کے سامنے سینہ پر کر دیا تھا۔

”یا اللہ! اس کی محبت کو کسی کی نظر نہ لگے۔“ میں نے دل سے اس کے لیے دعا کی۔

”بی بی جی! اب چلیں۔“ بخت نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”ہاں ہاں چلو۔“ میری جگہ شموں نے جواب دیا۔

”سن بختے اس بات کا کسی کو علم نہ ہو ورنہ تو جانتا ہے میں تیرے پول کھولنے میں منٹ بھی نہیں لگاؤں گی۔“ شموں نے بخت کا منہ بند کرنے کے لیے اسے دھمکی بھی دے دی۔

”چتا ہے پتا ہے تیری زبان بڑی ٹیکسی ہے۔“ وہ خاصا برا منانا ہوا بولا..... یوں لگ رہا تھا ان دونوں کے منہ میں جیسے اچھے تعلقات نہ ہوں۔

”بخت!“ میں نے مخاطب کیا۔

”جی اوڈی بی بی!“ وہ سر تا پا مودب تھا۔

”پلیز کسی سے کچھ ذکر مت کرنا۔“ میں نے بھی اس سے درخواست کر دی۔

”آپ فکر ہی نہ کریں بی بی جی..... بخت مر تو جائے گا اس کی زبان سے کچھ نہ نکلے گا سمجھیں جی میں نے کج دی نہیں دیکھا۔“ وہ اپنی وفاداری کا پورا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اچھا..... اچھا جل بوہتا وفا دار نہ بن۔“ شموں نے جل کر اسے کہا۔

”بی بی جی کا لحاظ کر رہا ہوں..... ورنہ۔“ اس نے بھی آنکھیں دکھائیں۔

”ورنہ کیا..... اوئے ورنہ کیا؟“ وہ تو جیسے لڑنے کو تیار بیٹھی تھی۔

”شموں! بس کرو۔“ میں نے اسے ذرا سختی سے ڈانٹا تو وہ چپ ہو گئی۔ بخت نے پھر کوئی

بات نہ کی۔

”گھڑی ذرا تیز چلاؤ بخت!“ مجھے اپنی ماما سے ملنے کی بہت جلدی تھی۔

”جی۔“ بخت نے مختصر کہا اور ایکسپریس پر پاؤں دبا دیا۔

❖ ❖ ❖

میں عباسی ہاؤس کے سامنے کھڑی تھی اور میری ہمت اندر جانے کی نہ پڑ رہی تھی۔

”ونٹنیں بی بی! یہ آپ کا اپنا گھر ہے اندر چلیں۔“ شموں نے ہمارے گھر کی کال تیل پر

اٹکی رکھتے ہوئے کہا۔ تیل بجنے کے ساتھ ہی میرا دل میرے کانوں میں آکر دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

ہمارے چوکیدار نے گیت کھولا۔

”کون ہے؟ کون ہے.....؟ آپ! آپ! آپ عصمہ بی بی۔“ وہ باہر نکلتا ہوا پوچھ رہا تھا مگر

مجھ پر نظر پڑتے ہی حیران رہ گیا۔

”بی بی جی آپ؟“ اسے شاید مجھے سامنے پا کر بھی یقین نہ آ رہا تھا۔  
 ”السلام علیکم چاچا!“ میں نے انہیں سر جھکا کر سلام کیا جس پر انہوں نے شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے بہت سی دعائیں دیں۔  
 ”آئیں، آئیں۔“ وہ خوشی سے میرے آگے آگے چلنے لگا وہ چلنے سے زیادہ بھاگنے کے انداز میں تھا۔

”نوراں مامی! نوراں مامی کو آوازیں دینے لگا۔“  
 ”آتے ہیں میاں! آتے ہیں دہائی کیوں چاچا دیتے ہو۔“ وہ اندر ہی سے بولتی آ رہی تھیں۔

”ہٹا! آپ.....“ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر وہ تو وہیں جا رہی تھیں..... کچھ دیر مجھے وہیں سے دیکھتی رہیں..... میں دیکھ رہی تھی ان کے ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں حیرتی نمی کا لون پڑھانے لگی تھی۔

”نوراں مامی!“ میں بھاگ کر ان سے جا ملٹی۔  
 ”مامی! مامی!“ میرے لہجوں سے کچھ اور نہ لگ رہا تھا۔  
 ”میری جان! میں صدمہ تو جاؤں.....“ وہ میرا ہاتھ چومتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔  
 ”اللہ آپ کو خوش رکھے..... آئیں، آئیں۔“ جب وہ خوب پیار کر چکیں خوب دعائیں دے چکیں تو ہاتھ پکڑ کر اندر چل دیں۔

”آئیں! آجائیں۔“ جب ماما کے کمرے کے سامنے پہنچیں تو مجھے کھینچتے ہوئے اندر لے جانے لگیں کیونکہ یہاں پر آکر میرے قدم جانے کیوں من من کے ہو گئے تھے۔  
 ”کون ہے؟ نوراں مامی؟“ اندر سے میری ماما کی کڑوری آواز آئی۔

”ہیو! بیگم کی طبیعت نامسا ہے کئی روز سے.....؟“ میرے ماتھے پر فکر مندی کی لکیریں دیکھ کر انہوں نے میرے دل کی بات جان لی اور خود ہی بتا دیا۔  
 ”کیا؟ میری ماما بیمار ہیں۔“ میں سب کچھ بھول کر اندر چلی۔  
 ”ماما! ماما جان!“ میں انہیں ٹھیک اسی طرح سے پکارتی ہوئی اندر چلی گئی جیسے میں بلایا کرتی تھی۔

”کون؟ کون؟ کون آیا ہے؟“ وہ پشت دوسری طرف کیے ہوئے لپٹی تھیں میری آواز

سن کر چپے تڑپ گئیں۔

”معمصہ!“ مجھے یوں اچانک سامنے پا کر وہ حیران ہی تو رہ گئیں۔

”ماما!“ میں نے آج نہ تو ان کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے نہ ہی موڈ کے اچھے یا برا ہونے کا اندازہ کرنے کی.... سیدھی جا کر ان کے سینے سے لگ گئی۔

”ماما جان.... میری ماما....“ میرے لبوں سے پچکیاں اور آنکھوں سے آنسو جاری تھی۔

”معمصہ!“ انہوں نے اپنے دونوں بازو میرے گرد حائل کیے اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ بچھ لیا۔ پھر کتے پل ہمیں یونہی بیت گئے۔ ہم دونوں ماں بیٹیوں کو کچھ خبر نہ ہو سکی بس ان کی دھڑکتیں تھیں اور میرا سینہ۔ تب ان کا دل میری رگ رگ میں دھڑک رہا تھا اور میرا خلیہ خلیہ ان کا حال دل سن رہا تھا.... اور تڑپ رہا تھا وہ بھی اتنی ہی اداس تھیں بلکہ نہیں..... وہ تو ماں تھیں اور مجھ سے کئی درجہ زیادہ میرے لیے فکر مند اور اداس تھیں۔

”ماما! مجھے معاف کر دیں۔“

”معاف کر دیں ماما.... مجھے معاف کر دیں۔“

میں بہت ہی ہوں میں نے آپ کو بہت دکھ دیے۔ میں قابل معافی نہیں ہوں۔

”میں اچھی بیٹی ثابت نہیں ہوئی۔ مجھ سے بہت بڑی خطا....“

میں سک رہی تھی اور وہ میری کمر پر ہو لے ہو لے اپنے ہاتھ پھیرتی جا رہی تھیں ان کے ہونٹ کچھ نہ بول رہے تھے مگر اس کے لس کہہ رہے تھے۔ ”میں ماں ہوں.... بھلا معاف کرنے کے سوا کربھی کیا سکتی ہوں۔“ میں نے جنہیں معاف کیا، معاف کر دی تمہاری خطا ان سارے لمحوں کے عذاب بھلا دیئے میں نے..... جو تم میری معمولی میں ڈال گئی تھیں جاؤ وہ قیامت کی گھڑیاں بھی میں نے.... درگزر رکھیں جب تم نے ایک ماں کی طرف سے منہ موڑ کر کسی اور سے ناتا جوڑا تھا۔

”ماما! مجھے اپنے عمل کی سختی کا اعتراف ہے کہ میں نے آپ کو سوائے دکھ دینے کے اور

کچھ بھی نہیں کیا۔ بہت دلایا میں نے آپ کو مجھے اعتراف ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

میرے گناہ دانستہ اور صغیرہ تھے۔ مگر پھر بھی مجھے معافی چاہیے میں آج بھی کم طرف ہوں ماما! میں سزا کے عمل سے گزرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی.... اس لیے مجھے آپ معافی ہی درکار ہے۔ ہر حال میں..... اور..... اور آپ جانتی ہیں ناکہ میں کتنی بے مبری اور کیسی بے حوصلہ ہوں۔

بس! بس! اما! اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی.... میں اب آپ کی ناراضی اور خاموشی کا بار مرید نہیں اٹھا سکتی۔ مجھے معاف کریں ماما.... معاف کر دیں۔“ میں روتے روتے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔

اچھا اب بس کرو۔“ ان کے لرزے کانپتے لیوں سے فقط اتنا کلا اور انہوں نے میرے جڑے ہوئے ہاتھ کھول کر ان میں اپنا چہرہ چھپا لیا..... ان کے آنسوؤں سے میری ہتھیلیاں گیلی ہوئیں تو مجھے لگا میری روح میری مساموں میں گھج آئی ہو۔

”ماما! نہیں.... نہیں ماما! اب نہیں..... مت روئیں پلیز۔“ میں نے ان کا چہرہ اپنے سامنے کیا اور ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔

”بس کریں بیگم! ورنہ آپ کی طبیعت اور ناساز ہو جائے گی۔“ نورماں مامی اپنی سیلی آنکھیں صاف کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور ہم دونوں ماں بیٹیوں کو علیحدہ کرتی ہوئی بولیں۔

”بیٹا! گمراہ گئیں اور انہوں نے معافی مانگ لی.... بس سب ٹھیک ہو گیا۔“

”مامی! کوئی چائے دے تو بتائیں۔“ ماما نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا میں نے دیکھا میری ماما کے اندر اس وقت اتنی فضا تھی کہ وہ اٹھ بھی نہ سکیں۔

”آپ لیٹ جائیں ماما۔“ میں نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا اور گاؤں تک ان کی کمر کے پیچھے رکھ کے انہیں نیم دراز کر دیا۔

”میں ٹھیک ہوں.... مجھے بھلا کیا ہوا ذرا سا بخار ہی تو ہے۔“ وہ دوبارہ اٹھنے لگیں۔

”نہیں جی..... آپ رہنے دیں..... اور لیٹ جائیں..... مجھے بتائیں کیا کرنا ہے میں دیکھیں منہوں میں کر دیتی ہوں۔“

شموں جو کافی دیر سے کمرے میں ایک طرف کھڑی یہ ساری جذباتی پچویشن دیکھ کر خود بھی رو رہی تھی آگے بڑھی اور اس نے پیار سے میری ماما کو قہقہے کے دو بارہ ہنسیے پر لٹا دیا۔

”ماما! یہ شموں ہے۔“ میں نے انہیں شموں کا تعارف کرایا۔

”میں شموں ہو جی.... دلنیش بی بی کی ملازمہ..... بلکہ آپ مجھے ان کی کون سی سمجھیں۔“ وہ اپنی ازلی مسکراہٹ کو گہری کرتی ہوئی بولی۔

”ونشیں؟“ ماما نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ہولے سے دہرایا۔

”اور جی لاڈی سائیں نے اب ان کا نام دلنیش رکھ دیا ہے۔“ میرے بولنے سے پہلے

عی شوں نے بتا دیا۔

”دلنیش؟“ ماما نے پھر دہرایا اور ان کے چہرے پر عجیب سا تاؤ آ گیا۔ جیسے انہیں اچھا

نہ لگا ہو۔

”کیا تمہیں اپنے اصل نام سے بھی کچھ پراہم تھی..... عصمہ! کس قدر اچھا نام تھا تمہارا؟ اور یہ کیا بتا لیا تم نے۔ دلنیش؟“ انہوں نے نرمی سے کہا میں محسوس کر رہی تھی کہ ان کے لہجے میں دکھ گھلا ہوا تھا۔

”سوری ماما! وہ بس وجہ نے.....“ مجھے سمجھ ہی نہ آئی کہ میں اپنے اس نئے نام کے رکھے جانے کی کس طرح سے وضاحت کروں۔

”اچھا خیر..... جیسے تم لوگوں کی مرضی۔“ انہوں نے بات کو فوراً ختم کر دیا اور مسکرا دیں..... میں نے دیکھا کہ ماما نے یہ اپنی عادت کے خلاف کیا تھا اور نہ تو وہ کسی بھی بات کو مضبوط دلیل دے کر اسے لازم ثابت کیا کرتی تھیں اگر وہ انہیں غلط لگتی تو غلط اور اگر سچ لگتی تو سچ..... جو انہیں برا لگتا وہ اسے بھی برا کہنے کا مکمل اعتماد اپنے اندر رکھتی تھیں..... لیکن آج وہ کیسے فوراً ہی بات کو ختم کر گئیں..... ان کی خود اعتمادی میں مجھے اس لمحے کئی دراڑیں دکھائی دیں..... اور یہ دراڑیں میری لگائی ہوئی ضربوں کی بدولت ہی تھیں مارے عداوت کے میری لگا ہیں اور بھی جھک گئیں۔

”سوری ماما!“ مجھے جب کچھ اور نہ سوچا تو میں نے پھر سوری کہہ کر اقرار جرم کر لیا اور معافی مانگ لی۔

”اچھا چھوڑو..... کوئی اور بات کرو۔“ وہ آج مجھے شرمندہ ہوتا دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔

”آہ! بیٹیوں کے دکھ بھی کس قدر شدید ہوتے ہیں ماؤں کی تو کسریں ہی توڑ ڈالتے ہیں..... اور پھر وہ دکھ..... جو مجھ جیسی بری بیٹیاں اپنی ماؤں کے دامن میں اپنی غرض کے لیے ڈال کر چلتی بنتی ہیں۔ اف! وہ وہ محض دکھ نہیں ہوتے..... لاوا ہوتے ہیں ابلتا ہوا جو متا پھر بھی برداشت کر جاتی ہے۔“ میں نے ان کے ہاتھ تمام کے اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

”عصمہ! تم خوش تو ہونا؟“ میری ماما کی ڈری سہی سی آواز آئی..... جیسے وہ سوال کرنے سے ہراساں ہوں..... اور جیسے اس کے منفی جواب کو برداشت کرنے کی ان میں سکت نہ ہو۔

”ہاں ماما!..... میں خوش ہوں..... بہت خوش۔“

میں نے انہیں یقین دلانے کے لیے اپنے چہرے پر مسکراہٹ کو گہرا کرتے ہوئے کہا۔  
 ”الحمد للہ.....“ انہوں نے ایک اطمینان بھری گہری سانس لی۔  
 ”میرا رب بڑا رحیم ہے۔ وہ میری دعاؤں کو سنتا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔  
 جس کا مطلب تھا کہ وہ دن رات میرے سکھ کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں۔  
 ”شموں جاؤ تم نور اں مامی کے ساتھ کچن میں جا کر ان کی مدد کرو۔“ میں نے شموں کو  
 وہاں سے ہٹانے کے لیے کہا۔

”جی ڈی بی بی.....“ وہ بالکل بھی برا منائے بغیر جانے کو تیار ہو گئی۔  
 ”بھیا! یہ آتو جانیں مگر ہم کام خود ہی کر لیں گے..... مدد کی ضرورت نہیں۔“ نور اں مامی  
 نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور شموں کو اپنے ساتھ لے گئیں۔  
 ”ماما! وجہ بہت اچھا ہے۔“ میں نے دوبارہ ان کے ہاتھ تھام لیے اور انہیں پیار سے  
 تھپتھپانے لگی۔

”اللہ کا کرم ہے۔“ وہ میرے چہرے کو پیار سے دیکھنے لگیں۔  
 ”اور اس کے گمراہ لے.....؟“  
 ”وہ..... وہ ماما، وہ بھی بہت اچھے ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا کہتے ہوئے میرا لہجہ  
 ٹوٹ گیا۔

”ہو..... س..... س.....“ جواب ماما کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی۔  
 ”اچھا تم میرے کام لیتا..... اور اپنے اچھے سلوک سے ان کا دل موہنے کی کوشش کرتی  
 رہتا۔“ وہ مجھے سمجھانے لگیں۔

”جی ماما.....“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔  
 پھر کچھ ہی دیر میں ہم ماں بنی آپس میں ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے ہمارے بچ کچھ بھی  
 نہ ہوا ہو اور میں بالکل ایک نارمل انداز میں اپنے میکے آئی ہوں..... یہ اللہ تعالیٰ نے ماں کا دل بھی  
 کیسا بنایا ہے..... سراسر درگزر اور مہربانی سے گوندھ کر۔  
 اولاد خواہ کیسی بھی بری ہو مگر ماں اسے پھر بھی کلیجے سے ہی لگاتی ہے۔ خود اپنی مثال سے  
 یہ بات مجھ پرچ ثابت ہو چکی تھی۔

”ماما! آپ بہت اچھی ہیں۔“ میں نے ایک بار پھر ان کے ہاتھوں کو اپنے لبوں سے

لگا لیا۔ آج مجھے واقعی بے حد اچھی لگ رہی تھیں۔

”میں تو ویسی ہی ہوں..... البتہ تم بدل گئی ہو۔“ وہ میری طرف پیار سے دیکھتی ہوئی معنی خیز انداز میں بولیں۔

”ہاں..... میں تو بچ بچ بدل گئی ہوں۔“ میں نے بغیر کسی جھجک کے اقرار کر لیا کہ درحقیقت ایسا ہی تھا..... بدلی تو میں ہی تھی..... مجھے ہی اب توفیق ہوئی تھی اپنی ماں کی طرف پیار سے دیکھنے کی۔ ورنہ وہ تو سدا سے اچھی ہی تھیں۔

”یہ بھی میرے مالک کا احسان ہے کہ اس نے تمہاری سوچ کو نرمی بخشی۔“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے اپنے اللہ کا ہی شکر ادا کر رہی تھیں۔ یہ میری ماما کی عادت تھی کہ وہ ہر لحظہ اللہ ہی کا شکر ادا کرتی تھیں۔

”میں آج پھر دل و جان سے ایمان لاتی ہوں اچھی اور بری تقدیر پر کہ وہ اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔“ ان کی آنکھیں پھر سے پھر آئیں۔

”ماما!“ میں نے تڑپ کے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔

”واقعی جو ہوا۔ وہ اللہ ہی کی جانب تھا۔ میرا اللہ آگے سب اچھا کر دے۔“ وہ میری شادی کے متعلق کہہ رہی تھیں کہ جس طرح سے وہ ہوئی وہ اللہ کی رضا ہوگی۔

”بس ماما! آپ مجھے دل سے معاف کر دیں اور میرے لیے دعا کرتی رہا کریں۔“ میں نے ان سے دعا کی استدعا کی۔

”تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ مسکرا دیں۔

”میری ماما!“ میں نے بھی مسکرا کر ان کے کندھے سے اپنا سر ٹک دیا۔ کتنی آسانی سے یہ سب ہو گیا تھا، جسے میں ناممکن سمجھ کر خود کو کب سے روکے بیٹھی تھی۔ کاش میں پہلے ہی آجاتی اور آ کر اپنی ماں سے معافی مانگ لیتی۔

میری ماما اتنی پیار تو نہ ہوتیں۔

میری ماما میری وجہ سے پیار ہوئی تھیں۔

میرے ہی صدمے نے ان کی قوت مدافعت چھین لی تھی۔

میری ہی پریشانی اور فکر نے ان کے اچھے بھلے صحت مند دل کے خلیے کمزور کر دیے تھے

میری ماما انجانا ہی مریضہ ہو گئی تھیں..... اور یہ سب میرے ہی سبب ہوا تھا۔ کاش میں انہیں اس قدر



نہ ستاتی۔

یا پھر اپنا اقرار جرم کرنے میں اتنی دیر نہ لگاتی۔ مجھے اپنے آپ سے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی اور میرا اندر مجھے کچھ کے لگا رہا تھا۔ میں نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا وہ کتنی زرد اور پژمردہ دکھائی دے رہی تھیں اتنے میں نوران مای آگئیں اور انہوں نے آتے ہی چائے کی ٹرالی میرے آگے کر دی۔

”اب آپ خود بھی چائے پئیں اور بڑی پیگم کو بھی کچھ کھلا دیں۔ آج انہوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

”ماما جان! یہ کیا ہوا آپ تو مجھے ہر وقت ڈانٹتی تھیں اور اب خود.....؟“ میں نے انہیں پیار سے سرزنش کی۔

”تب میں تمہاری ماں تھی اور اب لگتا ہے کہ تم میری ماں بن جاؤ گی۔“ وہ شرارت سے بولیں۔

میری ماما ایسی ہی تھیں جہاں بہت زیادہ سمجھانے اور نصیحتیں کرنے والا سخت روپیہ رکھتی تھیں وہیں جب خوش ہوتیں تو مذاق بھی کرتیں اور لپٹنے بھی (کبھی کبھی) سنا دیا کرتی تھیں۔

”میری ماما جان!“ مجھے ان پر ڈھیر سارا پیار آ گیا میں نے شامی کباب کا ٹکڑا ان کے منہ میں ڈالتے ہوئے پیار سے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

”ماما! بابا کہاں ہیں؟“ مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ پچھلے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے تو میں صرف اور صرف اپنی ماما میں گم تھی بابا کا تو پوچھا ہی نہ تھا۔

”وہ آج گھر پر نہیں ہیں کام کے سلسلے میں حیدر آباد گئے ہوئے ہیں رات کو کسی وقت لوٹیں گے۔“ انہوں نے مجھے بتایا۔

”رات کو کسی وقت؟“ ان کے لیے میرا دل اداس ہونے لگا۔

”ہاں تو کیا تم آج رات رکو گی نہیں.....؟“ وہ مجھے پریشان ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”نہیں ماما آج نہیں۔“ میں نے انہیں بتایا۔

”لیکن میں اگلے پختے آؤں گی تو رہوں گی ایک دو روز۔“ میں نے ان کے چہرے پر

اداسی اترتے دیکھ کر فوراً پھر آنے کا وعدہ کر لیا۔

”اچھا..... جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ ڈھیلی سی آواز میں بولیں۔

ہم لوگ ابھی چائے پی رہے تھے جب نوران مامی نے آکر اطلاع دی۔  
 ”بیوی بیگم! بیوی بیگم ذرا ٹی وی پر خبریں تو دیکھیں.....“ ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

”کیوں کیا ہوا؟“ ماما اور میں دونوں ایک ہی پولیس۔

”وہ..... وہ کسی سیاسی پارٹی کا کوئی بندہ قتل ہو گیا ہے اور باہر ہنگامے شروع ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے اتنی خبر ہمیں سنادی جتنی انہیں خود معلوم ہو سکی تھی۔

”کک..... کون مارا گیا..... اور تمہیں کس نے بتایا۔“ ماما بے حد پریشان ہو گئیں۔

”شریف بتا رہا ہے..... آپ خود دیکھیں ذرا.....“ نوران مامی نے بتاتے ہوئے

ساتھ ہی ریوٹ ماما کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”یا اللہ خیر.....“ ماما نے ٹی وی آن کیا..... اور پھر اس پر جو دکھایا جا رہا تھا اسے دیکھ کر ہم سب کے دل مٹی میں آ گئے۔

کوئی سیاسی لیڈر قتل ہوا تھا اور خدا جانے کس نے یہ برا کام کیا تھا۔ مگر جس نے بھی کیا تھا اس نے سو کچے بکس میں ماچس کی تیلی جلا کر پھینک دی اب پورا شہر آگ کی لپیٹ میں تھا۔ دکانوں اور گاڑیوں کو نذر آتش کیا جا رہا تھا..... بے گناہ اور معصوم لوگوں کو سرعام گولیاں ماری جا رہی تھیں۔ یوں تو پورے شہر کا امن ہی خطرے میں پڑ چکا تھا مگر یہاں جہاں میرا میکا تھا یہ کالونی تو سب سے زیادہ حساس صورت حال اختیار کر چکی تھی۔

”یا اللہ خیر.....“

”یا اللہ رحم.....“ ہم سب کے دل ہی نہیں ہونٹ بھی کانپتے ہوئے دعائیں کر رہے

تھے۔

ہمیں ٹی وی پر یہ اندوہناک خبریں سننے اور شہر چراغاں کی سڑکوں اور گلیوں میں بے خطا لوگوں کے خون کو بہتے دیکھتے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی جب نیوز کاسٹر نے نیوز الرٹ میں بتا دیا کہ امن و امان کی نازک صورت حال کے پیش نظر چند علاقوں میں کرفیو نافذ کرنے کے احکامات دے دیے گئے ہیں۔

”کرفیو.....؟“ میرا خوف سے لرزتا دل سینے میں ہی برف ہو گیا اور میرے دل و دماغ

سانسیں سانسیں کرنے لگے..... کیونکہ جہاں جہاں کرفیو نافذ ہوا تھا ان میں ہماری یہ کالونی بھی

شامل تھی۔

”یا اللہ تو سب کی خبر کرنا..... اپنی حفظ و امان میں رکھنا سب کو جانے تیرے کون کون سے بندے اس وقت موت کے منہ میں ہیں۔“

”مامی! ذرا مجھے موبائل تو دیں میں عصمہ کے بابا کو فون کروں..... وہ آج حیدر آباد ہی رکس وہاں سے مت چلیں۔“ ماما جان نے انتہائی فکر مندی سے کہا..... وہ بابا کو فون کرنے لگیں اور میرا سارا دھیان وجیہ کی طرف چلا گیا۔ میں ابھی اسے فون کرنے کو اٹھی ہی تھی جب اس کا فون نمبر میرے موبائل پر چپکنے لگا میں نے جلدی سے یس کا بٹن دبایا۔

”جی وجیہ! السلام علیکم.....“

”وعلیکم السلام! کہاں ہو تم.....“ اس کی آواز میں پریشانی صاف طور پر عیاں تھی۔

”میں تو..... میں تو ابھی..... ماما کے گھر پر ہی ہوں۔“ میں نے صاف اسے بتایا۔

”تو بس ٹھیک ہے تم وہیں پر رکنا جب تک باہر حالات بہتر نہ ہوں..... بلکہ بلکہ تم ایسا کرو کہ بخت کو جلدی سے واپس بھیج دو..... اور تم رات کو رک جاؤ میں تمہیں خود لے جاؤں گا جب ذرا بھی حالات میں نرمی ہوئی۔ دیکھو تم ہرگز بھی اس کے ساتھ آنے کی کوشش نہ کرنا..... تم سمجھ رہی ہونا میری بات۔“ وہ مجھے سمجھا رہا تھا اور بہت زیادہ فکر مند اور پریشان تھا میرے لیے۔

”اچھا ٹھیک ہے وجیہ..... پر تم کہاں ہو؟“ مجھے خود سے زیادہ اس کی فکر تھی وہ بھی تو گھر

پر نہ تھا۔

”میں جہاں بھی ہوں..... ٹھیک ہوں..... محفوظ ہوں..... تم میری فکر نہ کرنا۔“ وہ

مجھے تسلی دے رہا تھا۔

”اچھا بہتر ہے..... اپنا خیال رکھنا۔“ میں نے سکون کی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

”وہ صوبی کہاں ہے.....؟ ذرا اس سے تو میری بات کراؤ..... میں اسے تسلی دوں ورنہ

وہ تو گھبرا جائے گی..... وہ کبھی گھر سے باہر کہیں رات کو رکی نہیں ہے نا اچانک ہی وجیہ نے صوبی کے بارے میں پوچھ لیا۔

”مس..... و..... بی.....؟“

ایک کرنٹ میری رگ و پے میں دوڑا اور موبائل سیٹ میرے ہاتھ سے گر گیا!!!!

”ڈنٹشیں!“

”ڈنٹشیں!“ وجہ مجھے آواز میں دے رہا تھا اور میں اس کی آواز کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔ میں اسے کیسے اور کیا بتاتی کہ صنوبی میرے ساتھ نہیں ہے۔ میرے سامنے پڑے موبائل میں سے وجہ کی آواز پھر سے ابھری۔

”ڈنٹشیں! کیا ہوا؟ میری آواز سن رہی ہو یا نہیں؟ کیا سگنل کا کوئی پرابلم ہے۔؟“  
 ”سگنل ہاں۔ سگنل۔“ میں نے فون اٹھایا اور بند کر دیا تا کہ وجہ سبجے واقعی سگنل کا مسئلہ

ہے۔

”کیا ہوا ڈنٹشیں بی بی؟“ شموں عین میرے سر پہ کھڑی پوچھ رہی تھی میں نے صرف اسے نظر بھر کے دیکھا میری آواز تو میرے گلے میں انک جکلی تھی۔

”سائیں کو پتا چل گیا ہو گا کہ صنوبی بی بی ہمارے ساتھ آئی ہے وہ اس کے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ وہ میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور میرے رخ ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں دبا کر مسکرائی۔ پھر بولی۔

”بی بی صاحبہ! لاڈی سائیں کو صنوبی سے بہت پیار ہے۔ بہت زیادہ۔ وہ اگر اپنے گھر میں کسی پر جان چڑھتے ہیں تو وہ صنوبی ہی ہے۔“

شموں مجھے بتا رہی تھی اور میرے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ میرے رونیں رونیں میں برف آگ رہی تھی۔ جس کی جڑیں میرے لہو کو جمارہی تھیں۔

”شموں! اب کیا ہوا؟“ مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”رب خیر کرے گا۔ آپ ذرا صنوبی بی بی کو تو فون کرو۔“ وہ میرے ہاتھ دبا کر مجھے

حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

”صنوبی کوفون۔“ میرے اندر ذرا سی جان آئی۔ اس نے میرا موبائل اٹھایا اور صنوبی کا نمبر ملا کر مجھے تھما دیا۔ دوسری ہی منٹ پر صنوبی نے فون اٹینڈ کر لیا تھا۔

”بھرجائی! یہ کیا ہو گیا؟“ وہ ایک دم سے حالات کے گنبد ہو جانے مجھ سے بھی زیادہ پریشان لگ رہی تھی۔

”تم..... تم کہاں ہو صنوبی۔؟“ میں نے فٹ پوچھا۔

”ہم لوگ یہاں پر ہیں کلکشن کے ایک کیفے میں۔“ وہ تقریباً روہنے کو تھی۔

”کلکشن۔“ میرے سوکھے ہوئے حلق میں مزید کانٹے چبسنے لگے کلکشن اور ہمارے گھر میں کئی کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ اور پھر ہماری کالونی اور ارد گرد کے علاقوں میں جو کچھ دیر قبل قتل و غارت ہوئی تھی اس کے پیش نظر یہاں پر کرفیو لگ چکا تھا۔

”صنوبی! اب کیا کریں۔ وجیہ کا فون بھی آچکا ہے اور وہ تمہارا پوچھ رہا تھا۔“ میں نے اسے بتا دیا۔

”بھاجی کا فون؟“ اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی ہو۔

”ہاں وجیہ کا فون؟“ میری کیفیت بھی اس سے جدا نہ تھی۔

”آپ نے کیا کہا؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا اور فون بند کر دیا۔“ میں نے اسے کہا۔

”فون بند کر دیا۔ فون بند نہ کریں۔ کھولیں اسے فوراً ورنہ بھاجی پریشان ہو کر جانے کیا کر بیٹھیں۔“ اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ اچھا میں اپنا موبائل آن کرتی ہوں۔“ وہ میرا دوسرا موبائل تھا جس میں موجود سم کا نمبر صرف وجیہ کے لیے تھا اور مجھے بھی یہی حکم تھا کہ میں وجیہ کو صرف اسی نمبر سے فون کروں۔ عام ضروریات کے لیے میرے پاس دوسرا سیٹ اور دوسرا نمبر تھا۔ اسی طرح وجیہ کے پاس جو پرسنل نمبر تھا وہ صرف میرے لیے تھا۔ میں نے فوراً اپنا دوسرا نمبر آن کیا۔ جس پر وجیہ کے دو ایس ایم ایس چمک رہے تھے۔

”صنوبی! میں تمہیں ابھی فون کرتی ہوں۔“ میں نے اسے جلدی سے کہا اور فون آف کر کے وجیہ کا پیغام پڑھنے لگی۔

”ڈیئر! میں بے حد پریشان ہو گیا ہوں۔ تم اور صنوبی میری دو آنکھیں ہو۔ اور تم دونوں

کے بغیر میری زندگی اندھیر ہے۔ تم لوگ ذرا بھی غفلت مت برتنا جہاں پر ہو وہیں رکو میں کچھ کرتا ہوں۔“ میری تو اور بھی جان نکل گئی تھی یہ پیغام پڑھ کر۔

”عصمہ! بیٹی! کیا ہو گیا۔ کہاں رہ گئی ہو؟“ میری ماما کی فقاہت بھری آواز آئی وہ ہولے ہولے چل کر میرے پاس آچکی تھیں۔

”اما! آپ یہاں۔؟“ میں نے آگے بڑھ کر انہیں تھاما۔

”آپ کیوں آئیں ماما؟ چلیں آرام کریں۔“ میں انہیں واپس ان کے کمرے کی طرف

لے جانے لگی۔

”تم نے جواتی دیر لگا دی۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ خیر تو ہے؟“ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی پریشانی سے پوچھ رہی تھیں کیونکہ میں ان سے اپنے چہرے کے فق رنگ کو چھپانے سکی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں ماما! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے انہیں بیڈ پر دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا۔

”ان شاء اللہ تعالیٰ ابھی سب حالات قابو میں آجائیں گے۔ صبح تک کرفیو میں نرمی ہو جائے گی۔“ وہ مجھے تسلی دینے لگیں۔

”جی ماما! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے انہیں سینے تک کھیل اوڑھایا اور پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ دبانے لگی۔

”تم نے اپنے شو ہر کفون کر کے سب بتا دیا نا؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

”جی جی بتا دیا ماما۔“ میں نے نظریں چرا لیں۔

”عصمہ!“ انہوں نے اٹھ کر بیڈ کی پٹی سے سہارا لیا اور میرا چہرہ پڑھنے لگیں ان کی نظریں سوال بن کر میرے چہرے پر سرسرا رہی تھیں جیسے پوچھ رہی ہوں۔ وہ آدھا جج جو میں اس وقت نا صرف ماما سے بلکہ وجیہ سے بھی چھپا رہی تھی۔

”عصمہ!“ ان کی آواز نے مجھے دوبارہ ٹھوکا دیا جیسے وہ میرے منہ میں رکی ہوئی بات

سننے کو بے تاب ہوں۔

”ماما! وہ میں کیا کرتی مصنوعی زبردستی ضد کر کے میرے ساتھ آگئی تھی۔“ بے ساختہ ہی میرے لب کھل گئے۔

”صنوبی کون؟“ ماما کی کمزور آواز نے لرزاتے ہوئے پوچھا۔ وہ بھلا کب صنوبی کو جانتی

تھیں۔

”وجیبہ کی چھوٹی بہن۔“ میں نے چور بنتے ہوئے کہا۔

”وجیبہ کی بہن؟ اب کہاں ہے وہ؟“ ماما کی نرم گرفت میرے ہاتھ پر سخت ہو گئی۔

”وہ۔ وہ۔ ماما۔ وہ؟“ میں اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹھیلنے لگی مجھے سمجھ نہ آ رہی تھی

کہ میں انہیں کیا بتاؤں۔

”وہ جی چھوٹی بی بی نے کچھ شاپنگ کرنی تھی اور کچھ نوٹس لینے تھے وہ اپنی ایک سیکیلی کے

گھر چلی گئی تھیں راستے سے ہی۔“ مجھ سے پہلے شموں نے انہیں بتا دیا۔

”تم چپ رہو۔ عصمہ خود بتائے گی۔“ ماما نے شموں کو جھڑک دیا وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

”عصمہ مجھے اندازہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے لگی ہو گی مگر مجھ سے سچ ہی کہنا۔“ وہ شاید

میری بے چینی سے میری اندرونی کیفیات کا اندازہ لگا چکی تھیں۔

”ماما! وہ زبردستی میرے ساتھ آئی تھی اور اس نے مجھے یہی کہا تھا کہ وہ اپنی سیکیلی کے گھر

جائے گی مگر وہ راستے میں ہی اتر گئی اور اپنے ماموں زاد کزن کے ساتھ چلی گئی۔“ میں نے انہیں

پورا سچ بتا دیا جسے سن کر ان کے چہرہ کارنگ فق اور سانس تیز تیز چلنے لگیں۔

”عصمہ! یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ تم نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔“ ان کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ ابا

جان بھی گھر پر نہیں تھے۔ میں نے فوراً نوران ماما کو آواز دی وہ بھاگی چلی آئیں۔

”کیا ہوا۔ بیٹا کیا ہوا؟“ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھیں۔ ہم نے جلدی سے ماما کو سنبھالا

انہیں دوا دی اور نوران ماما نے ان کی کمر کو ایک مخصوص انداز میں دبا دیا۔ ماما کی زبان تلے گولی

رکھی۔ تب کہیں جا کر ماما ذرا سنبھلیں ورنہ تو میری ماما منٹوں میں ہاتھوں میں آگئی تھیں۔ ماما کس قدر

کمزور اور بیمار ہو گئی تھیں۔ کیسی اذیت ناک بیماری میری ماما کو دیکھ کی طرح چائے لگی تھی۔ مجھے

اک احساس شرمندگی نے گھیر لیا۔ اور میرا ضمیر مجھے اس کی وجہ گردانے لگا۔

”عصمہ!“ ماما کی نقاہت بھری آواز آئی۔

”جی ماما۔“ میں ان پر جھک گئی۔

”میری بیٹی! اپنے شوہر کو بتا دے اصل بات۔“ انہوں نے صنوبی کی بات کو اپنے دل پر

لے لیا تھا۔

”جی۔ جی میں ابھی بتاتی ہوں۔“ میں نے انہیں تسلی دینے کو کہا۔  
 ”دیکھو! بات کتنی بھی حساس کیوں نہ ہو مگر اپنے شوہر سے کبھی نہ چھپانا۔ اسے بتا دو اس سے پہلے کہ بات کھل جائے۔“ وہ میری طرف بے حد فکر مندی سے دیکھتی ہوئی بولیں۔  
 ”ماما! میں بتاتی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے انہیں تسلی دی اور ان کے سامنے اپنے موبائل پر نمبر ملاتی ہوئی ان کے قریب سے اٹھ گئی۔



میں نے سچ و جھوٹ کو کئی بار فون کیا مگر اس رات جانے نیٹ ورک کا مسئلہ تھا کہ میرا فون پر اس کے ساتھ رابطہ نہ ہو سکا۔ میں نے ماما کو یہی کہہ دیا تھا کہ میری وجہ سے بات ہو گئی ہے اور وہ تھوڑا غصہ ہونے کے بعد ٹھیک ہو گئے ہیں۔ میں واقعی ان کے ساتھ جھوٹ بول گئی تھی۔ مصلحتاً ہی سہی۔ میں نے ماما کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا دوا دی اور ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھی ان کا سر سہلاتی رہی۔ پاؤں پر گیسرین لگا کر مساج کرتی رہی اور جب وہ گہری نیند سو گئیں تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”شموں!“ میں نے پریشانی سے شموں کو آواز دی جو میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں آئی تھی۔

”جی دلنشیں بی بی!“ وہ فٹ میری پشت پر کھڑی ہو کر میرے کندھے دبائے لگی۔

”شموں!“ میں نے اس کے ہاتھ تمام کے اسے اپنے سامنے کر لیا۔ مجھے اس وقت شموں سے بڑھ کر کوئی بھی اپنا ہدم نہ لگ رہا تھا۔

”شموں! اب کیا ہوگا؟“ صنوبی کی وجہ سے اس وقت اتنی ڈپریشن مچی کہ رونے لگی تھی۔

”رب خیر کرے گا بی بی جی! آپ روئیں مت۔“ وہ مجھے حوصلہ دینے لگی صنوبی نے کچھ دیر پہلے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی ناسکی طرح سے اپنی اس دوست کے گھر چلی جائے گی جس کا نام لے کر وہ میرے ساتھ گھر سے آئی تھی۔ پھر بھی میرے دل کو قرار نہ تھا اور عجیب عجیب سے وہم اور ہول مجھے کھائے جا رہے تھے۔ ہم دونوں پریشان تھیں مگر وہ مسکرا مسکرا کر مجھے بہلا رہی تھی۔ میری آنکھیں کبھی اس کے چہرے پر جاتیں اور کبھی ٹی وی اسکرین پر جہاں ہل ہل کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ فائرنگ کے بعد ایک بم دھماکا بھی ہو چکا تھا جس کی وجہ سے ہسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ تھی



زنجی دم توڑ رہے تھے اور باہر ہنگامہ بڑھ رہا تھا۔ کسی بھی طرح نہیں لگتا تھا کہ صبح تک حالات بہتر ہو جائیں گے۔

رات کے اڑھائی بج چکے تھے مگر ہم دونوں جوں کی توں ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھیں اور اب تو خبریں بھی بار بار ریپٹ ہی ہو رہی تھیں شام سات بجے ہونے والی قتل و غارت کی خبریں اب میڈیا کے لیے اتنی گرم نہ رہی تھیں کہ وہ تازہ ترین صورتحال پر تبصرے کرتا۔ شموں اٹھی اور جا کر میرے لیے کافی بنالائی۔ میں بے حد تھکی ہوئی تھی مجھے اس کی ضرورت بھی تھی۔

”شموں! تم بہت اچھی ہو۔“ میں نے دل سے اس کی تعریف کی۔

”آپ بھی بہت اچھی ہو۔“ وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”رب آپ کو ہر گرم ہوا سے بچائے۔“ وہ اپنے گداز ہاتھوں سے میرے پاؤں کے نگوے سہلانے لگی۔ ہم دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ جب میرے موبائل پر بیل ہوئی وجیہ کا نام چمک رہا تھا۔ میں نے دوسری ہی بیل پر فون آن کیا۔

”السلام علیکم وجیہ! کیسے ہو؟“ اس کے بولنے سے قفل ہی میں بولی۔

”علیکم السلام میں ٹھیک ہوں۔ اور تمہارے گیٹ پر ہوں فوراً تم لوگ باہر آ جاؤ۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”ہمارے گیٹ پر۔“ میری ساری جان کھینچ کر میرے پیروں کے انگلیٹھوں میں چلی گئی۔

”ڈنٹیش جلدی کرو۔ پلیز۔ تم لوگ فوراً باہر آؤ۔ میں اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر آیا ہوں ورنہ ان حالات میں تم لوگ جانے کب تک یہاں پھنسے رہتے۔“ اس نے مجھے جلد سے جلد باہر آنے کو کہا اور فون بند کر دیا۔

”شموں!“ میں نے بمشکل اس کا سہارا لیا ورنہ تو یقیناً گر جاتی۔

”بہت کریں بی بی۔“ وہ بھی سمجھ تو رہی تھی کہ اب باہر کھڑی قیامت کا سامنا کرنا میرے بس کی بات نہیں پھر بھی مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔ اس نے جلدی سے میرا ونڈ بیگ اور چیزیں سمیٹیں۔ میں نیچے پاؤں کھڑی تھی اس نے میرے سلیپر تک میرے پاؤں میں ڈالے۔

”چلیں بی بی۔ لاڈی سائیں زیادہ دیر انتظار کریں گے تو غصہ ہوں گے۔“ وہ میرا ہاتھ تھام کے مجھے کھینچ رہی تھی اور میرے پاؤں تھے کز مین میں گڑے ہوئے تھے بل ہی بند ہے تھے۔

”شموں! صنوبی؟“ میری آواز جانے کہاں سے آئی۔ بالکل مردہ آواز۔

”بی بی! آپ باہر تو چلیں۔ سائیں کو میں بتا دوں گی۔“ وہ مجھے کھینچ کے چل پڑی۔  
 ”شموں! رک!“ میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ماما کے کمرے کی طرف چل دی۔  
 پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں اب دوبارہ شاید اپنی ماما سے نسل سکوں گی۔ جانے اب کیا ہوگا؟  
 میری چھٹی حس مجھے کوئی اچھے الارم بندے رہی تھی۔

”ماما!“ میں جاتے ہی ان کے پیروں میں بیٹھ گئی اور بے ساختہ ان سے لپٹ گئی۔  
 ”لگ۔ لگ۔ کون؟“ وہ جو دوا کے زیر اثر گہری نیند میں تھیں میرے لمس سے چونک  
 اٹھیں۔

”ماما! میں عصمہ۔“ میں نے ان کے پیروں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔  
 ”عصمہ! اٹھو۔ اٹھو۔ ایسے کیوں کر رہی ہو؟“ انہوں نے تڑپ کر مجھے اٹھایا اور سینے  
 سے لگا لیا۔

”ماما! مجھے معاف کر دینا آپ نے؟“ میں اب بھی یقین کرنا چاہ رہی تھی۔  
 ”میری جان! میری بیٹی! میرے پاس سوائے تیرے اور ہے کیا؟“ وہ میری پیشانی پر  
 بوسہ دے رہی تھیں۔ اتنے میں میرا موہا ل پھر بجنے لگا۔  
 ”بی بی جلدی کریں۔“ شموں نے مجھے ماما سے الگ کیا۔  
 ”کہاں۔ کہاں۔ کہاں جا رہی ہو اس وقت؟“ وہ ہمیں یوں باہر جانے کو تیار دیکھ کر مزید  
 پریشان ہو گئیں۔

”جی وہ صاحب لینے آ گئے ہیں۔ باہر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“ شموں نے میری ماما کو  
 بتایا۔

”وجہ کیا ہے اور باہر کھڑا ہے؟“ وہ حیرانی اور پریشانی سے مجھے دیکھنے لگیں۔ جیسے کہہ  
 رہی ہوں۔ اسے اندر کیوں نہیں لے کر آئی ہو؟“  
 ”ماما! وہ بڑی مشکل سے اپنے کسی دوست کی مدد سے یہاں پہنچے ہیں۔“ میں نے ان  
 کے کیے سوال کا جواب دیا۔

”اچھا۔ اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ بلکہ رکو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔“ وہ میرے ساتھ ہونے  
 لگیں۔

”آپ رہنے دیں ماما! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے انہیں وہیں رکنے کو

کہا مگر وہ نہ مانیں اور چادر اوڑھ کے میرے ساتھ چل پڑیں نور ایں مای بھی جاگ ہی رہی تھیں وہ بھی فوراً ہمارے ساتھ چل پڑیں۔

”ہم بھی تو داماد جی کے سر پر ہاتھ پھیر دیں۔ ارے دیکھ تو لیں انہیں۔“ وہ وجیہ سے ملنے کو بے تاب تھیں۔

چوکیدار نے ہمیں گیٹ کی طرف آتے دیکھ کر فوراً گیٹ کھولا۔

”لاڈی سائیں! ذرا اندر آ جائیں بڑی بی بی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ شموں نے جھٹ گیٹ سے باہر نکل کر گاڑی تک جا کر کہا جس پر وجیہ بھی فوراً اندر آ گیا۔

”السلام علیکم جی۔“ وہ میری ماما کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہوا احترام سے بولا۔

”وعلیکم السلام۔“ ماما نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ڈھیروں دعائیں دیں نور ایں مای نے بھی وجیہ کے سر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بہت دعائیں دیں۔

”اچھا جی اجازت! کوئی اور وقت ہوتا تو میں ضرور بیٹھتا۔ ابھی آپ کو پتا ہے کس قدر حساس حالات ہیں۔“ وجیہ نے ماما سے اجازت چاہی۔ شموں نے میرا ہاتھ کھینچا اور جلدی سے مجھے لے کر گاڑی میں آ بیٹھی۔ چند لمحوں کے بعد وجیہ بھی آ گیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا جو دوست تھا وہ پولیس یونین فارم میں تھا اور ایس بی تھا مجھے اسے دیکھتے ہی سمجھ آ گئی تھی کہ وجیہ کرفیو کی پابندی کے باوجود ہمیں لینے کس طرح آ گیا۔

ہم میسرٹی سے نکلے تو وجیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ”صنوبی کہا ہے؟“ ہم دونوں کو دیکھ کر اور صنوبی کو ہمارے ساتھ نہ دیکھ کر اس کا پہلا سوال یہی تھا۔ گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور ایک جھلکے سے وہ رک گئی۔

”صنوبی کہاں ہے؟“ اب وجیہ کے لہجے میں سختی اور آنکھوں میں آگ تھی۔

”وہ۔ وہ سائیں ماریہ بی بی انہیں لے گئی تھیں۔ انہوں نے یونیورسٹی کے کسی کام سے کہیں جانا تھا۔“ شموں نے جھٹ سے جواب دیا۔

”کب؟“ وجیہ کے تنے ہوئے چہرے پر کچھ نرمی آئی۔

”جی وہ تو شام کو چھ بجے ہی چلی گئی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ آٹھ بجے صنوبی بی بی کو چھوڑ جائیں گی پھر تو آپ کو پتا ہے کہ ہنگامہ ہی ہو گیا۔“ شموں جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھی اور میری رہی سہی جان بھی نکلتی جا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ وجیہ نے سپاٹ سا جواب دیا اور گاڑی کا رخ ڈینیس کی طرف موڑ دیا جہاں ماریہ جی تھی۔ وجیہ بہت تیز گاڑی چلا رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا موڑ اچھا نہیں ہے۔  
 ”شوں!“ میرے کانچنے لہوں سے دھیمی سی آواز نکلی۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا اور میرے کانچنے ہوئے ٹنڈے ہاتھوں کا اپنے ہاتھوں میں لے کر بے حد دھیمی آواز میں بولی۔

”آپ فکر نہ کرو۔ صنوبی بی بی ماریہ کے پاس ہی ہوگی۔“ اسے یہ یقین اس لیے بھی تھا کہ صنوبی نے رات مجھے یہی کہا تھا کہ وہ ماریہ کے گھر جا رہی ہے میں فکر نہ کروں۔ مجھے بھی کچھ حوصلہ ہو گیا۔ اور میں اللہ کو یاد کر کے قرآن کی وہ ساری سورتیں اور دعائیں پڑھنے لگی جو مجھے حفظ تھیں۔ وجیہ ہانٹیں کن کن راستوں سے چلا رہا تھا۔ اکثر سڑکوں پر ڈرم کھڑے کر کے راستہ بند کیا گیا تھا اور کئی جگہ ٹاور وغیرہ جل رہے تھے۔ پولیس اور ریجنل کی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔

”یار ملک! اب تم اپنی ڈیوٹی کرو۔ ہم چلے جائیں گے۔“ ڈینیس میں داخل ہونے سے قبل وجیہ نے اپنے ایس بی دوست سے کہا۔

”میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ پھر میں اپنی موبائل کو کال کر لوں گا اور تم لوگوں کو شہر سے باہر بھگالت چھوڑ دیں گے۔“

وہ ایس بی پھر بھی نہ مانا۔ وہ وجیہ کا کوئی بے حد قریبی اور گہرا دوست تھا اسی لیے اسے وجیہ کی انی فکر تھی۔

وجیہ نے زیادہ بحث نہ کی اور ڈینیس میں ماریہ کے گھر کی طرف گاڑی موڑ لی۔ میں چونکہ صنوبی کو ایک بار وجیہ کے ساتھ ماریہ کے گھر سے پک کرنے آ چکی تھی اس لیے مجھے اس کا گھر معلوم تھا۔

ماریہ کے گیٹ پر رک کر وجیہ نے کہا۔

”صنوبی کو فون کرو اور کہو کہ فوراً گیٹ پر آجائے۔“

میں نے صنوبی کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر اس نے بات کی۔

”بھرجائی! کدھر ہوا آپ؟ میں آپ کو کب سے فون کر رہی ہوں۔“ وہ بھی پریشان تھی۔

”ہم لوگ ماریہ کے گیٹ پر ہیں جلدی باہر آؤ۔“ میں نے اسے جلدی سے کہا۔

”مم۔ مم۔ ماریہ کے گیٹ پر۔ اس وقت۔ کس کے ساتھ ہیں آپ؟“ اس پر گھبراہٹ

طاری ہو گئی تھی۔

”وجیہ کے ساتھ۔ بس تم جلدی باہر آؤ۔“ میں نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا اور اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ فوراً ہی میرے موبائل پر اس کا فون دوبارہ آ گیا۔

”کیا بات ہے صنوبی؟ باہر آؤ جلدی کرو۔“ میں نے ذرا سختی سے کہا۔

”بھرجائی! میں ماریہ کے گھر نہیں ہوں۔“ اس نے تو گویا میرے قدموں تلے سے زمین اور سر سے آسمان کھینچ لیا۔

”کک۔ کہاں ہو تم؟“ میں نے اپنے موبائل پر ہاتھ سے اوٹ کر کے بڑی رازداری سے پوچھا۔

”بھرجائی! میں۔ میں تو اس وقت ایک ہوٹل میں ہوں۔ میں کیا کرتی ماریہ تو اسلام آباد گئی ہوئی ہے میں کہاں جاتی۔ اس لیے میں اور مراد۔“

”کیا کہا تم مراد کے ساتھ ہو؟“ میرے منہ سے بے ساختہ ہی نکل گیا جسے آواز آہستہ ہونے کے باوجود وجیہ نے سن لیا۔

تب وجیہ نے موبائل میرے ہاتھ سے لے لیا اور مجھے خوشخوار آنکھوں سے دیکھتا ہوا گاڑی سے باہر چلا گیا اس طرح اچانک ہی پھوٹن بدل جانے کی وجہ سے میرا بلڈ پریشر بھی شوٹ کر گیا اور میں باوجود کوشش کے خود کو سنبھال نہ سکی۔ اگلے چند منٹوں میں مجھے صرف اتنا یاد رہا کہ وجیہ نے اگلے ہی چوک پر اپنے دوست کو ڈراپ کر دیا۔ اور وہ گاڑی کو آندھی طوفان کی طرح اڑاتا ہوا کسی طرف جارہا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر بار بار یہی ایک جملہ تھا۔

”شوٹ کر دوں گا میں دونوں کو۔ شوٹ کر دوں گا۔“

❖ ❖ ❖

مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنا سر بے حد بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں شدید درد تھا اور میرے حلق میں کانٹے چھ رہے تھے۔

”پانی۔“ مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی۔

”جی بی بی۔“ شموں نے منرل واٹر کی بوتل کھول کر میرے لیوں سے لگا دی۔

چند گھنٹ پانی پیا تو مجھے کچھ مزید بہتر لگا۔ تب مجھے یاد آیا کہ ابھی جب میں بے ہوش ہوئی تو کیا ہوا تھا۔ ہم لوگ اب بھی گاڑی میں تھے۔ اور گاڑی اسی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ مگر اب ہم لوگ شہرے جا رہے گاؤں کے راستے پر تھے۔ میرے ایک طرف شموں اور دوسری جانب صنوبی بھی دونوں کے چہرے پیلے زرد تھے۔ اتنے زیادہ کہ مانو بدن میں لہو کا اک قطرہ بھی نہ ہو وجیہ نے میرے ہاتھ سے جب موبائل لیا تو میری صنوبی سے بات ہو رہی تھی۔ یقیناً صنوبی نے ہی بتایا ہوگا کہ وہ کہاں ہے اور وجیہ نے وہاں سے صنوبی کو لیا ہوگا۔

”لیکن مراد کہاں ہے؟“ میرے دماغ میں کرنٹ دوڑا۔

”میں شوٹ کر دوں گا دونوں کو۔“ میرے کانوں میں وجیہ کا خونخوار لہجہ گونجا اور میرا دل

انجانے خوف سے لرز گیا۔

”تو وجیہ نے مراد کو؟“

”نہیں نہیں۔ اللہ نہ کرے۔“ میں نے اپنے ذہن میں آنے والی اس بری بات کو جھٹکا۔

اور اللہ سے دعائیں مانگنے لگی۔

گاڑی کے بریک لگے اور وجیہ کا جھٹا ہوا لہجہ ہم تینوں کو مضجور کر گیا۔

”چلو اترو دیجئے۔“ یہ مختصر اور سادہ سا جملہ اس وقت زہر میں بجھا ہوا تیر تھا۔ ہم تینوں

جلدی سے گاڑی سے اتریں۔

”دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔ کرتا ہوں میں تمہارے ٹکڑے آکر۔“ اس وقت ایک

بھرا ہوا شیر دکھائی دے رہا تھا جس کی آنکھوں سے موت چنگاریوں کی طرح سے چھوٹ رہی ہو۔

✱ ✱ ✱

”بھائی! تم نے اسے زندہ گھر واپس لا کر اچھا نہیں کیا۔ وہیں پر ڈھیر کر کے آتے

اسے۔ میں ہوتا تو اس گند کو لا کر اپنے ساتھ نہ لے آتا۔“ اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بج رہے

تھے اور ہم تینوں ان سب گھر والوں کے بیچ میں گھری بیٹھی تھیں۔ کبھی کوئی اٹھ کر ہم پر غراتا اور کبھی

کوئی شموں کو تو بھرے گھر کے سامنے فخر النساء نے چوٹی کھینچ کھینچ کے مارا تھا۔ اور زویا نے جب یہ

بات سنی تو سب سے پہلے شموں پر ہی جھپٹی تھی اور اسے گالیاں دیتی ہوئی کون اور لالتوں سے مارنے

لگی تھی۔

”حرام خور! تو نے کیوں نہیں بتایا کہ یہ ذلالت کرنے جا رہی ہے۔ ہم اسی وقت پکڑتے اسے موقع پر۔“

وہ صوبی کی طرف نفرت سے دیکھتی ہوئی چلائی تھی۔

”یہ کیسے بتاتی۔ یہ تو ہے ہی ذات کی کمی۔ مگر یہ۔ یہ تو دیکھو کہ اپنے کیسے ذلیل نکلے ہیں۔ مگر کی دلالی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی تم کو۔“

”فخر النساء نے سید حامیری ذات پر حملہ کیا۔

”کون اپنا۔ خبردار! اگر کسی نے اسے اپنا کہا۔ دشمن ہے یہ ہماری۔“ تیمور نے ساری دید

محاذ اتار تے ہوئے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”تھی یہ بھابی کی کچھ لگتی۔ مگر اب۔ اب نہیں ہے۔ اب تو اس نے ثابت کر دیا کہ بے حیائی اور بے غیرتی اس کی رگوں میں دوڑتی ہے۔ جیسے عشق باز یوں سے خود نے شادی کی ویسے ہی کر تو اسے بھی سکھا دیئے۔“ وہ کھلم کھلا بکواس کر رہا تھا۔ اور میں دیکھ رہی تھی کہ وجہ اس وقت بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

”بھر جانی کا کوئی تصور نہیں۔“ صوبی نے ہمت کر کے کہا۔

”بھونکتی ہے کتے کی طرح۔“ تیمور نے پلٹ کر ایک زوردار چاناس کے گال پر رسید کیا اور وہ ایک طرف کولڑ کھڑا گئی۔

”صوبی!“ میں نے تڑپ کے اسے تھاما۔

”بھر جانی! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں کرتی ہوں ان سے بات۔“ تھپڑ کھا کر وہ ڈرنے کے بجائے اور بھی پراعتماد ہو گئی اور تیمور کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی۔

”ڈنٹشیں بھر جانی کو کچھ پتا نہیں تھا میں نے اس کے ساتھ بھی جھوٹ بولا تھا اور دھوکے سے راستے میں اتر گئی تھی۔“

”تیری یہ ہمت تو میرے سامنے زبان کھولے اور مجھے آنکھیں پھاڑ کے دیکھے۔“ تیمور نے پوری زندگی سے اس کے بال پکڑے اور انہیں اپنے ہاتھ کے گرد مروڑتا ہوا اس کی گردن کو کھچلی طرف کمر سے لگا دیا۔ مارے تکلیف کے صوبی کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں اور ان سے پانی بہنے لگا۔

”بتا کدھر بھگایا ہے تو نے اپنے یار کو۔ بتا۔“ وہ غلیظ زبان میں اس سے مراد کے بارے

میں پوچھ رہا تھا۔

”یا رنہیں ہے وہ میرا۔“ صنوبی نے پھر بھی اس سے ڈرے بغیر کہا۔

”اچھا یا رنہیں تو پھر کیا ہے تیرا؟“

”ہاں۔ بتا کیا ہے تیرا؟“

زویا ایک دم سے آگے بڑھی اور اس نے اس کا منہ نوچ ڈالا۔ میں نے مارے اذیت کے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

”شوہر ہے وہ میرا۔ شوہر۔ سن لیا تو نے۔“ صنوبی نے چیخ کر کہا۔

”شوہر۔“ اور سارے لوگوں کی طرح سے میرے منہ سے بھی نکلا۔

”ہاں وہ میرا شوہر ہے۔ نکاح کر چکے ہیں ہم دونوں۔ اب بگاڑو تم لوگ جو بگاڑ سکتے ہو میرا بھی اور اس کا بھی۔“

وہ نرم دناؤ کی لڑکی ان درندوں کے سامنے چٹان بنی کھڑی تھی۔ اور پورے اعتماد سے انہیں جواب دے رہی تھی۔

تیور کے ہاتھ کی گرفت چند لمحوں کے لیے اس پر نرم پڑی تو وہ چپتے کی طرح سے اس کے چنگل سے نکلی اور اس سے پہلے کوئی اور اسے پکڑنا وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی جسے اس نے فوراً ہی لاک بھی کر لیا تھا۔

”زندہ نہیں رہے گی یہ۔“ تیور پھر جلی بلی کی طرح سے کمرے میں چکر لگانے لگا۔

”بھانجی!“ وہ دوسرے چکر کے بعد ہی وجیہ کے پاس آکھڑا ہوا۔

”یہ آپ کیا سر جھکائے بیٹھے ہو۔ بات کیوں نہیں کرتے ہو کوئی غیرت مندوں والا ثبوت دو۔“ وہ وجیہ پر طنز کرنے لگا۔

”یہ کہاں کا غیرت مند ہے۔ غیرت مند ہوتا تو سب سے پہلے اپنی اس لاڈلی کو گولی مارتا جو ہمارے منہ پر کالک مل کے آئی بیٹھی ہے۔“ فخر النساء بیگم نے بھی اسے طعنے دینے شروع کر دیے۔

”بس کرو اماں۔“ وہ غصے سے بولا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے بھی اسی انداز

میں کہا۔

”تم جاؤ یہاں سے۔“ میں تو جیسے پہلے ہی یہ فقرہ سننے کو دعائیں مانگ رہی تھی اُٹھی اور پھر بغیر مزے دیکھے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ جاتے جاتے بھی جو جملہ میرے کانوں میں



پچھلے ہوئے سپسے کی طرح پڑا افتادہ تھا۔

”بھاتی! آپ اپنی بیوی کے حسن کے غلام ہو کر بے غیرت ہو گئے ہوں گے پر میں نہیں۔ لاشیں تو اب اس حویلی کے محن سے دوہی اٹھیں گی۔ ایک صنوبی اور ایک دلنشین کی۔“

”م۔ میری۔“ میرا ریشہ ریشہ کانپ گیا۔

”ہاں ہاں اب تو یہی ہوگا۔ اگر صنوبی زعمہ رہی تو میں زہر گھالوں گی۔“ یہ زدیا کی ضد بھری آواز تھی۔ اس کے بعد کس نے کیا کہا میں کچھ نہیں سن سکی میرے اندر تو موت کا خوف اپنی پوری دہشت کے ساتھ اتر چکا تھا اور مجھے ابھی سے اپنی سانسیں سینے میں کھپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”کیا واقعی میری موت کا وقت آ گیا ہے۔“

”کیا میری قسمت میں قتل ہونا لکھا جا چکا ہے۔“

اور کیا وجیہ میری جان لے لے گا۔ یا مجھے مرتا دیکھ سکے گا۔“

میکوے اندراک کشمکش جاری ہو گئی۔ مجھے اپنی خواب گاہ اپنی قبر لگنے لگی۔

✱ ✱ ✱

میں پورے دو روز سے اپنے کمرے میں قید تھی۔ وجیہ کی کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے مجھے فون تو کیا کرنا بلکہ اپنا وہ نمبر بھی بند کر دیا تھا جو خالص میرے لیے تھا۔ شموں کا بھی کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں جب اپنے کمرے میں دوڑ کے آئی تھی تو وہ وہیں ایک کونے میں پڑی سک رہی تھی۔

”اور صنوبی؟“ میرے دل پر ایک کاری ضرب لگی۔

”اللہ جانے اس بے چاری کے ساتھ کیا ہوتی ہوگی۔“ میرے کمرے میں دن بھر میں دوبار اللہ وسائی آتی تھی اور کھانے کی ٹرے رکھ جاتی تھی۔ جو جوں کی توں پڑی رہتی تھی۔ میں تو اپنی محبت کا غم اور موت کا خوف کھانے بیٹھی تھی اور کیا کھاتی۔

اس وقت بھی اللہ وسائی کھانے کی ٹرے رکھنے آئی تھی جب میں نے اس سے پوچھ ہی

لیا۔

”وجیہ کہاں سے اللہ وسائی؟!“ تب اس نے مجھے چند لمحے تو عجیب سی نظروں سے

دیکھا پھر میرے پاس بیٹھ گئی۔

”چھوٹی بی بی! لاڈی سائیں بڑے پریشان ہیں سارا سارا دن پیتے رہتے ہیں۔ کھانا بھی نہیں کھاتے۔ ڈیرے پر پڑے ہیں، کھو بتا رہا تھا۔“ اس نے اپنے شوہر کا نام لے کر مجھے دجیہ کے بارے میں بتایا جسے سن کر میرا دل اور بھی پریشان ہو گیا۔

”میں کیا کروں، کیسے اس سے بات کروں۔ اسے دیکھوں؟“ مجھے اس وقت دجیہ کی فکر پڑ گئی۔ اس نے تو شراب پیٹی بہت کم کر دی تھی اور مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی اسے چھوڑ دے گا۔ اور اب اللہ وسائی بتا رہی تھی کہ وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔

”بی بی جی! سائیں پر سارے گھر والوں کا بڑا پریش ہے۔ وہ کیا کریں؟“ اللہ وسائی نے بڑی رازداری سے کہا۔

”کس بات کا پریش؟“ میری سائیں پھر رکنے لگیں۔

”اس بات کا کہ وہ صنوبی بی بی کو گولی مار دیں اور..... اور..... وہ بات ادھوری چھوڑ کر مجھے ترس کھانے والی لگا ہوں سے دیکھنے لگی اور وہ اس کی ٹھنڈی برف نظریں میری نس نس میں جم گئیں۔

”اچھا بی بی! اللہ کا واسطہ کسی سے کہنا مت ورنہ چھوٹا سائیں تو میری پوٹیاں کتوں کو ڈال دے گا۔ آپ نہیں جانتیں یہاں پر ہم جیسے کمیوں کی قبر بننے دیر نہیں لگتی۔ کہیں میرا انجام بھی شموں.....“

”شموں! کیا ہوا شموں کو؟“ میرا دل کھینچ کر حلق میں آ گیا۔

”چھوٹے سائیں نے اسے کچے کوٹھے میں ڈال دیا ہے۔ کھال کھینچ دی بے چاری کی شانے مار مار کے۔“

وہ سرگوشی کے انداز میں مجھے بتا رہی تھی وہ بھی ادھر ادھر دیکھ کے۔

”کچا کوٹھا؟“ میرے لب کپکپائے۔ مجھے ایک بار۔ شموں نے ہی بتایا تھا کہ یہاں

حویلی کے اندر کچھ کچے کوٹھے بھی ہیں۔ تب میں نے بڑی حیرانی سے اس سے پوچھا تھا کہ۔

”شموں! یہ کچے کوٹھے کیا ہیں۔ کیا ان کی دیواریں مٹی کی ہیں؟“ میں مذاق کے موڈ

میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں بی بی صاحب! یہ کچی دیواروں والے کوٹھے دراصل انسانی قبریں ہیں جو زمین کے

نیچے نہیں زمین کے اوپر بنائی گئی ہیں۔ ان قبروں میں مردے نہیں بلکہ زندہ انسان ڈالے جاتے ہیں جو تڑپ تڑپ کے خود مردہ ہو کر مٹی ہو جاتے ہیں۔“ اس نے مجھے اتنی سنجیدگی سے بتایا تھا کہ ایک لمحے کو مجھے جبر جبری سی آگئی تھی یہ سن کر مگر پھر میں نے ہنس کر اس کے سر پر چھت لگا کر کہا تھا۔

”چل چھوڑ تو کون سا اس کچے کوٹھے میں جانے والی ہے۔“

”اس کوٹھے کا دروازہ جانے کب اور کس پر کھل جائے، کیا خبر؟“ وہ تب بھی گم سم ہی تھی۔

”اور بی بی! میں نے تو کئی بار پسند دیکھا ہے کہ میں کچے کوٹھے میں پڑی رو رہی ہوں۔“ وہ اتنی سنجیدگی سے بولی تھی اس وقت اس کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ رہا تھا جیسے اس کے اندر اس کے خواب کی تعبیر اتر چکی ہو۔

”کیوں..... کیوں تم کون سا اتنا سنگین جرم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟“ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔

”ڈنٹیس بی بی! یہاں کوئی مرضی سے کب جرم کرتا ہے، اس کے نصیب ہوتے ہیں جو اسے مجرم بنا دیتے ہیں، کبھی تو کوئی بھول چوک بھی کر لیتا ہے، مگر کبھی تو کوئی بے خطا ہی مارا جاتا ہے۔“ وہ اس روز بے حد غم زدہ دکھائی دے رہی تھی اور ایسی باتیں کر رہی تھی، ورنہ تو وہ ہر وقت مسکراتی اور چھیڑ چھاڑی کرتی رہتی تھی۔

”اچھا تو تیرا کیا ارادہ ہے؟ کون سی خطا کرنے والی ہے تو۔“ اس روز میں اسے چھیڑتی جا رہی تھی۔

”محبت ہی میری خطا ہے، اور یہاں محبت اگر عورت کر لے تو سب ناقابل معافی جرم ہے۔“ وہ دور خلاؤں میں کچھ دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”اچھا تو، تو کس سے محبت کرتی ہے۔“ میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دی تھیں۔

”میں فرش ہو کے عرش سے محبت کر بیٹھی ہوں، میں تو ضرور ہی اک روز غنی جاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں چمک جب بڑی مانتھی۔

”کیوں کیا تم تیرے محبت کرتی ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔

”کیا وہ محبت کے قابل ہے؟“ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

”اچھا تو کیا تیری نظریں میرے وجہ پر ہیں؟“ میں نے ایسے ہی مذاق میں پوچھ لیا

تھا۔

”اگر میں کہوں ہاں تو؟“ وہ میرے سامنے مسکراتی ہوئی آن کھڑی ہوئی، اس کی

آنکھوں کے ستارے پھر سے جگمگانے لگے تھے، میں شپٹا گئی۔

”چل بکواس نہ کر..... اور جا کر چائے بنا لا۔“ میں نے جان بوجھ کر بات بدل دی

تھی۔

”ڈنٹیشن بائی! ڈرنکیس کیا؟“ وہ پھر بھی میرے مقابل ہی تھی۔

”نہیں مجھے تمہاری محبت سے کوئی ڈرنکیس، بلکہ مجھے اپنی محبت پر بھروسہ ہے۔“ میں نے

دوبارہ سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

”ہاں..... آپ کو یہ مان بھی تو ہے کہ سائیں آپ کو چاہتے ہیں، جبکہ میں تو؟“ اب

اس نے مجھ سے نظریں چرائی تھیں۔

”تم تو کیا ہاں شموں! تم تو کیا بتاؤ نا؟“ میں نے اسے کندھوں سے تھام کے اپنے

سامنے کر لیا تھا۔

”میں تو ایک باندی ہوں..... باندیاں تو دھوبی گھاٹ کے اس پتھر کی مانند ہوتی ہیں،

جہاں مالکوں کے میل کے اس پتھر کی مانند ہوتی ہیں، جہاں مالکوں کے میل دھلتے ہیں۔“ اس نے

بے حد گہری بات کی۔ مجھے اس سے اس لمحے بہت ہی خوف آیا اور حسد بھی محسوس ہو گیا، کیونکہ اس

روز اس نے اپنے منہ سے بتا دیا تھا کہ وجہ کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے، جو میں تو کیا کوئی بھی بیوی

سن کر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”اچھا شموں! اب تو جا اور سن خود کو زیادہ اونچا مت اڑانا کہ کسی روز سچ بچ کچے کوٹھے

میں جا پڑے۔“ میں تو اسے حسیہ کر رہی تھی۔ مگر وہ اعتماد سے مسکرا رہی تھی۔

”شموں کسی لالچ یا بے وقوفی کی سزا میں کچے کوٹھے نہیں جائے گی..... جب گئی جان

ٹاری میں جائے گی۔“

”وجہ پر جان ٹار کرنے کا ارادہ ہے تو پلیز آج ہی کر دو، کم از کم میں تو آگ کے اس

دریا سے نکلوں جو تمہاری وجہ سے مجھے جلاتا رہتا ہے۔“ میں نے اسے خاصے سپاٹ انداز میں کہہ دیا

تھا۔

”ڈنٹیش بی بی! جان تو میں آپ پر بھی غار کر سکتی ہوں، کبھی آزمائش کا وقت آیا تو دیکھ

لینا۔“

”مجھ پر کیوں..... اللہ نہ کرے مجھے تمہاری جان کی ضرورت پیش آئے۔“ میں نے برا

مناتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے آپ سے بھی تو محبت ہے۔“ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر شرارت سے بولی۔

”محبت کی محبت سے محبت کا مطلب اور اس کا لطف آپ کیا جانو۔ سچ بندہ دیوانہ ہو جاتا

ہے اور دیوانے کو اپنی موت سے ڈر نہیں لگتا۔“ وہ بولتی ہوئی چائے بنانے چلی گئی اور میں کتنی ہی دیر اس کی باتوں میں الجھی رہی تھی اس روز مجھے شموں ذرا اچھی نہ لگی تھی بلکہ مجھے وہ ایک چالاک اور مکار لڑکی لگنے لگی تھی جس سے مجھے کئی روز تک سخت حسد محسوس ہوتا رہا اور خطرہ بھی محسوس ہوتا رہا تھا

❖ ❖ ❖

اللہ وسائی کب کی کھانے کی ٹرے واپس لے کر جا چکی تھی مگر میں شموں کی باتوں کے اس روز کے الجھے ہوئے سرے آج ڈھونڈ پائی تھی۔ بلکہ آج تو میرے دل و دماغ میں شموں کی بابت لگی ہوئی ساری گریں خود بخود کھلتی جا رہی تھیں محبت کی محبت سے محبت کا مطلب مجھے سمجھ آ گیا تھا۔

اس نے آج اپنی جان غاری ثابت کر دی تھی۔ مجھ پر ذرا سا کڑا وقت آنے لگا تو اس

نے کیسے جھٹ سے اپنا آنچل مجھ پر کر دیا تھا۔

اس نے کتنی جرأت سے تیمور کے سامنے ہار ہار کہا تھا۔

”ڈنٹیش بی بی کو کچھ خبر نہ تھی صنوبی بی بی کے پلان کی؟“

”تو کیا تجھے پتا تھا، ہتا حرام زادی، کیسی؟“ اس غالم نے کیسی درندگی سے اس معصوم پر

لاٹوں سے حملہ کر دیا تھا۔

”ہاں مجھے پتا تھا کہ صنوبی بی بی مراد سے نکاح کرنے جا رہی ہے بلکہ میں نے ہی صنوبی

سے کہا تھا کہ وہ ڈنٹیش بی بی سے جھوٹ کہہ کر لفٹ لے اور میں نے ہی اسے راستے میں اتارنے میں

مدد کی تھی۔ اور بی بی کو اپنی جھوٹ باتوں میں الجھا کر لاڈی سائیں کوفون کرنے سے باز رکھا، ورنہ یہ توفون کر کے بتا رہی تھیں۔ ”وہ بڑی دیدہ دلیری سے تیمور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بول رہی تھی جو تو نے صنوبی کو بھڑکا کے اور اسے بہکا کر ہم سے بدلہ لیا۔“ فخر النساء بیگم نے اس کی گردن اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں لے کر پوچھا تھا۔

”کیوں تجھے کیا آگ تھی جو تو نے صنوبی کو بھڑکا کے اور اسے بہکا کر ہم سے بدلہ کیا۔“ فخر النساء بیگم نے اس کی گردن اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں لے کر پوچھا تھا۔  
”وہ میں نہیں بتا سکتی۔“

اس نے بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس بے چاری کو کتنی ہی غلیظ گالیوں، لاتوں اور گھونسوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”شموں!“ میرے لیوں سے ایک ساتھ کئی سسکیاں نکلیں، مجھے شموں کی بے تحاشا یاد آ رہی تھی، اور میں اس منحوس گھڑی کو رو رہی تھی جب میں نے ماما سے ملنے کی اجازت لی تھی، کاش میں تنہا نہ جاتی وجیہ کے ساتھ ہی جاتی۔

”ماما!“ مجھے اپنی ماما کی یاد بھی آگئی جنہیں میں بیمار چھوڑ آئی تھی، میں نے ان کی خبر بھی نہ لی تھی، نہ ہی ان کا فون آیا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا دوسرا موبائل سیٹ اٹھایا اور چاہا کہ ماما کوفون کروں، میرا فون آف تھا۔

”اودہ میرے اللہ یہ تو چارج ہی نہ تھا، یھینا ماما نے مجھے فون کیا ہوگا اور میرا فون آف پا کر وہ کس قدر پریشان ہوئی ہوں گی۔“ میں نے فون چار جنگ پر لگایا، وہ آن ہوا تو میں یہ دیکھ کر حیران ہی رہ گئی کہ میرے اس سیٹ میں تو سم ہی نہ تھی۔

”یہ کس نے کیا، اور کب؟“ میں بے حد گھبرا گئی، جلدی جلدی اس موبائل کو اٹھایا جس میں وجیہ سے بات کرنے کے لیے مخصوص پیسج والی سم تھی۔

”یا اللہ خیر! اس میں بھی سم نہ تھی۔“ اب تو میں چکرا کر ہی رہ گئی۔

”یہ کس نے کیا ہوگا؟“ میرے کمرے میں تو سوائے اللہ وسائی کے اور کوئی نہ آ رہا تھا اور ابھی رات کو تو میں وجیہ کوفون کرتی رہی تھی، یعنی یہ جو کوئی بھی ہوا تھا وہ اسی صبح اور دوپہر کے درمیان ہوا تھا۔ میں سوچنے لگی، اللہ وسائی نے ہی یہ کیا ہوگا اور یہ سب تیمور نے ہی کر لیا ہوگا۔ مجھے یاد آیا کہ صبح جب اللہ وسائی ناشتے کی چائے لے کر آئی تھی تو میں ہاتھ روم میں تھی اس نے یہ کام اسی وقت کیا

ہوگا میں بے بس ہو کر رہ گئی، مجھے سمجھ آرہی تھی کہ اب میرے پر کاٹے جا رہے ہیں۔  
 ”تو کیا میری یہ خواب گاہ ہی میرے لیے کچا کوٹھا بن جائے گی؟“ میں اپنے خوفناک  
 انجام کے بارے میں سوچنے لگی، مجھے موت کے بھاری قدموں کی چاپ اب اپنے ارد گرد ہی سنائی  
 دے رہی تھی۔

”یا الہی! میری توبہ..... مجھ پر رحم کر خدا یا۔“ مجھ مطلبی اور خود غرض کو پھر اللہ یاد آ گیا، اور  
 میں وضو کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

”کیسی کم ذات تھی میں..... اپنے سب سے عظیم مددگار کو بار بار بھول جاتی تھی! احسان  
 فراموشی جانے کیوں میرے لہو میں سرایت کر گئی تھی۔ جب پریشان ہوتی تو سجدوں میں گر جاتی تھی،  
 ورنہ خوشی کے دنوں میں اتنی بے فکر رہتی تھی کہ فرض نمازوں کے قضا ہونے کا بھی حساب نہ رہتا تھا،  
 کتنی بار میں نے اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ میں اب کبھی نماز قضا نہیں کروں گی۔ اب کبھی اس کو  
 نہیں بھلاؤں گی اور پھر میں یہی بات بھول جایا کرتی تھی۔ کتنی بری تھی میں کیسی وعدہ خلاف اور  
 اس قدر نافرمان۔“

میں وضو کر رہی تھی تو اپنے محبوب رب کے حضور جانے سے قہر قہر کانپ رہی تھی کہ میں  
 نے اسے کتنا ناراض کر دیا تھا۔ ورنہ تو وہ مجھ پر بڑا مہربان بے شک وہ مہربان اور رحیم ہی ہے بس  
 اس کا بندہ ہی ناشکر اور ناقدر ہے۔ میرے دل کے اندر سے آواز آئی، میں نے اپنے دل کی آواز پر  
 غور کیا تو مجھے اس لمحے اپنے دل کے صحن میں لکڑی کی اس مسجد کا وہ فرش آج بھی ویسا ہی نم اور خوشبو  
 دار لگا جیسے کہ اس رات میرے اٹکوں سے ہو گیا تھا۔ مجھے گیلی لکڑی کی وہ مسند لیں مہک اپنی جانب  
 بائیں پھیلا کر لپکتی دکھائی دی۔

”میرا رب بڑا عظیم ہے۔ وہ بے شک درگزر کرنے والا ہے۔ اسے اپنے بندے کی توبہ  
 بہت پسند ہے۔ لیک اور اک سجدہ توبہ پر وہ معاف کرنے کو بے تاب رہتا ہے تو بھی بے تابی سے  
 اٹھ اور اس کے سامنے سر جھکا دے۔“

”دل سے اسے یاد کر اور معافی مانگ لے اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی۔“ وہ مسجد  
 میرے دل سے نکل کر میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ مجھے کھینچ رہی تھی یہاں  
 تک کہ میں سجدے میں گر گئی۔

ابھی میں نے اپنی آنکھوں میں جمع سارے اشک بھی نہ بہائے تھے، ابھی میرے احساسات پر طاری ندامت کا بوجھ آدھا بھی نہ ہوا تھا اور ابھی میری پیشانی کو جائے نماز کو چھوئے کوئی زیادہ دیر بھی نہ ہوئی تھی، نہ ہی میرے لیوں نے جی بھر کے اقرار گناہ ہی کیا تھا کہ اس کی رحمت مجھ پر سایہ ہوگئی۔

بجٹاں (شموں کی بہن) نے ایک دم سے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔

”بی بی ابی بی! اٹھو..... جلدی کرو۔“ اس نے مجھے زبردستی سجدے سے کھینچ لیا۔ اس سے قبل کہ میں اس کے ساتھ کوئی سوال جواب کرتی اس نے ایک بڑی سی چادر مجھ پر ڈالی اور میرا ہاتھ کھینچتے ہوئی مجھے اوپر میسرں پر لے گئی۔ جو میرے کمرے کے پچھلے دروازے کے سامنے تھا۔

”بی بی جلدی کرو یہاں سے نیچے اتر دو۔“ اس نے مجھے میسرں کی چھوٹی سی دیوار سے نیچے اترنے کو کہا۔ میرے کمرے کا یہ پچھلا میسرں بہت بلند نہ تھا، لنگ کر اس پر سے چھلانگ لگائی جاسکتی تھی۔ میں تو تھکراکت کھڑی تھی، میرے حواس اس وقت میرا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ پتا نہیں میں نے اس دس فٹ کی بلندی سے خود چھلانگ لگائی یا بجٹاں نے مجھے نیچے لٹکایا۔ پر میں نیچے اتر چکی تھی، جہاں کسی نقاب پوش نے مجھے تھمٹ کر قریب کھڑی جیپ میں ڈالا اور جب تک میرے حواس بحال اور آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں، وہ جیپ فرانے بھرتی جا رہی تھی۔

کہاں؟ اس جیپ کو کون چلا رہا تھا اور کیوں؟ اور کون مجھے وہاں سے نکال کر لے جا رہا تھا اور کیوں؟ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ میں تو دم بہ خود تھی۔ میری آنکھوں سے اب بھی اشک جاری تھے اور میرے لیوں پر وہی دعا جم چکی تھی جو میں سجدے میں گر کے مانگ رہی تھی۔

”میرے اللہ! مجھے اس عذاب ناک قید سے رہائی دے، مجھے معاف کر دے، خدا یا! مجھ پر رحم فرما۔“ اب میں اس قید میں نہ تھی جس میں پچھلے چار روز سے پڑی بلکہ رہی تھی، لیکن اب میں کہاں جا رہی تھی، مجھے یہ خبر نہ تھی۔

”ہائے..... اف..... ف..... مر گئی۔“ میرے پہلو میں کسی وجود نے حرکت کی اور اس کے لیوں سے بے ساختہ کئی کراہیں نکل گئیں۔

”کک..... کون ہے؟“ میں ڈر کے کٹی۔

”ش..... شم..... وں۔“ اس وجود سے ایک سسکی بمثل لٹل اور اک لرزتا کا عطا بخ ہاتھ



میرے ہاتھ پر آن لگا۔

”شموں! تو.... تو زندہ ہے۔“ اس وقت میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس سے دوچار تھی، شموں کا ہاتھ میرے ہاتھ سے لڑھک چکا تھا، شاید وہ پھر سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ خدا جانے اس کی حالت کیسی تھی؟ جیپ کے اندر اور باہر گھپ اندھیرا تھا، مجھے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا، میں کسی مہربان کے ساتھ ہی تھی، اس بات کی تسلی البتہ مجھے تھی۔

”تم کون ہو؟“ کچھ لمحوں کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے جیپ چلانے والے سے

پوچھا۔

”جی میں فضل۔“ کسی نے بڑے احترام سے جواب دیا۔

”فضل کون؟“ میں یہ نام پہلی بار سن رہی تھی۔

”جی میں ڈیرے پر رہی ہوتا ہوں، لاڈی سائیں کا غلام ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف

کروایا، اس کا خود کو غلام کہنا مجھے اچھا نہ لگا تھا، مگر میں کچھ نہ بولی۔

”سائیں نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔“ وہ خود ہی بتانے

لگا۔

”وجیہ نے۔“ میرے لب میری دھڑکنوں کے ساتھ ہلے۔

”یعنی وجیہ کو مجھ سے واقعی محبت ہے۔“ میں خوش گماں ہو کر پھر سے خود پرناز کرنے لگی۔

”اور شموں کو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ شموں کے لیے بھی وجیہ نے

کہا ہوگا، مگر جب فضل نے بتایا کہ

”شموں کو میرا دل لایا ہے بی بی جی۔“ تو میرے دل کو جانے کیوں دکھ سا ہوا۔

فضل کو شموں سے محبت تھی۔ شموں کو وہ اس جہنم میں چھوڑ کے خود آجاتا یہ تو ممکن نہ تھا۔

اسی لیے وہ ہر خطرے سے ٹکرا کر شموں کو کچے کوٹھے سے بھی نکال لایا تھا۔ یقیناً بختاں نے یہ رسک

اپنی بہن کی خاطر لیا ہوگا۔ ایک طرف بختاں اور شموں تھیں، اک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں اور

اب ایک بہن نے دوسری بہن کی جان بچانے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی۔ دوسری طرف

زوہیا اور صنوبار یہ تھیں۔

صنوبار یہ نے اپنی بہن کے مگھتر سے شادی کر لی تھی اور زوہیا نے قسم کھائی تھی کہ اگر صنوبی

کو گولی نہ ماری گئی تو وہ زہر کھالے گی۔

یہ کیسے رٹتے تھے۔ کیسی محبتیں تھیں۔

میرا ذہن مختلف زاویوں پر الجھ رہا تھا۔

”فضل!“ مجھے صنوبی کا خیال آیا۔

”جی بی بی۔“ اس نے سوڈ بانہ انداز میں کہا۔

”صنوبی کدھر ہے؟“ جانے کیوں اس کا نام لیتے ہوئے میری دھڑکنیں سن ہو گئی تھیں۔

”جی..... جی وہ“ اس نے صرف اتنا ہی کہا آگے اس کے زبان لڑکھڑائی۔

”فضل کیا ہوا صنوبی کو؟“ مجھے جیسے میری چھٹی حس الارم دے رہی تھی۔

”اب تک تو اسے گولی مار دی گئی ہوگی۔“ فضل کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

”گگ.... گولی مار دی ہوگی، صنوبی مر گئی ہوگی، بلکہ صنوبی کا قتل کر دیا گیا ہوگا۔“

بے رحم بھائیوں کے ہاتھوں ایک معصوم بہن کا خون ہو گیا ہوگا۔

غیرت کے نام پر ایک اور سنگین اور گھناؤنا قتل۔ میری روح، میری ہڈیوں سے کھینچے لگی

اور مجھے لگا میری رگوں میں برف جمنے لگی ہو۔

”گگ.... کس نے صنوبی کو قتل کیا؟“ میرے غم سے جڑے لب بل ہی نہ رہے تھے

میں نے بڑی مشکل سے پوچھا۔

”لاڈی سائیں نے۔“ فضل کی آواز ایک تیز دھار بھالے کی طرح میرے سینے میں اتر

گئی۔

”و..... ج..... یہ..... وجیہ۔“ میری آنکھوں تلے گہرا اند میرا چھانے لگا اور میں اس

گہرے کنویں میں گرنا چلی گئی۔



”وجیہ نے صنوبی کو گولی مار دی..... اپنی اتنی پیاری بہن کو؟“ میرے لیے اس خبر پر یقین کر لینا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ میں نے ان بہن بھائیوں کی محبت دیکھی تھی وجیہ جب بھی کہیں باہر سے گھر آتا تھا تو سب سے پہلے صنوبی کو آوازیں دیتا تھا اسے دیکھتے ہی اپنی بانہیں پھیلا دیتا اور پھر اسے اپنے ساتھ لگا کر شفقت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا۔

وہ بھی چھوٹی سی بچی کی طرح لاڈ سے چل کر اس کے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلا دیتی تھی۔  
 ”بھاجی! میرا جیب خریج.....؟“ اور وہ مسکرا کر اس کے سر پر چپٹ لگاتا اور اپنا پرس نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

”کیا سارے لے لوں؟“ وہ پرس کو مٹھی میں دبا کر شرارت سے پوچھتی۔

”سارے لے لے۔“ وہ پورے دل سے کہتا۔

”اچھا بس بس..... زیادہ شاہ نہ بنو۔“ وہ بھائی کو غرے سے کہتی ہوئی اس کے پرس میں سے کبھی ایک ہزار اور کبھی پانچ سو کا نوٹ نکال لیتی۔

”اتنے سے پیسوں کا کیا کرو گی؟“ وہ حیرت سے پوچھتا۔

”چاکلیٹ کھاؤں گی..... چپس اور کوک پیوں گی۔“ وہ کندھے اچکا کر بچنے سے کہتی۔

”ان پیسوں سے منگواؤ گی؟ کیا گھر میں نہیں ہیں یہ چیزیں۔ اتنی ڈھیر ڈھیر تو آتی ہیں۔“ وجیہ کو کبھی کبھی برا لگتا وہ سمجھتا تھا کہ گھر میں شاید یہ چیزیں نہیں ہیں جبکہ وہ خود بے حساب لایا کرتا تھا یہ سب۔

”بھاجی! آپ کو کیا پتا ان پیسوں سے..... اپنے ہاتھ سے یہ چیزیں خرید کر کھاؤں تو کتنی اچھی لگتی ہیں۔ کتنا مزہ آتا ہے؟“ وہ پیسے لے کر بھاگ جاتی۔  
 ”جھلی ہے بالکل۔“ وجیہ ہنستا۔ میں پوچھتی۔

”وجیہ؟“ تمہیں صنوبی سے کتنی محبت ہے؟“ وہ ہنس کر کہتا۔

”کیا میں نہیں پوچھ سکتی؟“

”ہاں ہاں! تم اس کی بھر جانی ہو، جلس ہو جاؤ اور میری بہن کو نظر لگا دو گی۔“ وہ مجھے ستاتا۔

”نہیں میں نظر نہیں لگاؤں گی میں تو دعا دوں گی کہ تمہاری محبت صنوبی کے لیے اور بھی

بڑھتی جائے۔“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتی۔

”تو بس پھر دعا کیا کرو کہ رب میری بہن کو کبھی کوئی دکھ نہ دے۔“ دلتیں! اگر اس کی

آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں تو میرا دل اتنا بے چین ہو جاتا ہے کہ میں تمہیں کیا بتاؤں..... میرا دل

کرتا جس کی وجہ سے یہ روئی ہے میں اس کی جان ایک ہل ضائع کیے بغیر لے لوں۔“ وہ اپنی مشتیاں

شدت جذبات سے سمجھ کر کہتا۔

اور میں دل ہی دل میں ان دونوں کے لیے ڈیروں دعائیں کرتی۔ میرا کوئی بھائی نہ

تھا۔ اگر ہوتا تو کیا وہ بھی مجھ سے اتنی محبت کرتا؟ میں سوچتی اور میرا احساس محرومی بڑھنے لگتا۔

”مگر میرے پاس وجیہ ہے۔“ میرا دل یہ سوچ کر کھل اٹھتا۔

”جس قدر وہ صنوبی کو بہن کے مقام پر محبت کرتا ہے۔ اتنی مجھے بھی تو کرتا ہے بیوی اور

محبوبہ کے مقام پر۔“ مجھے خود پر فخر محسوس ہونے لگتا۔

”وجیہ.....“ میرا دل کٹ کے بوٹی بوٹی ہونے لگا صنوبی کے لبو میں ڈوبی

ترپتی..... بہن کی آنکھ میں ایک پانی کا قطرہ نہ برداشت کرنے والے نے۔

خود اپنے ہاتھوں سے اسے گولی مار دی۔ اس کی جان لے لی.....؟

کیسے..... کیوں.....؟ میری سوچ سمجھ مفلوج ہو گئی اور میرے لبوں سے صنوبی کی مظلومیت پر

سکیاں لکھنے لگیں صنوبی کی معصومیت اور اس کی بد بختی پر میرا دل توحہ کننا تھا۔

اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری آنکھوں میں گڑ گیا اور وجیہ۔ میرے لیے ایک ہولناک شکل

والا..... دجالی سوال بن گیا؟؟؟

اس کے آگے میرے دل و دماغ میں سوائے اک گہری اور اندھیری قبر کے کچھ نہ رہے

تھے۔

”بی بی صاحبہ!“ فضل کی ہلکی سی آواز اس سیاہ اندھیری قبر میں اک آتش کی طرح دہکی۔

”ہاں.... ہاں۔“ جان کنی کے عذاب سے دوچار میرے وجود نے اک جھر جھری لی۔

”آئیں اتریں۔ آپ کا گھر آگیا۔“ وہ گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

”تم..... میرا گھر۔“ میں نے اپنی بے نور آنکھیں ادھر ادھر گھمائیں۔ اسٹریٹ لائٹ

کی روشنی میں سر جھکائے فضل مجھے موت کے اس آخری پیامبر جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے ہاتھ میں میری روح کا آخری چیتھڑا تھا جو حقیقت کے نوکیلے کانٹوں سے الجھ کر دھجی دھجی ہوئے میرے وجود کا کوئی بچا ہوا ٹکڑا تھا اور میرا گھر..... کیا میں برزخ کی چوکت پر آن کھڑی تھی۔

میرے گھر کا گیٹ کھلا..... چوکیدار کی پریشان اور ہوشیار آواز آئی۔

”کون ہے..... کون ہے اس وقت؟“

”جی..... جی میں فضل ہوں۔ وجیہ صاحب کا ملازم.....“ دیشی بی بی کو لے کر آیا

ہوں۔“ فضل نے مؤدبانہ انداز میں بتایا۔

”صصصہ بی بی! اس وقت۔“ چوکیدار بابا فوراً باہر آگیا۔

”آئیں بی بی؟“ فضل نے پھر کہا اور میں اپنا لاشہ خود کھینچتی ہوئی باہر نکلنے لگی۔

”دل..... نشیں بی بی.....!“ شموں کی مری مری سی آواز آئی اور ساتھ ہی اس نے

میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کی۔

”شموں! شموں!“ میں نے پلٹ کر محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کا چہرہ اپنے

ہاتھوں میں لے کر پیار سے بولی۔

”شموں! تم بھی میرے گھر آ جاؤ۔“

”میں..... پھر آؤں گی۔“ وہ ہشکل سے بولی۔

”آ..... آ..... آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟“ اس کے پیلے زرد سوکھے لبوں پر اب بھی

مسکراہٹ تھی۔ اس کے زعدہ ہونے کی علامت۔

”تم سے ناراض؟ کس لیے؟“ میں نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”میں نے لاڈی سائیں کو.....؟“ اس کی نظریں جھک گئیں۔

”شموں تم نے نہیں..... لاڈی نے خود تمہیں..... اچھا! اچھا! چھوڑو وہ سب..... اب

بس تم اپنا خیال رکھنا۔“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”بی بی! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں.....؟“ وہ اپنی بے بسی پر بھی شرمندہ تھی۔  
 ”اور سنو!“ شموں! اگر میرے ساتھ تقدیر یہ کھیل نہ کھیلتی تو میں بھی تمہیں۔ خیر اللہ بہتر  
 کرے گا..... ان شاء اللہ تعالیٰ ہم لوگ جلد ہی اکٹھے ہوں گے وجہ تب مجھے لینے آئے گا تو میں  
 اسے کہہ دوں گی کہ تمہیں بھی بلوالے۔“ میں نے یوں کہہ دیا تھا کہ جیسے یہ کل دوبارہ ہو جائے گا اور  
 اس میں ذرا بھی مشکل نہ ہوگی۔

”بی بی سین! اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میرے چہرے کو  
 چھوا۔

”فضل! اسے فوراً کسی اسپتال لے جانا۔“ اس کی بند ہوتی آنکھوں اور پھٹکی پڑتی  
 مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ پھر سے بے ہوش ہو رہی ہے۔  
 ”جی بی بی جی..... ابھی بس ہسپتال ہی جاؤں گا۔“ اس کے انداز میں بے قراری اور  
 پریشانی عیاں تھی۔

”اللہ کے حوالے..... بی بی جی۔“ فضل نے میرے گاڑی سے اترنے کے بعد ایک  
 بیک اتار اور ہمارے چوکیدار کے حوالے کر دیا۔

”یہ..... یہ کیا ہے فضل؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”جی مالکوں کو پتا ہو گا کہ اس میں کیا ہے۔ یہ لاڈلی سائیں نے رکھوایا تھا آپ کے  
 لیے۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھے نہایت ادب سے کھڑا تھا۔

”اچھا فضل اللہ حافظ..... شموں کا خیال رکھنا اور جتنی جلدی ہو سکے اس کے ساتھ اپنا  
 گھر سالیانہ۔“ میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔  
 ”جی بی بی سین۔“ وہ ذرا سا شرمایا اور پھر تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک میں گیٹ سے  
 اندر نہ ہو گئی میں بھی گیٹ سے جہانک کر اس کے گاڑی موڑنے اور آگے بڑھالے جانے تک اسے  
 دیکھتی رہی۔



میری ماما میرے یوں گھر پلٹ آنے پر ٹھیک اتنی ہی پریشان اور غمزہ تھیں جتنی کہ کوئی  
 ماں اپنی شادی شدہ بیٹی کے یوں اچانک واپس گھر آ جانے پر ہو سکتی ہے..... تا صرف ماما

نوراں مامی کی حالت بھی ان سے کم نہ تھی۔

”ارے بیٹا! آخر ہوا کیا؟ کیوں داماد جی نے تمہیں یوں آدمی رات کو گھر سے نکال دیا۔“ وہ چائے بنا کر لائیں تو پھر شروع ہو گئیں۔

”مامی! انہوں نے مجھے گھر سے نکالا نہیں ہے۔“ مجھے ان کا یوں بار بار یہی لفظ کہنا اچھا نہ

لگ رہا تھا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو پر بیٹا! رات کے اند میرے میں بیٹیوں کا گھر سے جانا یا پھر گھر میں لوٹ آنا دونوں ہی قیامت کے مناظر میں ہے۔“ وہ اپنے کلبجے پر ہاتھ دھرے ہول کھائے جا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ مجھے اور ماما کو بھی ہولائے جا رہی تھیں۔

”مامی! منہ سے اچھے الفاظ نکالو۔ اللہ سے نیک شکون کی امید باندھو۔“ آخر ماما نے

انہیں کہہ ہی دیا۔

”اچھا اب تم آرام کرو صبح تک وجیہ بیٹے کا کوئی فون آ ہی جائے گا۔“ ماما نے میری

ڈھارس بندھانے کو کہا۔

”ماما! میں ادھر ہی آپ کے ساتھ سو جاؤں۔“ میں جو بچپن میں بھی کم ہی ان کے ساتھ

سوئی تھی آج ضد کر رہی تھی۔

”میرے ساتھ.....؟“ وہ لمحہ بھر کو جیسے کسی سوچ میں گئیں پھر ایک طرف کو ہوتے

ہوئے انہوں نے مجھے اپنے لحاف میں جگہ بنا دی ابا جان دوسرے کمرے میں سو رہے تھے انہیں

ابھی تک کچھ خبر نہ تھی کہ میں گھر آئی ہوں۔ ماما کی خراب طبیعت کے باعث اب ان کے کمرے میں

نوراں مامی سویا کرتی تھیں۔

”آ جاؤ..... یہاں آ جاؤ۔“ مجھے گم سم سا پا کر انہوں نے اپنے بستر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے کہا میں چپ چاپ سی جا کر انکے لحاف میں گھس گئی۔

”ارے تم تو بالکل برف ہو رہی ہو۔“ ماما نے میرے ٹھنڈے پنجیروں کو لحاف کے اندر

پھینٹے ہوئے کہا۔

”موزے تو پہن کر نکلتیں۔“ نوراں مامی فوراً بولیں۔

اب میں انہیں کیا بتاتی کہ جس طرح سے میں اپنے کمرے سے نکلی ہوں اس میں

موزے تو کہاں مجھے تو جوتے بھی نصیب نہ تھے..... میں تو زمین کو ننگے پاؤں چھوا تھا..... بچناں

نے قنات اپنے پاؤں سے سوٹی اتار کر میرے سامنے کر دی تھی۔  
 ”ماما!“ میں نے اپنے دل میں اٹھتے طوفانوں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے خود کو ماما کے سینے میں چھپا لیا۔

”میری بچی!“ ماما نے مجھے اپنے ساتھ سمجھ لیا۔  
 ”ماما! میرے لیے دعا کریں۔“ میں نے ان کے وجود کی نرمیوں میں اپنے زخمی وجود کو سموتے ہوئے کہا اور ان کے دل کی دھک دھک نے فوراً شہادت دی کہ ان کی ہر سانس میرے لیے دعا گوارہ تھی ہے۔

میں اپنی ماں کے سینے میں منہ چھپائے رات بھر روتی رہی۔ اور ان کی دھڑکنیں تمام رات مجھے تھکیاں دیتی رہیں۔



فجر کی پہلی اذان کے ساتھ ہی میں بستر سے نکل آئی۔ ماما تو پہلے سے ہی جائے نماز پر تھیں۔ انہیں تہجد پڑھنے کی عادت جوانی سے تھی۔

”نفیسہ! نفیسہ!“ ابا جان کی آواز سے پہلے ان کے گلا کھنکھارنے کی آواز آئی اور پھر وہ دروازے پر ہلکا سا ہاتھ مار کر اندر آ گئے۔ میں ہاتھ روم میں وضو کر رہی تھی۔ میرا سارا وجود ان کی آواز سننے کے ساتھ ہی پانی ہو گیا۔ چند روز پہلے جب میں ماں سے ملنے آئی تھی تب بھی وہ گھر پر موجود نہ تھے لیکن اب.... اب کیسے میں ان سے چھپ سکتی تھی اور کب تک چھپ سکتی تھی۔

”نفیسہ! تم اٹھ ہی ہوئی ہو۔ چلو اچھا ہے میں نے سوچا کہ دواؤں کے اثر سے کہیں تمہاری آنکھ نہ کھلی تو نماز قضا نہ ہو جائے۔“ وہ خود کلائی کر رہے تھے۔

”میں نماز پڑھ کر آتا ہوں پھر چائے پیتے ہیں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے اور میرے لیے اپنا لڑتا کاغذ وجود باہر لانا مشکل ہو گیا مگر کب تک وہاں کھڑی رہتی۔ گھسیٹ گھساٹ کر خود کو باہر لائی اور اللہ کے حضور سجدے میں جھکا دیا۔

آج پھر مجھے میرا اللہ شدت سے یاد آ رہا تھا۔ جیسے جیسے کم ظرفوں کو وقت پڑنے پر یاد آیا کرتا ہے سکھ کی گھڑیاں ہوں تو ہم جیسے ناشکرے غافل ہی رہتے ہیں اور جہاں ذرا کڑواقت آیا تو نمازوں کے علاوہ نوافل اور وظیفے بھی شروع ہو گئے..... آج میں پورے خضوع و خشوع کے ساتھ



اس وحدہ لاشریک کے دربار میں حاضر تھی.... جس کے ہاں پہلے محض اوپرے دل سے اٹھک بیٹھک کیا کرتی تھی۔ میں کیا میرا تو ریشہ ریشہ نس نس اور لہو کا قطرہ قطرہ اس کے حضور عاجزی سے جھکا ہوا تھا اس کا ثنا خواں تھا اس کے سامنے شرمندہ تھا۔

”میرے اللہ! میرے بنانے والے! ساری کائنات کے مالک! میں نہیں جانتی میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میرے ساتھ اچھا کرنا اے رحم کرنے والے! میری نالائقی۔ میری نافرمانیوں کو نہ دیکھنا، میرے معبود میرے دامن کو دیکھنا..... میرے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنا میری معمولی سے قوت برداشت پر کوئی آزمائش نہ رکھ دینا کہ میں اس قابل بھی کہاں جو کوئی امتحان دے سکوں۔

اے رحمن! اے غنودرگزر کرنے والے! مجھ پر رحم کر، میں نہیں جانتی اور ہرگز نہیں جان سکتی تو یہی جانتا ہے۔ بس میرے لیے اچھا کر دے جو تیری جانب سے خیر ہو۔  
مجھے، مجھے وجیہ.....“ میری ہچکیاں بندھ گئیں اور میری دعا ادھوری رہ گئی۔  
وجیہ کے آگے میرے ہونٹ جانے کیوں پتھر ہو گئے اور میں اپنے اللہ سے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میرے وجیہ کو مجھ سے جدا نہ کرنا۔

میں سجدے میں تھی اور میرے پورے وجود پر عرشہ طاری تھا..... اک پہاڑ تھا اور اس پہاڑ پر کھڑی وہ لکڑی کی مسجد میرے وجود کو چولوں پر آن لگی تھی۔ اس مسجد پر جمی برف کا قطرہ قطرہ پانی میرے بدن کی نالیوں سے ہوتا ہوا میری آنکھوں سے گر رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی، عجیب حالت تھی میری.... میرے حواس میرے غم سے جدا ہو رہے تھے اور میرے ہوش بے گامگی سے دو چار تھے۔ اگر کچھ تھا تو وہ دھند میں ڈوبی ہوئی مسجد کے صحن میں موجود قبرستان.... جس کی خستہ حال قبریں۔ اک اک کر کے میرے صحن دل میں منتقل ہو رہی تھیں۔

”میرے اللہ! میرے معبود! میری زندگی اور موت کے مالک! مجھ پر سے اس بوجھ کو کم کر دے۔“ اس مصیبت اور اس بوجھ کے تلے میرا دم گھٹنے لگا۔

جانے کیوں مجھے لگا کہ وجیہ اس مسجد کے صحن سے اٹھ کر چپ چاپ باہر چلا گیا ہو۔  
”وجیہ.....“ میں تڑپ کے اس کی جانب لپکی..... اور مجھے لگا میرے اوپر سے وہ سارا بوجھ ہٹ گیا ہو دھند اور اندھیرے میں لپٹی ہوئی وہ پہاڑ کی چوٹی اور چوٹی پر بنی لکڑی کی مسجد۔  
”عصمہ! اٹھو بیٹی۔“ انہوں نے مجھے پیار سے تھام کے اٹھایا۔

”ابا جان!“ میری جھکی ہوئی نظریں ایک ہل کو اٹھیں اور میں ان کے پیروں میں جھک گئی۔

”ارے..... رے..... میری بچی..... میری حیات۔“ انہوں نے تڑپ کے مجھے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دور رہے تھے مجھے سینے سے لگا کر سسک رہے تھے۔  
 ”میری بیٹی..... میری عصمہ!“ میری رخصتی کے وقت اپنی نم آنکھوں کو چھپانے کے لیے چہرہ موڑ لینے والے ابا جان..... میرے گھر لوٹ آنے پر وہ ر کے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔  
 جو اس وقت ان کے اندر اتر کر کنکریاں بن گئے تھے۔

”ابا جان! مجھے معاف کر دیں۔“

”کس بات کی معافی..... میری بیٹی معاف تو بلکہ تم ہمیں کر دو۔ ہم نے تم پر شاید کوئی زبردستی کرنے اور اپنی مرضی تم پر صادر کرنے کی کوشش کی تھی۔“

وہ نرمی سے کہہ رہے تھے۔ میرے آنسو صاف کر رہے تھے۔ مجھ سے معافی مانگ رہے تھے اس خطا کی جو انہوں نے کی ہی نہ تھی۔ انہوں نے میری مرضی کے سامنے سر جھکا دیا تھا یہ والدین بھی اللہ کی کیسی مخلوق ہوتے ہیں اولاد جیسی بھی ہوا سے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ درگزر کر دیتے ہیں۔ اور اولاد آہ میرے جیسی اولاد.....؟

احساس ندامت سے میں سر تاپا بیٹگی جا رہی تھی اور ابا جان کا خاموش اظہار الفت میری رگ رگ میں سرایت کر رہا تھا۔

”لو جی! گرم گرم چائے پی لیں ایک تو اتنی ٹھنڈ ہے کہ بندہ ہی جم جائے اس بے چارے چائے کی گرمی کب تک رہ سکے ہے۔“

نوراں مامی جیسے ہی چائے کی ٹرے لے کر آئیں بولنے لگیں..... ابا جان مجھے اپنے ساتھ لگائے لگائے وہاں لے آئے۔ ماما کے پاس۔

”آئیں عباسی صاحب! یہاں آ جائیں عصمہ تم بھی اوپر پاؤں کر لو..... لحاف اوڑھ لو۔“ انہوں نے ہمارے لیے فوراً جگہ بنائی ابا جان اس وقت مجھے بالکل اسی طرح سے لحاف میں لپیٹ کے بیٹھ گئے جیسے بچپن میں بیٹھا کرتے تھے۔

نوراں مامی نے ہمیں چائے کے کپ تھما دیے۔ حالانکہ میرا اندر اپنے غم سے حلق تک تر ہوا تھا مگر اس وقت اپنے والدین کی آغوش میں بیٹھ کر وہ چائے کا کپ مجھے زندگی افروز لگا۔

اس وقت چائے کے ساتھ رس بھی تھے جو میرے امی ابو ہمیشہ سے ایک ایک ضرور لیا کرتے تھے اور بچپن میں مجھے چائے کے ساتھ رس ڈبو کر کھانا بے حد مرغوب تھا۔

”یہ لو عصمہ! تمہاری پسند کا ہے۔“ ابا جان نے ایک خوش شکل رس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا مجھے ہمیشہ سے ہر چیز خوب صورت پسند تھی خواہ وہ کھانے کی ہوتی۔

”جی ابا جان!“ میں نے چائے میں رس ڈبو کر کھایا تو مجھے اس وقت وہ دنیا کی بہترین نعمت لگا..... میری آنکھیں پھر بھرا آئیں۔

”کیسی ہو؟ کب آئیں؟ اور وہ وجہ کہاں ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا تمہارے ساتھ۔“ ابا جان مجھ سے پوچھنے لگے۔

”جی..... وہ وہ ملک سے باہر گئے ہیں آئیں گے تو مجھے لینے آئیں گے۔“ میں نے فوراً جھوٹ بولا۔

”اچھا۔ اچھا چلو اچھا ہے تم چند روز ہمارے ساتھ رہ لو گی..... رہو گی نا؟“ انہوں نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات کی تصدیق چاہی وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ کچھ روز رہوں..... وہ میری کمی کو اب شدت سے محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے لہجے کی سختی اور چہرے کی کرخشکی کی جگہ اک حلیمی اک نرمی تھی!..... کتنے بدل گئے تھے وہ مجھے ان کے اندر بے شمار دراڑیں دکھائی دیں..... جو بھینٹا میرے رویوں کی بدولت پڑی ہوں گی..... کیسے بیٹی تھی میں جس نے اپنے والدین کو شکستہ اور بوسیدہ کر کے رکھ دیا تھا۔

”بابا جان! اب میں بہت سارے دن آپ کے اور ماما جان کے ساتھ رہوں گی۔ جب تک وجہ نہیں آتے۔“ میں نے محبت سے انہیں یقین دلایا۔ جسے سن کر وہ مسکرا دیے۔

”خوشی سے رہو..... مگر وجہ کی اجازت اور رضا مندی کے ساتھ رہو اب تمہیں ہم سے پہلے اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ انہوں نے سادگی سے مجھے نصیحت کی۔

”جی ابا جان۔“ میں نے مختصر کہا۔

”نفیسہ! اب تو تمہاری آدمی بیماری ویسے ہی بھاگ گئی ہو گی۔ ہے نا؟“ اب وہ ماما سے پوچھ رہے تھے۔

”ظاہر ہے بیٹی آگئی ہے اب بیماری کا کیا کام؟ ایک میاں میں دو نکواریں کیسے رہیں گی؟“ وہ مسکرا دیں۔

”دو تلواریں؟“ ابا جان نے مجھے معنی خیز انداز میں دیکھا پھر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا ہے کہ بیماری چلی جائے اور عصمہ پورے اعتماد اور حق سے رہے آپ کے دل میں۔“ پھر وہ چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھ کے چلے گئے۔ اور میں اپنی ماں کے ہاتھ دبانے لگی۔



میں چائے پینے کے بعد ماما کے ساتھ دوبارہ لگ کر سو گئی۔ ایک گہری نیند اتنی گہری نیند کے پہلے شاید پورے برس نہ سوئی تھی۔ میری آنکھ لگی ہی تھی جب صنوبی کا ہنسا مسکراتا چہرہ میرے خواب میں آ گیا جیسے وہ کبہر ہی ہو۔

”بھر جائی! رات تو میں بہت ہی گہری اور میٹھی نیند سوئی۔ اتنی میٹھی کہ آج یونیورسٹی بھی نہیں گئی۔ اب تو دل کرتا ہے کہ میں کبھی یونیورسٹی نہ جاؤں..... پتا ہے بھر جائی! میں تو ویسے بھی یہاں سے جاری ہوں..... میرا تو دیر الگ گیا۔ آپ مجھے بہت یاد آؤ گی..... کیا آپ مجھے یاد کرو گی؟“ وہ میرے گلے میں بائیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو پتا تو ہے..... میری شادی ہو گئی ہے؟“ وہ شرارت سے بولی۔

”لیکن کہاں کہاں جا رہی ہو؟“ مجھے اس کی شرارت سے الجھن ہو رہی تھی۔

”اللہ حافظ بھر جائی! اپنا خیال رکھنا اور مجھے یاد کر کے میرے لیے دعا کرتی رہنا۔“ وہ جیسے مڑی اور تیز تیز قدموں سے واپس پلٹ گئی۔ میں نے چاہا کہ اس کے پیچھے جاؤں مگر کسی سخت چیز سے میرا پاؤں ٹکرایا اور میں گرتے گرتے ہنچی۔

”س..... س..... ی، ی، ی۔“ میرے لبوں سے بے ساختہ ”سی“ نکل میں نے دیکھا تو میرا پاؤں جس سے ٹکرایا وہی شخص تھا جو اس رات لکڑی کی مسجد میں کبل تانے سو رہا تھا اور جس سے تب میرا پاؤں ٹکرایا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا تھا۔

”آؤ بی بی! آپ کو میں اپنے گمر لے چلوں۔ آپ راستہ بھول گئی ہو۔“ وہ میرے آگے

آگے چل دیا۔

”رکو..... رکو۔“ میں اسے آوازیں دیتی ہوئی اسے روکنے لگی۔

”رکاوِ جیہ کو تو آنے دو۔“ میں ادھر ادھر و جیہ کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”بی بی! تم اکیلی ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے جلدی سے آ جاؤ میں تمہیں راستہ  
 دکھا دوں۔“ وہ تیز تیز قدموں سے آگے چلا گیا۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔  
 ”یا اللہ! خیر! یہ کیسا خواب تھا؟“ میرا دل پریشان سا ہو گیا اتنے میں ابا جان کمرے میں  
 داخل ہوئے ان کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا۔

”عصمہ! اٹھو! یہ خبر دیکھو۔“ انہوں نے اخبار میرے ہاتھ میں پکڑا دیا ان کے چہرے  
 پر عجیب سی ہوائیاں اڑ رہی تھیں میں نے لرزتے ہاتھوں سے اخبار پکڑا۔  
 ”معروف زمیندار اور سیاست دان گھرانے کی جوان سالہ چشم و چراغ انتقال کر گئیں۔  
 مرحومہ کی عمر صرف اکیس برس تھی اور وہ حرکت قلب کے بند ہونے سے چل بسیں۔“ آگے کیا لکھا  
 تھا میری نظروں کے سامنے دھندلا گیا۔ صوبی کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر کے ساتھ یہ خبر اس وقت  
 ملک بھر کے اخبارات میں موجود ہوگی۔  
 ”صوبی!.....!“

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ میرے ہونٹ کانپے اور اٹک میری آنکھوں سے جاری ہو  
 گئے۔

”وہ اس دنیا میں نہ رہی تھی یہ تو ج تھا جو سامنے آ گیا تھا مگر اس کی موت حرکت قلب  
 کے بند ہو جانے کی وجہ سے واقع نہ ہوئی تھی بلکہ اسے تو اس کے سفاک بھائیوں نے خود اپنے  
 ہاتھوں سے۔“ میرے دل و دماغ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

”عصمہ! تمہاری نند کی یوں اچانک اور جوان موت..... بڑا صدمہ ہوا بیٹا۔“ ابا جان  
 نے میرے کندھے پر حوصلہ کا ہاتھ رکھا۔

”نفیسہ! اٹھ کر ہمت کرو تیار ہو جاؤ، عصمہ تم بھی جلدی کرو۔ نماز جنازہ ظہر کی نماز کے  
 ساتھ ہے۔“ ابا جان ہمیں دہاں جانے کے لیے تیار ہونے کو کہہ رہے تھے۔  
 ”عماسی صاحب! یہاں بیٹھیں۔“ ماما نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

”ہاں کہو۔“ وہ حیرانگی سے انہیں دیکھنے لگے۔ پھر ماما نے دیرے دیرے انہیں ساری  
 بات بتادی جتنی میں نے انہیں بتائی تھی..... ابا جان کے چہرے کا رنگ بدلتے بدلتے سیاہ پڑ گیا اور  
 اٹھے اور چپ چاپ کمرے سے نکل گئے۔ ان کے قدم ٹھکن سے اور کندھے کسی بھاری بوجھ سے

لگے ہوئے تھے۔ اور ان کے لیوں پر اک سرد آہ تھی۔  
 ”جو ہوا وہ اچھا نہ تھا اور جو ہوا ہے وہ اس سے بھی برا ہوگا..... اللہ رحم کرے اللہ رحم کرے۔“ وہ کہتے جا رہے تھے اور کچھ دیر پہلے کا دیکھا ہوا خواب میری سماعتوں میں چلانے لگا تھا۔



وجیہ کا فون مسلسل بند جا رہا تھا..... میں کب سے آزار ہی تھی..... مگر وہی کمپوٹر انڈ

جواب۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے دوبارہ کوشش کریں۔“ میں بھی دوبارہ کے لیے تو کوشش کر رہی تھی۔ مگر بار آور نہ ہو پار ہی تھی۔

”وجیہ!“ تم کہاں کھو گئے ہو؟“ میں شام کو اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے کھڑی تھی۔ باہر ابھی سے دھند کی دیز تہ فضا پر لپٹ رہی تھی سخت سردی تھی۔ ایسی سردی جو صرف گرتی ہے آسمان سے اترتی ہے اور زمین کے اوپر موجود ہر چیز میں پیوست ہوتی جاتی ہے۔ مفلوج کرتی چلی جاتی ہے۔ میرے دماغ سے میرے پاؤں کے انگوٹھوں تک جیسے ہر چیز جم چکی تھی۔ ٹھنڈی برف ہو چکی تھی سن اور بے جان..... حتیٰ کہ میرے آنسو بھی اور وجیہ کی یاد بھی، میں نے موبائل سیٹ ایک طرف رکھا اور کھڑکی بند کر کے بستر پہ آ گئی۔

”ارے عصمہ بیٹا! اس وقت بستر میں نہیں بیٹھتے۔ اٹھو اور وضو کی تیار کرو۔ مغرب کی اذان ہونے ہی والی ہے۔ بڑے بزرگ کہتے چلے آئے ہیں کہ یہ وقت دو وقتوں کو ملاپ کا ہوتا ہے سورج غروب ہو کر رات طلوع ہوتی ہے کسی چاندنی اور کبھی اماؤس والی۔ مگر یہ زوال کا وقت کہلاتا ہے۔ اس وقت تو انسان کو استغفار کرنی چاہیے۔ اٹھو! آپ بھی استغفار کرو۔ پہلے ہی بہت گردش آ چکی ہے آپ پر۔“

نوراں ماما جانے کس کام سے میرے کمرے میں آئی تھیں مجھے لحاف میں گھستا دیکھ کر نصیحتیں کرنے لگیں۔

”جی ماما!“ میں فوراً اٹھ بیٹھی..... اب تو مجھے لگتا تھا جیسے میرے حواس خمہ صرف فرمانبرداری کے اصول پر چل رہے ہوں۔ دماغ آرڈر کرتا اور میرے اعصاب خود بہ خود وہ کام کرنے لگتے۔

ہنسو اور روؤ..... کے احکامات تو برف ہو چکے تھے۔ نہ میں رو رہی تھی نہ ہنس رہی تھی..... نہ اپنے بارے میں میری کوئی سوچ ہی رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا میں اک رو بوٹ ہوں۔ جس کی کوئی فضا کوئی دل نہیں ہوتا..... وضو کیا۔ مغرب کی اذانیں ہو گئیں۔ نماز پڑھی استغفار کی تسبیح پڑھی۔ ماما اور بابا جان کے ساتھ دو چار نوالے رات کے کھانے کے نام پر کھائے۔ پھر عشاء ہو گئی۔ نماز پڑھی اور سورۃ ملک پڑھ کر لیٹ گئی۔ اب میں ماما کے ساتھ ان کے کمرے میں سوئی تھی۔

میرے شب و روز کتنی جلدی اور کس طرح سے بدل گئے تھے۔..... یہ بات بھی میرے فہم سے بالاتر تھی میرا یہ ذہن وجہ کے بغیر بسر ہو رہا تھا اور میں جی رہی تھی میں جو یہ سمجھتی تھی کہ اب تو شاید میں ایک لمحہ بھی وجہ سے دور رہی تو مر جاؤں گی..... میری بے قراری اور بے کلی بھی برف ہو چکی تھیں..... قطرہ قطرہ پھیلتی اور پھر سے جم جانے والی برف ان ساری باتوں کے باوجود میرے اندر کچھ تھا جو مجھے کمرچ رہا تھا دستک دے رہا تھا میرے حواسوں پر کوئی مزید ہونے والی انہونی تھی جو پاؤں اٹھائے اندر آنے کو تیار کھڑی تھی کچھ تو ایسا ضرور ہونے والا تھا جس کے ہونے سے کوئی آتش فشاں پھٹنے والا تھا اور یہ ساری سردی فنا ہونے والی تھی ساری برف جوش کھاتے پانی میں تبدیل ہونے والی تھی۔

”کیا.....؟“

میں نہ جانتی تھی۔ سو منتظر تھی اور شاید اس کے استقبال کو تیار بھی میں میری ماں اور میرا باپ اس وقت ایک کون کی صورت اختیار کر چکے تھے اک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے اپنے اپنے منہ مخالف سمت میں کیے ہوئے مگر پھر بھی اک دو بے سے متصل۔

نہ ماما اب مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔

نہ بابا جان۔

ہمارے درمیان بس رسمی سی گفتگو تھی اور زندہ رہنے کے لیے ضروری لوازمات ماما کے چہرے پر گہرا کرب تھا جو رات بھر ان کی کرونوں کے ساتھ رویا کرتا تھا بابا جان کے چہرے پر اک سایہ تھا جو کسی قیامت کے انتظار میں لبا اور لبا ہوتا جا رہا تھا اور میں..... میرا اندر باہر اک گہری دھند میں چھپا کھڑا تھا..... ایسے چور کی طرح جس نے شام ہوتے ہی کسی کولونے کی ٹھان لی ہو۔

مجھے ماما کے پاس آئے ہوئے آج ساتواں روز تھا میں اپنے کیے کے گویا حشر دیکھ چکی تھی اذیتوں اور درد سے اٹے ہوئے حشر۔

حساب کتاب کی جمع تفریق میں الجھے ہوئے ساتھ حشر۔

میرے دونوں ہاتھ سیدھے ہوتے ہوتے اکڑ چکے تھے۔

اور میرا نام اعمال تھا کہ سامنے نہ آ رہا تھا۔ گویا میری آنکھیں سیاہ نقاب تلے آچکی تھیں اور میری گردن میں رسی کا پھندا ابل کھا رہا تھا اب تو بس میرے پاؤں تلے سے تختہ دار کھینچتا تھا اور کہانی ختم۔

اف میری کہانی۔

عصمہ سے دلنشین بننے کی روداد۔

وجیہ کی شدت انگیز محبت کی داستان۔

اور ان کی مدت ایک سال صرف ایک سال۔

آج میری شادی کی سالگرہ تھی۔ وہ سالگرہ جسے شان و شوکت سے منانے کا پروگرام وجیہ نے ایک مہینہ قبل ہی تشکیل دے لیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس روز ہم ڈنر کے لیے آئے ہوئے تھے۔

جب ایک دم سے وجیہ نے کہا۔

”دلنشین! آج رات ہم گھر واپس نہیں جائیں گے۔“

”اچھا..... پر کیوں؟“ میں نے راضی ہوتے ہوئے وجہ پوچھی۔

”آج ہماری شادی کو پورے گیارہ مہینے ہو گئے ہیں۔“ وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

”اچھا پھر.....؟“ میں اس کے دل کی بات جاننا چاہتی تھی۔

”پھر یہ کٹھیک ایک مہینے کے بعد ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ جسے میں بہت انوکھے

اور شان دار انداز میں منانا چاہتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں ستاروں کا جھرمٹ تھا۔

”مثلاً تم کیا کرو گے؟“ میں نے اس جھرمٹ کو اپنی پلکوں سے اتارتے ہوئے پوچھا۔

”میں اپنی محبت کا صدقہ دوں گا تاکہ اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ پھر میں اور تم.....

بس ہم دونوں..... ہم دونوں کہیں دور چلیں گے؟“ وہ کھویا ہوا تھا۔

”کہاں..... دور؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”شاید سوئٹزرلینڈ..... جہاں ندیوں اور جھرنوں کے بیچ..... چاند کے پانی میں اترنے



کے وقت ہم اپنی سالگرہ کا ایک کاٹیں گے۔“ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح سے خوش ہو کر بتا رہا تھا۔

”اوہ..... اچھا میں تو سمجھی تھی تم شہر بھر کو ایک شاندار دعوت کھلانے والے ہو اور ان کے بیچ میں۔“

”لوگوں کے بیچ میں کیوں؟ کیوں؟ کیوں میرے اور تمہارے بیچ لوگ کیوں.....؟“ وہ میری بات کو درمیان سے ہی اچک کر بولا۔

”اچھا بابا..... میں اور تم..... صرف میں اور تم پر یہ تو بتاؤ کہ تم مجھے تھکے کیا دو گے؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”تھکے..... ہاں تھکے۔“ وہ جیسے کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں بھی شادی کی پہلی سالگرہ کا تھکے؟“ میری بے تابی کو انتظار منظور نہ تھا۔

”وہ تو میں نے ابھی سر پر اتار رکھا ہوا ہے۔ بلکہ بیچ پوچھو تو ڈیسا بڑی نہیں کیا۔ سمجھ ہی نہیں آرہی کہ کیا دلوں؟ وہ وہ دراصل میں تمہیں کوئی بہت ہی انوکھا اور یادگار تھکے دینا چاہتا ہوں۔ جیسے جیسے کہ شاہ جہاں نے ممتاز کو دیا تھا۔“ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

”یعنی..... تاج محل۔“ مجھے عجیب ہی لگا۔

”ہاں کاش کہ ایسا ہوتا کاش میں اس وقت پیدا ہوتا اور شاہ جہاں ہوتا۔“ اس پر شوخی سوار تھی۔

”اے مسٹر سنو! شاہ جہاں کی کئی بیویاں تھیں اور نہ جانے یہ ممتاز ان کی کون سی بیوی تھی۔“ میں نے اسے تاریخ یاد کرانی چاہی۔

”اور..... اور تاج محل میں ممتاز کی قبر ہے..... مقبرہ ہے وہ محل کے نام پر جو کہ مردہ لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔“ میں نے ذرا ناراضی سے کہا۔

”تو کیا ہوا..... دلشیں! اک نہ اک دن مر تو ہم سب نے جانا ہے۔ یہ چاہتیں یہ محبتیں یہ تو اک نہ اک دن فنا ہو ہی جاتی ہیں۔ اصل محبت تو وہ ہے جو یادگار رہے..... عمر بھر بیتنے کے بعد تک۔ دنیا بھر کے لوگوں کو۔“

وہ سنجیدہ شکل بنا کر صاف شیطانی کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی۔

”تو تم چاہتے ہو کہ میں بھی مر جاؤں اور تم میرا مقبرہ بناؤ۔“ میں نے روٹھ کر کہا۔

”ہاں نہیں ویسے یاد آیا۔“ وہ چٹکی بجاتا ہوا ہنسا۔

”اب کیا یاد آگیا؟“ مجھے اس پر مصنوعی غصہ تھا لہذا منہ پھلائے ہوئے تھی۔

”یہی کہ تم کون سا میری پہلی محبت ہو۔“ وہ پکی سی صورت بنا کر بولا۔

”وجیہ.....“ میں نے ایک مکا ہوا میں لہرا کے اس کی پیٹھ پر جڑ دیا۔

”ارے..... رے..... مار دیا۔ ظالم۔“ وہ اپنی کمر سہلانے لگا۔

”ویسے اگر ہم ساتھ رہے تو تم میری آخری محبت ضرور ثابت ہوگی جس کے لیے میں

لازمی کوئی ناکوئی یا دگار چھوڑ دوں گا۔“ وہ اسی موڈ میں تھا اور میں ناراض ہو کر چل دی تھی۔  
”دلشیں!“

”دلشیں!“ وہ میرے پیچھے لپکا اور مجھے تمام کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ

میرے سامنے ہانہ دے دیے تھے۔

”کیا کروں بابا..... سچ بولنے کی عادت ہے۔ تم سے پہلے بہت کچھ کیا۔ بہت سی کرل

فریڈ زاور اور خیر چھوڑو مگر پورے ایک برس میں نے کچھ ایسا نہیں کیا قسم سے..... بلکہ تمہاری قسم۔“

وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا رہا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی۔

”بے ایمان..... پلے بوائے۔“ میں نے اس کے سر پر ایک چپٹ لگائی۔

”معاف کر دو پلیز۔“ وہ پھر سوری کر رہا تھا۔

”اوکے..... کانوں کو ہاتھ لگاؤ اور وعدہ کرو قسم کھاؤ کہ اب کبھی بھی نہیں سوائے

میرے۔“ میں نے اسے پابند کرنے کے لیے شرط رکھ دی۔

”وعدہ..... جب تک تم ہو کوئی نہیں۔“ وہ وعدہ کر رہا تھا۔

”وجیہ ایہ کیا تم آرام سے کہتے رہے ہو جب تک تم ہو۔ جب تک تم ہو کیا تم مجھے کبھی

چھوڑ دو گے؟“ میں خوف زدہ ہو کر پوچھ رہی تھی۔

”نہیں..... میں تو تمہیں کبھی بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ لیکن کیا خبر کبھی تم ایسا چاہو؟“ وہ الٹا

مجھ سے سراپا سوال تھا۔

”میں میں کیوں؟ میرا تو اول آخر تم ہو۔“ مجھے اس کی بات بری لگی تھی۔

”اوائے کلی اے..... وقت اور حالات کا کیا پتا یہ بہت ظالم اور بے رحم ہوتے ہیں

ہمارے ساتھ اچانک ایسا کھیل کھیلتے ہیں کہ ہم پتھر کے بت ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ اپنا فیصلہ سنا

جاتے ہیں۔ اس زندگی میں کچھ بھی دائمی نہیں..... نہ رشتے اور نہ ہی خود انسان جب یہ زندگی ہی عارضی ہے تو پھر سب کچھ اسی کے فارمولے پر قائم ہوگا کہ نہیں..... جب فحاشی لازم ہے تو پھر ہر چیز نے مٹنا ہے کہ نہیں۔“ اب وہ اپنے فلاسفی والے خاص نقطہ نظر کی وضاحت کر رہا تھا۔

”ہاں مگر..... لوگ پھر بھی ساتھ رہنے کی قسمیں کھاتے ہیں۔ حالانکہ آخر میں ایک چلا جاتا ہے تو دوسرا اس کے بغیر بھی زندہ رہتا ہے۔“ وہ پھر بھی اپنے خیالات پر اٹل تھا۔

”لیکن وجیہ.....؟“

”لیکن ویکن کچھ نہیں میری جان!“ اس نے میرا سوال کرتا ہوا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے

لگا لیا۔

”جب تک ہم ساتھ ہیں..... پوری ایمانداری کے ساتھ اک دوسرے سے محبت کریں گے۔ اک دوسرے کو خوش رکھیں گے اور جب قدرت کو منظور نہ ہوا تو؟“

”تو کیا وجیہ؟“ میری سانسیں تو مارے خوف کے بندھنے لگی تھیں۔

”تو تو“ وہ میرے کمرے کے گرد اپنا بازو حائل کر کے کنگٹانے لگا۔

قسم نہ لو کوئی ہم سے

قسم نہ ہم کوئی کھائیں گے

جب تک ساتھ نیچے گا

ہم جب تک ساتھ بھائیں گے

گر ساتھ نہیں جو نیچے گا

دل سے دل گر نہ ملے گا

تو جیسے دوست جدا ہوتے ہیں

ہم ویسے جدا ہو جائیں گے.....

وہ کنگٹانہ رہا تھا اور میرا دل اندر ہی اندر سک رہا تھا..... دعا گو تھا۔

”اللہ نہ کرے..... اللہ کبھی نہ کرے کہ ایسا ہو۔“ اور میری ہر سانس آئین کہہ رہی تھی۔



آج میری شادی کی سالگرہ کا دن تھا جو آدھا گزر چکا تھا آج وجیہ کا کوئی فون تک نہ آیا

تھا۔ اس نے مجھے مبارک باد تک نہ دی تھی..... میں نے کئی بار اس کا نمبر ملایا تو وہ پچھلے چھ روز کی طرح آج ساتویں روز بھی بند تھا۔

میں بے حد اداس تھی۔ آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں روؤں مجھے وجہ یاد آ رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ وہ اچانک ہی کہیں سے نمودار ہو اور ایک زوردار ہو..... کر کے مجھے ڈرا دے۔ پھر اپنے ساتھ لگا کر کہے۔

”ڈر کیس نا.....؟ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ تمہارا دل کتنا بڑا ہے؟“  
 ہلکی! میں تو تمہیں آزار رہا تھا..... کہ تم میرے بغیر رہ سکتی ہو یا نہیں؟ آؤ اٹھو! چلو گھر چلیں۔“

میں نے انتہائی کرب سے سوچا اور آنکھیں موند کے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹک دیا۔  
 اف کیسا ناقابل برداشت درد تھا جو اس وقت میرے سینے میں اٹھ رہا تھا..... کیسا غبار.....  
 کیسا جس تھا جو میری سانسیں گھٹانے دے رہا تھا۔  
 ”کاش! کاش! کہ اس وقت کوئی مجھے رلا دے۔“

میں نے بے بسی سے اپنا ہاتھ اپنے ماتھے پر مارنا شروع کر دیا..... یہ مجھے رونا کیوں نہیں آ رہا..... میری آنکھوں کے سوتے کیوں خشک ہو گئے ہیں؟ یہ میرے آنسو کہاں چلے گئے؟  
 میں گھبراہٹ کے مارے کرسی سے اٹھ گئی اور جا کر برآمدے میں ٹھہرنے لگی..... اس وقت میں اپنی کیفیت سے اس قدر تنگ پڑ چکی تھی کہ جی چاہ رہا تھا کہ کچھ اٹھا کر اپنے اس گم سم سے دل پر اپنے دماغ پر دے ماروں..... کچھ ایسا ہو کہ میں رو پڑوں۔ عجیب سا ڈپریشن تھا مایوس زندگی کو مزید مایوس کر دینے والا۔

”عصمہ! عصمہ بیٹا!“

میری سماعتوں کی گھپ گھری کھائی میں نوران ماما کی آواز نے ابھر کے کم از کم وہ سکوت تو توڑا خود کلامی کے اس جھل میں کوئی سرسراہٹ تو ہوئی۔

”جی.....“ میں نے مڑ کر دیکھا وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھیں۔

”وہ باہر کوئی آیا ہے..... آپ کے گھر سے۔“ انہوں نے اتنا کہا اور میں دیوالوں کی طرح سے گیٹ کی طرف ہلکی۔

”میرے گھر سے؟ مجھے یقین آنے میں ذرا دیر نہ لگی..... وجہ نے ہی بیجا ہو گا وہ

..... وہ مجھے کیسے یاد نہ کرتا..... وہ بھی آج کے دن؟“ میں لمحوں ہی میں خوش گمانیوں کے آسمان تک پہنچ گئی تھی۔

گیٹ کے اندر ہی فضل کھڑا تھا۔

”فضل تم؟“ اسے دیکھ کر مجھے اچھا لگا۔

”سلام ولفشیں بی بی!“ وہ مودبانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ولیکم السلام..... شموں کیسی ہے؟“ میں نے فوراً ہی شموں کا پوچھا..... مجھے اس کے

بارے میں پوچھنے کی جلدی تھی۔

”جی..... وہ وہ ٹھیک ہے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”اچھا..... اور وجیہ؟ اس کا موہا ل نہیں ملتا۔“ میں نے ناچاہتے ہوئے بھی فضل سے

پوچھ لیا۔ میں کیا کرتی اگر اس سے بھی نہ پوچھتی تو؟

”جی..... جی وہ تو ملک سے باہر ہیں۔“

”ملک سے باہر۔“ میرا خوشی سے بلیوں اچھلتا ہوا دل ایک دم بیٹھ گیا۔

”جی..... وہ آپ کو تو معلوم ہے مجبوری تھی اب تو سال دو سال انہیں باہر ہی رہنا پڑے

گا۔“ وہ سر جھکائے مجھے بتا رہا تھا۔

”لیکن کیوں؟“ مجھ پر دوبارہ سے اوس پڑ رہی تھی۔

”وہ جی..... صنوبی بی بی والے معاملے کی وجہ سے احتیاط تو کرنی پڑتی ہے نا؟“ اس

نے مجھے سمجھانا چاہا۔

”صنوبی ہاں۔“ میرے اندر آہیں ہی آہیں پھیل گئیں۔

”اچھا جی..... یہ کچھ سامان ہے آپ کا وہ دینے آیا تھا میں۔“ فضل اپنے آنے کا مقصد

بتانے لگا۔

”میرا سامان؟“ میں نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی یہ سامان ہے۔ لاڈی سائیں کا فون آیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو پہنچا دوں۔“

اس نے ایک خاصا بڑا اور بھائی بھرم انٹیچی مجھے دکھا کر چوکیدار چاچا کی طرف کر دیا۔

”اچھا اور کچھ کہا وجیہ نے کوئی نیا موہا ل نمبر دیا اٹنا۔“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

”جی..... یہ ہے۔“ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بڑا سا خاکا لٹافہ

نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ جسے میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔  
 ”اچھا جی..... رب راکھا۔“ فضل نے اجازت لی اور وہ لوٹ گیا۔  
 ”چا چائی! آپ یہ سامان اندر لے آئیں میرے کمرے میں۔“ میں تیزی سے اپنے  
 کمرے کی طرف بڑھی مجھے وہ لفافہ کھول کر پڑھنے کی جلدی تھی۔ جس میں وجیہ کا محبت نامہ تھا۔ اس  
 نے اپنا حال دل لکھا ہوگا۔

لکھا ہوگا کہ وہ میرے بغیر کس طرح سے یہ وقت گزار رہا ہے؟  
 لکھا ہوگا کہ یہ مجبوری اس کے لیے کتنی سوہان روح ہے؟  
 یہ بھی لکھا ہوگا کہ وہ جلد ہی مجھے اپنے پاس بلا لے گا اور اس کا نیا سوبائل نمبر بھی تو ہوگا۔  
 میں نے کمرے میں آ کر چاچا کو کہا کہ وہ جلدی سے میرا ٹیپی اندر رکھ دے اور جائے۔  
 چاچا کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور دھڑکتے دل کے  
 ساتھ لفافہ کھولا۔

اس میں سے ایک چیک نکل کر زمین پر گر گیا۔

”چیک؟“ میں نے کانپتے ہاتھوں سے وہ چیک اٹھا دیکھا..... وہ خالی تھا ”یعنی  
 Blank Check“ میرا دل خوش ہونے کے بجائے مجھ سا گیا۔  
 ”یہ کس لیے؟“ میں نے وہ چیک ایک طرف رکھ دیا اور اس میں موجود کاغذ کھولا۔  
 ”ڈیئر عصمہ!“

”یہ آج وجہ نے مجھے عصمہ کیوں کہا؟“ میں نے اتنا ہی پڑھ کر اپنی نظریں کاغذ سے  
 ہٹائیں اور سوچنے لگی میری چھٹی حس نے میرے حواس کو چمکانا شروع کر دیا تھا ڈرتے ڈرتے  
 میں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

”اس وقت جب میں تمہیں یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں تو تم سے ہزاروں میل کے  
 فاصلوں پر بیٹھا ہوں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ وقت اور حالات نے اپنی بے رحمی کی نگاہ ہماری ازدواجی  
 زندگی پر گاڑی دی آخر اور ہم اس کی بد نظری کا شکار ہو ہی گئے۔

میں اس وقت بے حد پریشان بے حد دکھی ہوں۔ میری زندگی میں اب باقی کی عمر میں  
 دو خدا کبھی بھی پر نہ ہو سکیں گے۔

ہولناک، جان لیوا گہرے اور اندھیرے گڑھے..... اب تا قیامت میرے دل میں

پڑے رہیں گے جن میں میری آنکھیں پانی بھرتی رہیں گی وہ پانی جو میری رگ رگ میں اب لہو کی جگہ گردش کر رہا ہے کیونکہ لہو تو میں بھا چکا ہوں۔

صنوبی کا.... اور تمہارا۔ اب مجھ میں وہ لہو باقی نہیں ہے جو زندگی کو توانائی بخشتا ہے اور انسان ایک صحت مند زندگی گزارتا ہے جیتا ہے۔

عصمہ! ہم اچھے دوستوں کی طرح ملے تھے۔ ہم نے دو سچے چاہنے والوں کی طرح جیا جتنا ہمارے مقدر میں تھا اور اب ہم اچھے دوستوں کی طرح ٹھہر رہے ہیں مجھے معاف کر دینا عصمہ! میں بہت دور تک تمہارے ساتھ نہیں چل سکا مگر جس قدر چلا اس کے ہر قدم پر تمہیں ہی چاہا اتنا چاہا کہ باقی سب بھول گیا تم بہت اچھی ہو عصمہ! بہت ہی اچھی اور بہت خوب صورت بھی تم جوان ہو عصمہ!

ابھی زندگی کا ایک نظر نہ آنے والا سفر تمہارے سامنے کتنا کسے معلوم کر تمہیں اور مجھے جینا ہوگا۔ خواہ رو کر جنیں..... یا انس کر، تنہا جنیں یا کسی کا ہاتھ تمام کر تو بہتر ہے کہ تم زندگی کی اس تلخ حقیقت کو جلد ہی بھلا کر اپنی نئی زندگی کا آغاز بھی جلد ہی کر لو عصمہ! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارا خطا دار ہوں اور مجھے اس کی سزا مل رہی ہے نا چاہتے ہوئے بھی میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔

عصمہ ممتاز الحسن!

میں وجیہ الدین

اپنے پورے ہوش و حواس میں اپنے چند مسائل کی بنا پر تمہیں

طلاق دیتا ہوں

طلاق دیتا ہوں

طلاق دیتا ہوں

تمہارا حق مہر..... تمہاری چیزیں اور تمہارے لیے کچھ تحائف مجبوراً ہا ہوں اور ہاں ایک بلینک چیک بھی ہے۔

سمجھو میں تمہیں ہر جانہ ادا کر رہا ہوں۔ اس باقی کی زندگی کا جس میں اب میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا تمہارے ان دھوکوں کا ان آنسوؤں کا جو تم میری وجہ سے میرے لیے بہاؤ گی۔ زیادہ دھکی مت ہونا عصمہ! زیادہ رونا بھی مت زیادہ رونے سے تمہاری ناک سوج جاتی ہے اور تم بری لگتی ہو۔ ارے! سو سواری میں مذاق کر رہا تھا۔ زندگی کے اس قیامت خیز سانچے پر مذاق ہی زندگی

ہے عصمہ! یا پھر میں زندگی کو اسی طرح سمجھتا ہوں مجھے معاف کر دینا۔ میں زیادہ اچھا نہ تھا۔ مگر میں بہت برا بھی نہ تھا۔ کبھی سوچنا اور مجھے اپنی اچھی دعاؤں میں رکھنا۔ ہمارا ساتھ قدرت کو اسی قدر منظور تھا۔

اللہ تمہیں خوش رکھے۔ مجھ سے اچھا ایک دوسرا جیون ساتھی عطا کرے۔

عصمہ! اگر کوئی محبت سے تمہاری طرف ہاتھ بڑھائے تو اسے ٹھکراتا مت..... اپنا لینا کہ ہمیں اپنے فیصلے حقیقت کے پس منظر اور پیش نظر کی روشنی میں کرنے چاہئیں زندگی اب اتنی بھی ارزاں نہیں کہ اسے تم محض میرے لیے گنوا دو۔

ایسا مت کرنا عصمہ! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ شاید زندگی میں کبھی پھر ہماری ملاقات ہو۔ میری خواہش ہے کہ تمہیں جب بھی دیکھوں خوش اور تروتازہ دیکھوں۔ آمین اللہ حافظ۔

وجیہ الدین۔

(نوٹ: قانونی طور پر طلاق نامہ تمہیں جلد ہی مل جائے گا۔)

دلنشین وجیہ الدین کا سارا کردار لمحوں میں حل ہو گیا۔ میری کائنات کے زمین و آسمان اک قیامت خیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ ملے اور میری ذات زمین بوس ہو گئی۔ میں پھر سے عصمہ ممتاز الحسن بن گئی۔ لیکن اب میں وہ پہلی والی عصمہ بھی نہ تھی۔

وجیہ الدین کی شدید محبت کا منہ بولتا ثبوت۔

اس کی چاہتوں کا تاج محل۔

اس کی شدتوں کی یادگار۔

اور ان پر لگا اک کتبہ۔

طلاق یافتہ۔

یہی تھی میری معراج محبت۔



میں پچھلے دو روز سے ماتم کناں تھی..... نہ کھانا نہ پینا..... بس بستر میں منہ چھپائے پڑی تھی میرے بچکے کے نیچے وجیہ کا وہ خط تھا جو میرے اور اس کے ختم ہو جانے والے رشتے کا پیا مبر تھا اور بچکے کے اوپر میری بے قرار آنکھیں جو سادون بھادوں کی جھڑیاں لگائے ہوئے تھیں۔

”بیٹا! اٹھ جاؤ۔ اٹھ کر یہ دوا پی لو۔“ نورائیں مائی پھر سے دوا اٹھائے میرے سر ہانے کھڑی تھیں۔

”اٹھ جاؤ دوا پی لو تاکہ آگ کی طرح تپتا ہوا تمہارا وجود کچھ تو سکون پائے۔“ وہ میرے پاس بیٹھ کر میری پیشانی کو چھوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ مجھے بخار تھا اور اس بخار نے عین وقت پر آ کر میری بربادی کو ڈھانپ لیا تھا اور ان انگارہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنکھوں کا بھرم بھی رکھ لیا تھا۔ نورائیں مائی نے مجھے سہارے سے اٹھا کر دوا پلائی۔

”اے میرے اللہ..... اتنا بخار۔“ وہ میرے تیز بخار سے سخت پریشان تھیں۔

”ہم صاحب سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر کو بلا لیں۔ ان دواؤں سے یہ بخار نہیں اترنے والا۔“ وہ دوا کی شیشی واپس لے جاتے ہوئے بولیں۔

میں انہیں باوجود کوشش کے، اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ ڈاکٹر کو نہ بلائیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ میری زبان تو سوکھ کر میرے تالو سے لگ چکی تھی اور الفاظ نکالنے پر برس رہے تھے۔

”وجیہ! وجیہ۔“ میری روح تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھی۔

”تم مجھے نہیں چھوڑ سکتے۔ تم ایسا کر بھی کس طرح سکتے ہو؟

کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں تو اب بغیر تمہارے جی ہی نہیں سکتی..... اور تم خود بھی تو۔

میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور بچکے کے نیچے رکھا ہوا خط نکال لیا۔

”کیا خبر یہ خط وجیہ نے نہ لکھا ہو؟“ ایک خیال نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔  
 ”ہاں ہاں ہو سکتا ہے یہ خط وجیہ نے نہ لکھا ہو؟“ میں نے جلدی جلدی اس سے تہہ کیے  
 ہوئے کاغذ کو کھولا اور اس کی لکھائی کو اس امید سے دیکھنے لگی جیسے وہ وجیہ کی نہ ہونے کی گواہی دے  
 گی۔..... میں نے اس کے ایک ایک نقطے کو ایک ایک لفظ کو ٹھک کی نظر سے دیکھا کھوجنے والی  
 آنکھوں سے دیکھا۔

ایک ایک لفظ کو بار بار گھورا مگر وہ صاف شفاف جدا جدا موتیوں جیسے الفاظ وجیہ ہی کے  
 قلم سے نکلے ہوئے تھے۔ وجیہ کی لکھائی تو بے حد منفرد اور حسین تھی اردو اور انگریزی دونوں ہی وہ  
 بہت خوب صورت لکھتا تھا۔

اس کی شفاف آنکھوں کی طرح آئینہ ہوئے وہ الفاظ مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور گواہ تھے کہ  
 انہیں وجیہ نے ہی تخلیق کیا تھا۔  
 ”لیکن کیوں؟“ میرا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

”وجیہ مجھے دوبارہ نہ ملتا مجھ سے جدا ہو جاتا مگر مجھے خود سے یوں علیحدہ تو نہ کرتا اپنے  
 آپ سے مجھے کاٹ کر تو یوں الگ نہ کرتا۔“

میرا جی چاہا کہ میں وجیہ سے پوچھوں..... اس سے ایک بار ملوں اور مل کر اپنے اس  
 سوال کا جواب تو ضرور لوں میری خطا میرا قصور تو بتائے کہ آخر میں نے ایسا کیا کر دیا تھا۔ اب میری  
 بے قراری مجھے اکسانے لگی تھی۔ اور میں سوچنے لگی۔

”مجھے وجیہ سے ملنا ہے۔ اس سے بات کرنی ہے۔ اسے دیکھنا۔“ وجیہ کی یاد نے مجھے  
 یوں ستانا شروع کر دیا کہ میں پاگل ہونے لگی۔

”مگر کیسے؟“ وجیہ کی خبر اس کا پتا اس کا فون نمبر مجھے کون دے گا۔ یہ سارے کاف مل کر  
 میرے راستے میں رکاوٹ بن رہے تھے۔

”مجھے یوں اس کاغذ کے ٹکڑے پر اعتبار کر کے نہیں رہنا چاہیے مجھے اس سے بات کرنی  
 چاہیے اور اپنے گھر واپس جانا چاہیے آخر کو میرا حق میرے گھر سے یوں تو ختم نہیں ہو سکتا۔“  
 ”وہاں پر سب تمہاری جان کے دشمن ہیں۔“ میرے دل پر گرنے والا ایک ٹکڑا میرے

دماغ پر پڑا۔

”دشمن ہیں تو کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے بھی کوئی گولی ماروے گا۔ اچھا ہے ماروے۔“

اس زندگی سے تو بہتر ہو گا کہ مر جاؤں۔“ میرے اندر ازل سے وہی ضدی اور ہٹ دھرم عصمہ جھانکنے لگی جس نے سوائے اپنی ذات کے کبھی کچھ اور تو سوچا ہی نہ تھا۔

’اور یہ خط..... یہ حقیقت کیا تم اسے بھی نظر انداز کر دو گی؟‘ دوسرا کنکر بھی ٹھیک اسی نشانے پر آکر لگا اور میراں ہوا دماغ ڈر اسانستایا۔

”محبت اور جنگ میں کچھ بھی جائز ہے۔ محبوب کے وصل سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔“ میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

”یعنی..... دین مذہب، رسم و رواج لوگ معاشرہ؟ کچھ بھی نہیں۔“ اب تو مسلسل کنکر برسنے لگے تھے، مجھے چوٹ کے لگنے کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

”وجیہ! میرا وجیہ، میری محبت، میرا عشق، میرا جینا، میرا مرنا، میرا وجیہ اور صرف وجیہ۔“ میں نے اپنی ڈھٹائی کو بے غیرتی میں بدلتے دیکھا۔

میں نے جیسے ہی اس زاویے پر سوچا مجھے اپنے اندر اک توانائی اور ہمت کا عجیب سا احساس ہوا میرے دل میں پڑے سارے کنکر گویا پھول اور کلیوں میں بدلنے لگے نرم و گداز اجسام والے پھول۔

بے خود اور مدہوش کر دینے والی خوشبو میں رہے ہوئے پھول۔

”مگر اب وہ تمہارے لیے نا بھرم ہے۔“ پھر بھی کوئی نادیہ ہاتھ تھا جواب بھی مجھے کنکر

مار رہا تھا۔

”میرے لیے تو مرتے دم تک وہی میرا محرم رہے گا۔“ میرے دل میں کھلے پھولوں کی مہک میرے لبو میں رہنے لگی۔

”وہ تمہیں طلاق دے چکا ہے..... اب اس کا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں رہا اور اگر اب تم دونوں کوئی بھی تعلق رکھو گے تو وہ حرام ہو گا۔ گناہ ہو گا۔“ میرے دماغ پر پڑنے والے کنکر خاصے نوکیلے ہو رہے تھے۔

”محبت تو خود ایک عبادت ہے۔ میں پورے دل اور روح کی گہرائیوں سے اسے چاہتی ہوں اور یہ رشتہ کبھی بھی نہیں ٹوٹ سکتا..... اس نے مجھے دل سے طلاق نہیں دی۔ کسی کے دہاؤ میں مجبوری تحت دی ہو گی جب زبردستی کسی کا نکاح نہیں ہو سکتا تو پھر.....“

”یہ طلاق ہے عصمہ بی بی! امداق نہیں اور نہ ہی تم اسے مذاق سمجھو۔“ میں بڑی ہوشیاری

سے دلیلیں دے کر اپنے دماغ کو بہکانا چاہتی تھی مگر وہ تو بے دار ہو چکا تھا۔ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”میں نہیں مانتی۔ جب تک اس کے منہ سے خود میرے سامعیتیں نہ سن لیں میں نہیں مانوں گی۔“

میں بھی سراٹھا کر اکڑ گئی۔

”تم قانون قدرت سے جھگڑو گی.....؟“ میرا دماغ میرے اعصاب کو جھنجھوڑنے لگا۔  
 ”نہیں بس اپنی تسلی کروں گی اللہ کے واسطے مجھے پریشان نہ کرو مجھے اپنی تسلی کر لینے دو مجھے یقین تو آ جانے دو کہ وجہ نے ایسا اپنے ہوش و حواس میں کیا ہے۔“ اب میں خود اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھی التجائیں کر رہی تھی۔

”تم اپنی تسلیاں کرتی پھر دو..... جہاں سے چاہے جا کر فتوے لے لو..... مگر ہونے والی قیامت ہو چکی ہے..... اس کی شدت اس کی حقیقت اب تمام عمر کے پچھتاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”اچھا بس ایک بار..... صرف ایک بار مجھے اپنی تسلی کرنے دو۔“ میں نے پھر بھی یہی کہا اور اتنی ضد پر میرا دماغ پھر سے چپ ہو گیا یہ کہتا ہوا۔

”اس حقیقت کو مان لو عصمہ کہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلے تیرے کبھی واپس نہیں آ سکتے۔“ میں اسے نظر انداز کرتی ہوئی اٹھی اور خود کو گھسیٹتی ہوئی ہاتھ روم میں لے گئی میں شاور تلے کھڑی ہو گئی اور اسے پورا کھول دیا۔

سخت سردی کے باوجود مجھے ٹھنڈا پانی بھی ابلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں اپنے سلگتے ہوئے دماغ کو پرسکون کرنا چاہتی تھی..... مگر میں ناکام تھی۔



میرے پاس فضل کا موبائل نمبر تھا۔ اس وقت فضل ہی مجھے امید کی ایک کرن دکھائی دیا میں نے فضل کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری ہی تیلی پر اس نے میری کال ریسیو کر لی۔

”السلام علیکم و آلائہ و سلم بی بی؟“ مجھ سے پہلے وہ بولا اور مجھے یہ جان کر بے حد خوشی محسوس

ہوئی کہ اس نے میرا موبائل نمبر پہلے سے اپنے موبائل میں فیڈ کر رکھا تھا۔  
 ”علیکم السلام“ کیسے ہو فضل۔“ میں نے اپنی آواز میں بٹاشت بھرتے ہوئے پوچھا  
 دراصل میں اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو کسی پر بھی واضح نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تو اپنی ماں کو بھی  
 خود پر ٹوٹنے والی قیامت کا علم نہ ہونے دیا تھا۔ حالانکہ میں اس وقت ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ  
 پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ مگر میں نے خود پر جبر کر کے خود کو روک لیا تھا اور سیدھی اپنے کمرے میں  
 چلی آئی تھی۔

”جی میں ٹھیک ہوں بی بی! آپ کہیں آپ نے مجھے کیسے یاد کیا؟“ وہ مؤدبانہ انداز میں  
 پوچھ رہا تھا کہ اسے بھی تو علم نہ تھا کہ جولفانہ وہ مجھے دو روز قبل دے کر گیا تھا وہ میرے محبت کی موت  
 کا پروانہ تھا۔

”میں ٹھیک ہوں فضل..... شموں کیسی ہے؟“ میں نے شموں کا حال پوچھا۔  
 ”جی اب تو وہ ٹھیک ہو رہی ہے کافی بہتر ہے۔“ اس کی آواز میں خوشی کھنک رہی تھی۔  
 ”اچھا فضل! تم اب کیا کرو گے؟“ میں نے اس کے دل کو کریدا۔  
 ”جی میں نے شموں سے کہہ دیا ہے کہ میں اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ ذرا  
 جھجکتا ہوا بولا۔

”بہت ہی اچھا کیا تم نے جو شموں سے کہہ دیا۔ وہ کیا کہتی ہے؟“ میں نے بات آگے  
 بڑھائی۔

”جی وہ کہتی ہے کہ مجھے کچھ وقت دو میں ذرا اور ٹھیک ہوں۔“ وہ مجھے بتا رہا تھا۔  
 ”اچھا فضل! اگر شموں نے انکار کر دیا تو کیا کرو گے؟“ میں نے جان بوجھ کر اس کی  
 دکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”جی میں پھر بھی اس سے ناراض نہیں ہوں گا اور اسی سے محبت کرتا رہوں گا۔“ اس نے  
 بڑے اعتماد سے کہا۔

”کیوں ایسا کیوں؟ تمہاری عمر کیا بڑھا ہونے کے لیے ہے تم کو کیا لڑکیوں کی کمی  
 ہے؟“ میں نے اس کا دل کھگانے کی ٹھان لی تھی۔

”بی بی جی! میری عمر شموں کے نہ ملنے سے بھی بڑا نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں ابھی  
 بھی۔“ وہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا اس کی آواز اس کی اتھاہ گہرائیوں کی گواہ تھی۔

”محبوب تمہیں حاصل نہیں ہے اور تم خوش ہو، مطمئن ہو کیسے؟“ مجھے اس کے جواب پر سخت حیرت تھی۔

”محبوب تو مجھے حاصل ہے بی بی! میرے دل میں رہتا ہے۔“ وہ پھر بھی مطمئن ہی تھا اور میں پہلے سے زیادہ بے چین۔

”ایویں کملیاں نہ مارو فضل..... اپنے آپ کو نہ بہلاؤ شموں تمہاری نہیں ہے وہ کسی اور کو چاہتی ہے اور تم خوا خواہ ہی.....“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ جیسے میں اسے ڈانٹ رہی ہوں۔

”ڈنٹیں بی بی! وہ کسی اور کو چاہتی ہے تو یہ اس کا اختیار میں نہیں تھا اور پھر میں نے کب اسے پابند کیا تھا کہ مجھے چاہے کسی اور نہ چاہے، میں اسے چاہتا ہوں مجھے تو بس اس سے غرض ہے۔“ وہ میری ڈانٹ سے بھی نہ ڈرا اور اسی مان سے بولا..... جو اسے اپنے آپ پر تھا۔

”ڈنٹیں بی بی! میں نے شموں کو صرف اتنا کہا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اگر وہ مجھ سے نکاح کر لے تو میں اسے خوش رکھوں گا اسے عزت دوں گا میں نے شموں سے شموں کو مانگا تو ہے زبردستی تو نہیں کی۔“ وہ خود ہی بتاتا جا رہا تھا اور میں حیران و پریشان سی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”میں نے شموں کا سوال اپنے رب کے آگے ڈالا ہے۔ اس تقدیریں لکھنے والے سے التجا کی ہے کہ وہ شموں کو میرے مقدر میں لکھ دے اور مجھے یقین ہے بی بی جی! اگر میرے جذبوں میں کھوٹ نہ ہوا۔ تو مالک میری دعا کو رد نہ کرے گا پھر شموں خود میری طرف کھینچی چلی آئے گی۔

”ڈنٹیں بی بی! وہ اللہ ہی تو ہے ہمارے کل کا مالک..... ہمارے دل ہمارے دماغ‘ ہماری جانیں سب اسی کی امانت ہیں اگر ہم ان میں خیانت نہ کریں تو اللہ بھی ہم سے راضی رہتا ہے اور ہمیں عطا کرتا جاتا ہے تو اڑتا جاتا ہے بس وہ غصے نہ ہو۔

بس وہ کھ نہ موڑے وہ کہتے ہیں نا..... رب راضی تے سب راضی۔ وہ راضی ہو گیا تو میری اور شموں کی کیا مجال ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ یوں ادا کر رہا تھا جیسے کہنے کے ساتھ لکھ رہا ہو اور پھر مجھے سناتا ہو ٹھہرا ہوا واضح اور پراثر مجھ پر جیسے اس کے لہجے نے اک چادر تان دی میرے پسینہ پسینہ وجود کو یکبارگی اک سکون اک ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

”فضل! تمہارے پاس وجہ کا نمبر تو ہوگا۔“ میں نے اپنے مطلب پر آگئی۔

”جی جی ہے۔“ وہ جھپکنے کے باوجود جھوٹ نہ بول سکا۔

”مجھے وجیہ کا نمبر دو فضل۔“ میں نے درخواست کے انداز میں کہا۔

”جی..... وہ مالکوں نے مجھے اجازت نہیں دی۔“ وہ اسی طرح سے بے دھڑک بولا۔

”کیا، کیا مطلب..... وجیہ نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم مجھے بھی اس کا نمبر نہ دو۔“ مجھے

اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا اس لیے میں ذرا غصے سے بولی۔

”جی..... وہ ان کی مرضی..... میری بھلا کیا مجال کہ میں ایسا سوچوں۔“ وہ شرمندہ

ہونے کے باوجود بہانہ نہ بنا رہا تھا بلکہ صاف کہتا جا رہا تھا۔

”لیکن تم پھر بھی مجھے اس کا نمبر دے دو۔ فضل! مجھے وجیہ سے بات کرنی ہے اگر میں

نے اس سے بات نہ کی تو میں مرجاؤں گی۔“ میں اس سے التجا کرنے لگی۔

”مجھے کوئی اور حکم کریں دلشیں بی بی! مگر یہ میرے بس میں نہیں مجھے آزمائش میں نہ

ڈالیں۔“ وہ اپنی مجبوری بتا رہا تھا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں سے مجبور تھی کیا کرتی۔

”فضل! میرے بھائی! میری مدد کرو اللہ کے واسطے مجھے اس کا فون نمبر دے دو۔“ میں

سب کچھ بھول کر باقاعدہ منتیں کرنے لگی۔

”آپ نے مجھے بھائی کہا..... آپ پر میری جان بھی قربان ہے۔“ وہ گلوگیر آواز میں

بولا۔

”تو پھر مجھے وجیہ کا فون نمبر.....“

”بی بی جی! میں جان ہار سکتا ہوں مگر قول نہیں..... لاڈی سائیں نے وعدہ لیا تھا کہ میں

خواہ کچھ بھی ہو ان کا ہتایا نمبر آپ کو نہیں دوں گا مجھے معاف کر دیں بی بی۔“ اب وہ میرے سامنے التجا

کر رہا تھا۔

”اچھا! تم یہ تو بتا دو کہ وہ کیسا ہے؟ کب آئے گا واپس؟“ میں ہار گئی ٹوٹنے لگی۔

”وجیہ ٹھیک نہیں ہے، کک، کون ہے اس کے ساتھ۔“ میں اس کا سوچ کر تڑپ اٹھی۔

”جی ان کے ساتھ سکندر ہے۔“ اس نے ہمارے ڈرائیور کا نام لیا تو سکندر کا ہنستا مسکراتا

چہرہ میری آنکھوں میں ابھرا..... اور میرے جی کو ذرا سی تسلی ہوئی۔

”اچھا ٹھیک ہے فضل..... لیکن تم سوچنا ضرور میرے بارے میں بھی سوچنا..... میں

بھی تمہاری طرح سے وجیہ کو چاہتی ہوں اور اس کے بغیر اب زندگی مجھے زیادہ دیر قبول نہ ہوگی۔“

میں نے بڑے ہی دکھی اور جذباتی لہجے میں کہا۔

”جی اچھا جی..... میں ضرور سوچوں گا پر میں مالکوں کی مرضی کے بغیر..... میں لاڈی سائیں کو آپ کا حال بتا دوں گا اور اگر انہوں نے اجازت دے دی تو پھر.....“ وہ ادھورے جملے پورے منہوم کے ساتھ ادا کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے فضل اپنا اور شموں کا خیال رکھنا۔“ میں نے ڈھیلے ڈھیلے لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ میری بندھی ہوئی امید میں ریخیں آگئی تھیں اور وہ کمزور ہو گئی تھی۔



میرا بخار اب اتر چکا تھا مگر مجھے کمزوری اور تھکن محسوس ہو رہی تھی اس لیے ابھی بستر سے نکلنے کوئی نہ چاہتا تھا میں اسے ہی سستی سے لیٹی ہوئی تھی جب ابا جان میرے کمرے میں آ گئے۔

”نصصہ! بیٹے! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ وہ پیار سے پوچھ رہے تھے۔

”جی اب تو بہتر ہوں۔“ میں نے سیدھی ہو کر دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے کہا۔

”چلو شکر ہے اللہ کا کہ اب تم ٹھیک ہو ورنہ میں اور تمہاری ماما تو ڈر ہی گئے تھے کہ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا گلتا ہے تم نے اپنی نند کی موت کو دل پر لگا لیا ہے۔“ وہ میرے پاس بیٹھ گئے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

”جج..... جی۔“ میں نے نظریں چرا تے ہوئے کہا۔

”یہ باپ بیٹی میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“ ماما بھی وہیں میرے کمرے میں آ گئیں اور مسکراتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”ارے نصصہ! آ جاؤ تم بھی آ جاؤ..... شکر ہے کہ تم نے بھی بستر چھوڑا ورنہ ایک طرف ماں اور دوسری طرف بیٹی بستر پر میں تو بوکھلا ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسنے لگے اور انہیں دیکھ کر ماما بھی۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ دادا جی کیسے ہیں؟ تمہاری تو بات ہوتی رہتی ہے نا؟“ ابا جان نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی..... جی وہ ٹھیک ہے۔“ میں نے ہنسنے لگا۔

”نصصہ!“ ابا جان نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جی ابا جان! میرا دل ڈر رہا تھا کہ وہ اب کچھ اور پوچھیں گے اور یہی ہوا وہ پوچھنے



گئے۔

”اب کیا ہوگا عصمہ؟ تم اس گھر میں تو دوا پس جا نہیں سکتیں جیسے حالات تم نے بتائے ہیں اور داماد جی ملک سے باہر ہیں۔ تو پھر اب تم لوگ.....؟“ وہ ادھوری بات چھوڑ کر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگے اور میں مزید گھبرا گئی انہیں کیسے بتانی کہ ابا جان! اب میں وجیہ کے گھر تو کیا میں تو اس کی زندگی سے بھی نکال دی گئی ہوں۔

”اسے کہو بیٹا کہ وہ تمہیں بھی اپنے پاس بلا لے..... یوں وہ وہاں پر اکیلا رہے اور تم یہاں یہ تو مناسب نہیں۔ میاں بیوی کو دکھ اور پریشانی کے دنوں میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہنا چاہیے۔ اس طرح دکھ کی شدت آدمی ہو کر کم رہ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ مٹ جاتا ہے۔“

ماما مجھے سمجھا رہی تھیں میں تو خود بھی چاہتی تھی کہ میں پریشانی کے دنوں میں وجیہ کے قریب رہوں۔ میں تو ہر وقت ہی وجیہ کے قریب رہنا چاہتی تھی۔

”عصمہ! کیا ہوا بیٹی؟“ ماما میرے چہرے پر لہراتے سیاہ سائے دیکھ کر پریشان تھیں۔

”کچھ نہیں ماما۔ بس میں بھی وجیہ کی وجہ سے ہی پریشان ہوں۔“ میں نے کہا اور سچ ہی کہا تھا۔

”وجیہ کو سمجھاؤ اور زور دو کہ وہ تمہیں جلد از جلد اپنے پاس بلا لے۔“ ابا جان نے اپنی بات دہرائی۔

”زور کیوں دینا عبا صاحب! اگر وہ سہولت میں ہوگا تو خود ہی بلا لے گا وہ بھی جانے کس طرح سے وہاں رہ رہا ہوگا یہ ان زمینداروں کے یہی مسائل دیکھ کر تو جی ڈرتا ہے کہ ان میں زمین جائیداد کے جھگڑے اک دو بے کی جان کے پیری بنا دیتے ہیں بہن بھائیوں کو۔“ ماما نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ اچھا تم بچی کا دل پریشان نہ کرو اسے حوصلہ دو اور بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم کسی وقت وجیہ بیٹے سے بات کر لو اور کہو کہ فکر نہ کرے عصمہ کو ہم خود بھیجے گا انتظام کر دیتے ہیں اگر اس کا آنا ناممکن ہے تو۔“ ابا جان نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں ہی وجیہ سے بات کر لوں گی اس کی بہن کی تعزیت بھی کرنی ہے بلکہ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اسے فون کرتے اور اس کی ماں کو بھیجیں۔“ ماما جان نے الٹا انہیں ہی

کہنا شروع کر دیا۔

”نن! نہیں ماما! آپ لوگ فون نہ کرنا۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”ہاں نہیں ابھی حالات کیسے ہیں؟ ابھی تو وجیہ مجھے بھی صرف SMS ہی کرتے ہیں

بات نہیں کرتے۔“

میں نے ان دونوں کو سمجھایا جس پر وہ چپ کر گئے..... پھر کچھ دیر ہم لوگ اکٹھے بیٹھے رہے اس کے بعد ماما اور بابا جان تو چلے گئے مگر میرے ذہن میں بہت سی باتیں چھوڑ گئے خاص طور پر اباجان کی یہ بات کہ وہ مجھے وجیہ کے پاس بھجوانے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اب مجھے کسی طرح سے وجیہ کا ہاتھ ملنا تھا کہ وہ کہاں ہے اور بس۔

میں سوچتے سوچتے بہت دور نکل گئی اپنے ہی خیالوں میں مست وجیہ کے پاس جیسے وہ مجھے دیکھتا ہے اور تڑپ کے آگے بڑھتا ہے۔

”مجھے معاف کر دینا دلنشین میں مجبور تھا۔ میں نے مجبور ہو کر وہ خط لکھا تھا۔ ورنہ میں تو“ میں تو تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“ وہ مجھے گلے سے لگا کر رو رہا ہے اور میں اس کے آنسو صاف کرتی ہوئی کہتی ہوں۔

”مجھے یقین تھا وجیہ! کہ تم مجھے پیار کرتے ہو اور مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔“

❖ ❖ ❖

میری وہ ساری رات خیالوں اور خوابوں کی پگڈنڈیوں پر بھاگتے بھاگتے گرتے سنبھلتے گزر گئی۔ مجھے نیند نے چھوا تک نہ تھا پھر بھی میں نے کئی خواب دیکھ لیے تھے میرا ہر خیال ہر خواب وجیہ کو پالینے پر ختم ہوا تھا یہاں تک کہ مؤذن نے اللہ کی بزرگی اور برتری کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ ”بی بی جی! میں نے شموں کا سوال اپنے رب کے سامنے ڈال دیا ہے۔“ فضل کی آواز نے میرے اعصاب کو جھٹکا دے کر اٹھا دیا اور میں وضو کرنے چل دی۔

میرا مقصد نماز پڑھ کر اللہ سے یہ دعا مانگنا تھا کہ وہ وجیہ کو مجھے لوٹا دے۔ آج میں اپنے اللہ کے حضور اس لیے جھک رہی تھی کہ اس سے اپنی غرض بیان کروں، فضل اتنے دعوے سے کہتا ہے کہ اللہ چاہے تو سب ممکن ہے۔

”اللہ راضی ہو گیا تو شموں میری طرف کھینچی چلی آئے گی۔“

شموں! جسے میں فضل سے زیادہ جانتی تھی اور اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ صرف اور صرف وجیہ کو چاہتی تھی اتنا چاہتی ہے کہ اس نے اپنا تن من کسی بھی نفع نقصان کا سوچے بغیر وجیہ کو دان کر دیا تھا۔ جس نے وجیہ کو راضی کرنے کے لیے مجھ سے بھی پیار کیا تھا۔

اور جس نے میری خاطر اپنی عزت اپنی جان داؤ پر لگا کر خود کو زندہ درگور کر دیا تھا مگر فضل کو پھر بھی امید تھی بلکہ یقین تھا کہ وہ شموں اک روز اس کی طرف کھینچی چلی آئے گی۔ اگر اللہ راضی ہو گیا تو؟

میں تھکی تھکی سی اٹھی تھی اور وضو کر کے جائے نماز پر آگئی تھی۔

آج میں کوئی پہلی بار نماز نہ پڑھ رہی تھی۔ نہ ہی میں ایسی تھی کہ مجھے اللہ وحدہ لا شریک و لا زوال ذات کی قدرتوں پر کچھ شک تھا۔ (نعوذ باللہ) ایسا سوچنا بھی میرے لیے کفر تھا۔

بلکہ مجھے لگ رہا تھا کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے تبھی وجیہ بھی مجھ سے دور ہو گیا تھا لہذا میں اللہ کو راضی کر لوں تو وہ مجھے پھر سے مل جائے گا۔ ایک طرح سے میں وجیہ کو ماکٹنے کے لیے اس کے در پر جھکی تھی۔

بس پھر تو میں نے اپنا جبین سکھ اور غیندیں سب حرام کر دیں..... میں نے گداز بستر اور گرم لحاف سے نانا توڑ کے چٹائی سے رشتہ جوڑ لیا تھا پانچوں نمازیں میں اذان ہوتے ہی پڑھتی اور پھر تسبیحات اور وظائف شروع کر دیتی میں ماما سے یہی پوچھتی رہتی کہ اللہ کو منانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ ماما نے مسکرا کر جواب دیا۔

”انسان اپنے رب کو خفا کرنے کے سارے کام چھوڑ دے وہ خود بہ خود راضی ہو جائے

گا۔“

”اور ماما یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ بندہ آخر کیا کرے..... کہ وہ اس کی دعائیں سننے لگے۔“ آج میں خود کو بہت اداس محسوس کر رہی تھی اس لیے عشاء کی نماز کے بعد آکر ماما جان کے ساتھ لیٹ گئی۔

”دیکھو عصمہ! اگر تم اپنے اللہ سے محبت کرتی ہو تو اسے اندر محسوس کرنے کی کوشش

کرو..... وہ تمہارے اس قدر قریب ہے..... جیسے یہ پھڑکتی ہوئی رگ کا بھرنا اور دینا۔“

ماما نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن کی دائیں جانب وہاں پر رکھ دیا جہاں ایک قدرے پھولی ہوئی رگ پھڑک رہی تھی بالکل اسی طرح سے جس طرح میرے سینے میں دھک دھک کرتا

دل یقیناً یہ شہ رگ تھی جس کے بارے میں میں نے سنا ضرور تھا مگر اسے محسوس آج کیا تھا میری انگلیاں جس کے پور اس رگ کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہے تھے وہ ایک ہی لمحے میں سنسناتا ٹھٹھے اور میں نے اپنا ہاتھ ماما کی گردن سے کھینچ لیا۔

”ماما! مجھے نیند آ رہی ہے۔“ پھر میں ان کے پاس زیادہ دیر لیٹ نہ سکی بھانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ رات بھی عجیب تھی میری انگلیاں بے ساختہ انگلیوں اور جا کر میری گردن پر ٹھیک اسی جگہ تک جاتیں جہاں ماما نے اپنی گردن پر رکھی تھیں مجھے لگتا میری انگلیوں کی پوریں اس ٹھیک ٹھیک کرتی رگ کو چھو کر جیسے چارج ہو رہی ہوں اور میری دھڑکنیں ان پوروں پر آ کر دھڑکنے لگتیں اور ان کے ڈوبنے ابھرنے کے ساتھ ساتھ میں جینے اور مرنے کی کیفیت سے دوچار ہونے لگتی۔

تمام رات میرے ساتھ یہی کھیل جاری رہا میں نیچے پر سر رکھتی تو اس رگ کی ٹھیک ٹھیک میرے کانوں میں آ جاتی اٹھ کر بیٹھتی تو میرے پاؤں کے ٹکڑوں میں گد گدی ہونے لگتی اور بستر چھوڑ کر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگتی۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا میرے قدموں کے ساتھ ایک اور چاپ بھی ہے..... میں قدم اٹھاتی تو وہ اٹھاتی اور میں زمین پر پاؤں رکھتی تو وہ چاپ زمین پر پڑتی۔ میں اتنا گہرائی کہ خوفزدہ ہو کر کا پھنے لگی۔ مجھے اپنے ساتھ کسی اور کی موجودگی کا احساس صاف طور پر تھا اور سردی کے باوجود میرے پسینے ٹھوٹ رہے تھے میں ہولے ہولے ہاتھ روم گئی اور وضو کرنے لگی۔

”سنو! یہ تم کیا کرتی ہو؟“ وہ نادیدہ وجود سرگوشیاں کرنے لگا۔

”تمہیں ڈر لگتا ہے تو تم نماز کی طرف دوڑتی ہو۔ تمہیں کوئی یاد آتا ہے تو تم سجدے میں گرتی ہو۔ تم نے اپنی حاجت منوائی ہو تو ہاتھ دعا کے لیے اٹھاتی ہو۔ کیسی خود غرض اور عام سی ہو تم اور سوال کرتی ہو کہ رب کو کیسے پایا اور منایا جاتا ہے۔“ کسی نے میرا مذاق اڑایا..... میں سر سے پاؤں تک ہیک گئی۔ مگر یہ پسینے بھی خوف کی بدولت تھے عدم امت کے احساس کے نہ تھے میں تقریباً بھاگتی ہوئی آئی اور میں نے جائے نماز پر کھڑے ہو کر نفل نماز کی نیت ہاندھ لی۔



اس وقت میں کچن میں تھی آج میں نے سوچا تھا کہ کھانا میں بناؤں گی کیا کرتی فراغت

میں تو وقت اور بھی چوڑی کی چال چلتا تھا میں اور نورام ماماکی دوسرے کی مدد کر رہی تھیں آج میں نے کھانے کا میو اپنی مرضی کا بنایا تھا۔

دال چاول کے ساتھ 'بج کباب اور بیٹھے میں رس ملائی۔ یہ مینو وجیہ کے پسندیدہ کھانوں میں سے ایک تھا۔ وہ اگر گھر پر کھانا کھاتا تو ایک وقت دال چاول کے ساتھ کوئی سی ڈش خشک گوشت میں لیتا تھا کباب اسے ہر طرح کے پسند تھے یا پھر وہ بیف ہنٹر بہت شوق سے کھاتا تھا جو شموں ہر وقت ہی تیار رکھا کرتی تھی۔

”شموں۔“ مجھے شموں یاد آنے لگی جانے وہ کیسی ہوگی؟ اور اس نے فضل کو کیا جواب دیا ہوگا میں سوچنے لگی۔

”ارے بیٹا! دھیان کر دو پیاز جل رہے ہیں۔“ نورام ماما نے میرے قریب آ کر زور سے کہا اور چولہا بند کر دیا۔

”آں ہاں ہاں۔“ میں نے دیکھا واقعی پیاز تو براؤن سے سیاہ ہو رہے تھے۔

”لاؤ ہم دوسری پیاز کاٹ دیں بلکہ آپ ہٹو ہم ہی تڑکا لگائے دیتے ہیں دال کو۔“ نورام ماما نے مجھے نرمی سے ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں ماما! آپ ہی لگا دیں تڑکا۔ میں سلا دیتا ہوں۔“ میں نے بھی وہاں سے ہٹتے ہوئے کہا اور ایک طرف بیٹھ کر سلا دکانٹے لگی۔ پیاز بہت کڑوی تھی چند ہی لمحوں میں میری آنکھیں جلنے لگیں اور میں سی سی کرنے لگی۔

”اے لواب آنکھیں لال کیے دے رہی ہو۔“ نورام ماما تڑکا لگا کر پائیں تو ہنسنے لگیں۔

”یہ بھی آپ کے بس کا روگ نہیں لاؤ ادھر کرو۔“ انہوں نے چھری میرے ہاتھ سے لے لی اور آرام سے پیاز کاٹنے لگیں ہتا نہیں ان کی آنکھوں سے پانی کیوں نہ نکلتا تھا میں انہیں حیرانی سے دیکھنے لگی۔

”عصمہ بی بی! باہر وہ آیا ہے وہ؟“ اتنے میں چوکیدار چاچا نے کچن میں جھانکتے ہوئے

بتایا۔

”کون آیا ہے؟“ میں نے اپنے لرز جانے والے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”جی وہی جو آپ کو لے کر آیا تھا اور بعد میں بھی ایک روز آیا تھا آپ کا انچی لے کر۔“ چاچا نے مجھے یاد کرنا چاہا اسے فضل کا نام یاد نہ آ رہا تھا۔

”فضل۔“ میں نے کہا اور تیزی سے باہر بھاگی۔ ”فضل آیا ہے تو ضرور وجیہ کا کوئی پیغام لایا ہوگا وجیہ کا پیغام۔“ میں دیوانی ہو رہی تھی اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ گیٹ پر کھڑی تھی جہاں فضل اندر کی طرف کھڑا تھا۔

”السلام علیکم۔“ مجھے دیکھتے ہی اس نے نظریں جھکا کر سلام کیا۔  
 ”وعلیکم السلام! فضل کیسے ہو تم؟“ میں نے اپنی بے ترتیب سانسیں درست کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”جی دلنشین بی بی! اللہ کا بڑا کرم ہے۔“ وہ ذرا سا مسکرایا۔  
 ”اچھا آ جاؤ..... اندر ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔ کوئی چائے پانی۔“ میں نے اسے رسماً پوچھا وہ بے چارہ ہر بار یہیں سے پلٹ جاتا تھا۔

”پھر کبھی سہی ابھی تو جلدی میں ہوں میں تو آپ کو لاڈی سائیں کا نمبر دینے آیا تھا۔“  
 وہ مسکراتا ہوا مجھ پر ایک نظر ڈال کر مجھے خوشخبری دے رہا تھا۔  
 ”وجیہ کا فون نمبر۔“ خوشی سے میرا برا حال ہو گیا اور مجھ سے پھر ایک لمحہ بھی صبر کرنا ناگزیر ہو گیا۔

”جی میں نے ان کو آپ کا حال سنا کر درخواست کی کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنی بہن کی اتنی معمولی سی خواہش پوری کر دوں۔“ وہ بڑے ہی احترام سے مجھے بہن کہہ رہا تھا۔  
 ”فضل بھائی..... میں آپ کا یہ احسان کس طرح اتاروں گی۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ کاغذ کا ککڑا پکڑتے ہوئے کہا جس پر وجیہ کا موبائل نمبر درج تھا۔

”بہنیں تو بھائیوں کو فرمائش کرتی ہیں ترے لے تھوڑی ڈالتی ہیں جیسے آپ نے اس روز ڈالے تھے سچ میرا جی بہت زخمی ہوا تھا کہ آپ کو میرے سامنے یوں.....“ وہ تھوڑی سی ناراضی سے بولا اور تھوڑے سے مان سے مجھے اس وقت وہ سادہ سا آدمی اپنا ماں جابا ہی لگا۔

”اور بھائی کیا اپنی بہنوں پر احسان کر سکتے ہیں ان کا تو فرض ہوتا ہے بہنوں کو سکھ دینا۔“ اب آپ تنہا نہیں ہو اس زمین پر مالک نے ایک بھائی کی نعت آپ کو دے دی ہے اور مجھ کی کمین کم نصیب کو رب نے اپنی رحمت سے نوازا ہے جو آپ جیسی بہن مجھے مل گئی۔“ وہ جذباتوں سے اٹا کھڑا تھا یہ اس کے کانپتے ہوئے لہجے اور بھیگی ہوئی آواز سے صاف ہٹا لگ رہا تھا۔

”آپ لاڈی سائیں سے بات کر لیں..... میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔“ وہ مجھے شش و پنج

میں دیکھ کر پلٹتے ہوئے بولا۔

”بھائی..... نہیں نہیں بلکہ فضل بھاجی پھر کب آؤ گے؟“ میں نے اسی کی زبان اور لہجے میں کہا تو وہ خوش ہو کر نرس پڑا اور میرے سر پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

”جب بھی آپ یاد کرو گی۔“

”آپ جناب نہیں تم بلکہ تو کہو بھاجی!“ میں نے اس کا ہاتھ عقیدت و احترام سے تھام

لیا۔

”کیا اپنے بھاجی کو آج ہی مار دو گی اتنا پیار دے کے۔“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ

سے چھڑایا اور تیزی سے مجھے ”رب راکھا“ کہتے ہوئے گیٹ سے نکل گیا۔

”اللہ کی امان میں..... میرے بھائی۔“ میں نے اس کی پشت پر اسے دعائیں دیں اور

اپنی نم آنکھیں صاف کرتی ہوئی واپس اپنے کمرے کی طرف بھاگی اب میری آنکھیں فضل کی محبت

پاکر بھیگ نکلیں تھیں یا وجیہ کے فون نمبر ملنے کی خوشی میں..... یہ سوچنے کی مجھے اس وقت ضرورت بھی

نہ تھی اور نہ ہی میرے پاس اب وقت تھا..... مجھے تو وجیہ کو فون کرنا تھا۔



”وجیہ کا موبائل نمبر میرے وجیہ کا۔“ میں اپنی دیوانگی میں اک بچی کی طرح خوش ہو

رہی تھی جسے عین اس وقت چاکلیٹ کا ایک بڑا ڈٹا مل گیا ہو جب اس نے محض سوچا ہی ہو کہ وہ

چاکلیٹ کھائے۔ میں نے بھی تو وجیہ کے فون نمبر کے مل جانے کے لیے چند ہی دعائیں مانگی تھیں۔

چند آنسو ہی تو بہائے تھے اس کے حضور۔

اور چند ہی نوافل تو ادا کیے تھے۔

اور اس نے میری سن لی، میری دعا قبول ہو گئی تھی وہ میری حالت کو جان رہا تھا، وہ

میرے گریے دیکھ رہا تھا اور وہ میری التجا سن رہا تھا کتنا اچھا تھا میرا اللہ کتنا مہربان میں نے اس کا غد

کے کلوے کو ہونٹوں سے لگایا پھر آنکھوں سے اور پھر اپنے سینے سے۔

”وجیہ! میرے وجیہ۔“ میرے اندر باہر شور مچ گیا..... میں نے اپنا موبائل اٹھایا اور

اس نمبر کو فید کرنے لگی جو مجھے فضل بھاجی نے دیا تھا بھی میری انگلیوں کے پور جل اٹھے اور میرے

لبہوں میں شعلے سے لپکنے لگے کسی کے نادیدہ لب میرے کانوں کے قریب آ گئے۔

”پہلے اپنے اس مہربان دوست کا شکریہ تو ادا کرو جس کی مہربانی سے یہ نمبر تمہیں ملا ہے۔“ ایک سرگوشی میری سماعتوں سے میرے دل کے محن میں اتری اور وہاں کھلے ہوئے خواہشوں کے رنگ برنگے پھول جیسے پل بھر کے لیے جھلس سے گئے۔

”پہلے وجیہ کون تو کر لوں۔ کتنے دنوں سے میرے کانوں نے اس کی آواز نہیں سنی۔“ میں نے اس سرگوشی کا جواب دیا۔

”اچھا دیکھ لو تمہاری مرضی ہے یہ نمبر تو اب تم نے فیڈ کر ہی لیا ہے یہ تو محفوظ ہو گیا۔ اچھا کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ وجیہ تم سے کوئی امید افزا بات کرے۔“ وہ سرگوشی مسلسل میرے کان میں ہو رہی تھی۔

”امید افزا بات.....؟“

میں نے اپنے محن دل میں سر نہ ہواڑے کھڑے ان پھولوں کو دیکھ کر سوچا۔  
 ”ہاں ہاں وجیہ کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ وہ یہی تو بتائے گا کہ وہ بھی میرے بغیر بے گل ہے اور تڑپ رہا ہے۔“ وہ پھول ذرا سی تر چھی لگا ہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے سیدھے ہونے لگے۔  
 ”ضروری تو نہیں وہ اس کے برعکس بھی تو کہہ سکتا ہے۔“ کوئی میری گردن پر ہاتھ رکھ کر بولا تو وہ پھولی ہوئی رگ لہو بھر کو دب گئی اور میرا دم گھٹنے لگا۔

”اللہ نہ کرے ایسا ہو اللہ نہ کرے۔“ میں نے ایک جبر جبری سی لی اور اپنا موبائل سیٹ ایک طرف رکھ کر دو فل شکرانے کے ادا کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

✱ ✱ ✱

”و.....ج.....ی.....ی.....ہ۔“

”وجیہ.....“ میرے لبوں سے صرف سسکیاں نکل رہی تھیں جنہیں وہ دوسری جانب یقیناً سن رہا تھا اسی لیے تو تڑپ کے بولا تھا۔

”عصمہ! دیکھو ایسا مت کرو۔ چپ کرو پلیز چپ کرو۔“

”وجیہ! تم نے ایسا کیوں لکھا..... کہہ دو کہ تم نے دل سے نہیں کہا۔ تم مجبور تھے۔“ میں اس سے پوچھنے کے بجائے اسے ایسا ہی کہنے پر اکسار رہی تھی۔

”عصمہ! سنو! سمجھو ہمیں زندگی میں بہت سی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بھلے ہم



میں انہیں برداشت کرنے کی قوت ہو یا نہ ہو۔“ اس کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہوا تھا میں سمجھ سکتی تھی کہ وہ خود اس وقت کس کرب سے گزر رہا ہے۔

”وجیہ! مجھے کچھ بھی اور نہیں سننا ہے نہ ہی برداشت کرنا ہے مجھے صرف اور صرف تمہارے ساتھ رہنا ہے میں! میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی مر جاؤں گی یقین کرو وجیہ میں مر جاؤں گی۔“ میں جو کہہ رہی تھی وہ پورے صبح کے ساتھ کہہ رہی تھی میرے لیے وجیہ کے بغیر جینا ممکن تھا ہی نہیں۔

”عصمہ!“

”لنشین کہو وجیہ۔“ مجھے اس کا عصمہ کہنا اچھا نہ لگ رہا تھا..... میں نے اسے ٹوک دیا۔  
”عصمہ! میں نے جو کیا وہ میرے لیے ایک قیامت سے گزرنے کے مترادف ہی تھا مگر اب تو وہ قیامت برپا ہو چکی ہے ہماری محبت کی دنیا اب اس زمین پر دوبارہ آباد نہیں ہو سکتی۔ تم سمجھو! اس بات کو تسلیم کرو۔ اللہ کے واسطے۔“ وہ مجھے اس طرح سے بہلا رہا تھا جیسے کسی بچے کو سمجھاتے ہیں جو کسی خطرناک چیز کو چھونے کی ضد کر رہا ہو۔

”وجیہ! ایک بار پھر کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ میں اس کی نصیحتوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنے دل کے کہے پر قائم تھی۔

”ہاں مجھے تم سے محبت ہے مجھے تم سے محبت تھی مگر وہ محبت اب کوئی وصل نہیں پاسکتی۔ وہ قربتیں اب ہمارا مقدر نہیں رہیں..... اس حقیقت کو ہمیں بہر حال ماننا ہوگا۔“

”وجیہ! ابھی زندگی باقی ہے..... ہم زندہ ہیں تو بھلا ہمارا ماننا ممکن کیونکر ہو سکتا ہے؟“  
انہی میں اسے سمجھانے لگی۔

”یہ بات اتنا آسان نہیں رہا عصمہ۔“

”تو مشکل کہو یا ممکن تو نہ کہو۔“

”میں اک قیامت کے بعد دوسری قیامت کا متحمل نہیں ہو سکتا عصمہ! مجھے مت آزماؤ۔“ وہ خود اک کھٹکس کا شکار تھا۔

”دیکھو! وجیہ تم سوچو تو سہی..... ہم پھر مل سکتے ہیں۔“ میں نے اسے نرم پڑتے دیکھ کر دوبارہ چوٹ ماری۔

”تم صرف اک بار کہہ دو کہ تم بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے..... باقی تم تک آنے کا راستہ

میں خود تلاش کر لوں گی۔“ میں نے اس کا سراا سے تھمتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں تو تمہیں طلاق.....“

”مت کہو اللہ کے واسطے مت کہو..... بھول جاؤ بھلا دو۔“ میں نے تڑپ کر اس کی

زبان کی ٹوک تھام لی۔

”وجیہ! میں نے ابھی کسی کو یہ نہیں بتایا۔ یہ قیامت صرف میرے اور تمہارے اوپر بنتی

ہے۔“ میں اسے بتا رہی تھی۔

”مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہم اسے چھپائیں یا ظاہر کریں۔ اب جو میں نے کہہ دیا

جو لکھ دیا وہ تو ثابت ہے حق ہے اور میں اس سے کس طرح پھر جاؤں؟“ اسے کوئی چارہ نظر نہ آ رہا تھا

وہ بے حد پریشان تھا۔

”اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں دوبارہ سے مل جاؤں تو تم.....“

”کاش.....! کاش ایسا ہو سکتا..... مگر اب یہ ممکن نہیں عصمہ؟“ وہ رورہا تھا۔

”کاش! میں اس وقت سوچ لیتا..... مگر میں کیا کرتا میرے پاس بھی تو سوائے اس

کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی بات رکھی تھی یا تو میں تمہاری جان لے لوں

یا پھر تمہیں طلاق دے دوں تو پھر میں کیا کرتا..... کیا کرتا؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میری

جان پرین گئی۔

”وجیہ تم نے مجھے مجبوری میں طلاق دی ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ یہ واقع نہیں ہوئی

ہوگی، ہمیں کسی عالم دین سے مشورہ کرنا چاہیے۔“ میں نے اسے صلاح دی۔

”عالم دین سے مشورہ.....“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ ”ہاں..... ہاں عالم دین سے

مشورہ..... مجھے امید ہے ہمارے لیے کوئی نا کوئی تنجاش کی راہ ضرور کھلی ہوگی۔“

اب میں اسے امید دلارہی تھی، جس پر وہ بھی کچھ سنج گیا۔

”اچھا میں بھی کسی سے پوچھتا ہوں تم بھی پتا کرو۔“ وہ راضی ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا

کہ میرا بھروسہ میرا یقین پکا تھا میری محبت سچی تھی کہ اگر میں اس قدر بے چین تھی تو اسے بھی قرار

کہاں نصیب تھا۔

اگر میں اس پر مرتی تھی تو اس کی بھی تو جان مجھ میں انگی ہوئی تھی۔

”وجیہ!“

”ہاں دلنشین...“

”تم نے مجھے دلنشین کہا وجیہ۔“ میں اس کے لبوں سے دوبارہ وہ نام سن کر خوشی سے پاگل ہو گئی جو اس نے مجھے سہاگ رات کے تحفے میں دیا تھا۔  
 ”آئی لو یو۔“ میں اس کی محبت کی شدت میں شراپور ہو گئی۔  
 ”I Love you too۔“ میرے وجیہ کا لہجہ مجھے دوبارہ سنائی دیا اور میرے قدم زمین سے اٹھنے لگے۔

”اپنا خیال رکھنا وجیہ۔“

”تم بھی دلنشین۔“ وہ میری فکر میں ٹھیک ویسا ہی بے تاب تھا جیسی اس کی عادت تھی۔  
 ”اب موبائل بند مت کر دینا۔“ میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔  
 ”ہرگز نہیں۔“ اس کی آواز کا بھاری پن بھی شوخی میں بدل گیا۔  
 ”شب بخیر۔“

”شب بخیر۔“ ہم دونوں نے فون بند کر دیے۔

❖ ❖ ❖

میں دوبارہ سے خوش تھی میری دعائیں واقعی قبول ہونے لگی تھیں مجھے تو اب اپنے اللہ پر اور بھی پیار آنے لگا تھا کیسے وہ مجھ پر اپنی عنایتیں کرتا جا رہا تھا یعنی میں نے اللہ کو منانے کا گر پالیا تھا اور اللہ کو پانے اور منانے رکھنے کا گرویسے بھی کون سا مشکل تھا۔

اللہ کو ایک مانو حضرت محمد ﷺ کو اپنا آخری نبی اور رسول مان کر دل و جان سے اس پر

ایمان لاؤ۔

نماز پڑھو روزے رکھو زکوٰۃ دو اور اگر اللہ توفیق دے تو اس کے گھر کا طواف یعنی حج

کرو۔

یہی تو تھا دین اسلام بالکل سادہ اور آسان اور ان سب کے ساتھ ایک چیز جو بے حد لازم تھی وہ تھی اللہ کے بندوں سے بے غرض محبت یعنی حقوق العباد، میں نے یہ سارے کام باقاعدگی سے کرنے شروع کر دیے تھے۔

میں ہر وقت اللہ کو یاد کرتی تھی میری زبان پر کوئی نہ کوئی دعا یا سورۃ پڑھتی تھی میں نے درود

پاک بھی کثرت سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے ایک عہد کر لیا تھا کہ اب نماز قضا نہیں کرنی خواہ کچھ بھی ہو بلکہ فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ میں تو نوافل کا اہتمام بھی کرنے لگی تھی۔

روزہ تو میں نے کبھی بچپن میں بھی نہیں چھوڑا تھا اور حج کی نیت میری پکی تھی کہ میں اور وجیہ تجدید نکاح کرتے ہی حج کرنے جائیں گے زکوٰۃ اور اللہ کی راہ پر مال خرچ کرنے کی عادت کو جیسا میں نے اپنے والدین میں پایا تھا اس سے بڑھ کر وجیہ کو دیکھا تھا دوسروں کی مدد کرنا کسی کا دل نہ دکھانا خیال رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ارے میں تو پکی اور پکی مسلمان تھی اور اب تو اور بھی صفات مجھ میں آتی جا رہی تھیں میں اپنا ایک مکمل جائزہ لے کر ہٹی تو بے حد مطمئن اور خوش تھی وجیہ کا حصول مجھے اب ہرگز بھی مشکل دکھائی نہ دے رہا تھا۔

❖ ❖ ❖

”ماما! مجھے آج شموں سے ملنے جانا ہے چلی جاؤں۔“ میں تیار ہر کر آئی تو ماما سے پوچھنے لگی۔

”شموں سے۔“ ماما کچھ پریشان ہو گئیں۔

”ماما! وہ یہیں شہر میں ہے اور بہت پیار ہے۔“ میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کو وضاحت کی۔

”پیار ہے اچھا! اچھا چلی جاؤ مگر جاؤ گی کیسے؟“ وہ ایک پریشانی سے نکل کر دوسری میں پڑ گئیں۔

”ماما جی! افضل بھائی مجھے لے جائیں گے آکر۔ آپ فکر نہ کریں اور وہی چھوڑ جائیں گے۔“ میں نے ماما کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں اور پیار سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے مگر جانے سے پہلے پھر بھی وجیہ کو فون کر کے بتا دینا اور جلدی واپس آ جانا؟“ وہ نصیحت کرنے لگیں۔

”جی اچھا آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

کچھ ہی دیر کے بعد فضل مجھے لینے آ گیا تھا میں نے اسے فون جو کر دیا تھا۔

”السلام علیکم کسی ہے میری بہن؟“ اس نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے

ہوئے پوچھا۔

”بھاجی! میں اللہ کے کرم سے بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔  
 ”لگتا ہے لاڈلی سائیں سے بات ہو گئی ہے تھی تو میری بہن کے چہرے پر اطمینان کی  
 مسکراہٹ دکھائی دے رہی ہے۔“ وہ میرے چہرے کو ایسی محبت سے دیکھ رہا تھا جس میں احترام  
 اور عزت تھی میں نے سردقار میں ہلا کر اسے بتایا کہ ہاں وجیہ سے میری بات ہو گئی ہے۔  
 ”اچھا میں ماں جی کو سلام کر لوں؟“ وہ مجھ سے درخواست کر رہا تھا۔

”ارے بھاجی! ضرور آئیے نا۔“ میں نے انہیں لے کر اندر کی طرف بڑھ گئی جہاں ماما  
 موجود تھیں وہ بھی فضل سے مل کر بہت خوش ہوئیں ایک تو میں نے فضل کا ذکر ان سے اتنا زیادہ اور  
 اچھا کیا ہوا تھا دوسرا وہ اسے ملنے ہی پہچان بھی گئی تھیں میں اس بات پر اکثر حیران ہوتی تھی کہ ماما  
 کسی کو بھی ملنے والے کا چہرہ دیکھ کر کیسے کہہ دیتی تھیں۔

یہ نیک اور مخلص ہوگا اور یہ اچھا ثابت نہیں ہوگا۔ خواہ وہ کسی سے پہلی بار ہی مل رہی  
 ہوتیں جیسے انہوں نے وجیہ سے ملنے کے بعد کہہ دیا تھا کہ

”عصمہ! اس شخص کے اطوار بتاتے ہیں کہ یہ قتلون مزاج نہیں..... تم اس کا خیال  
 اپنے دل سے نکال دو۔ ورنہ ایک دن روؤ گی بیٹھ کر۔“ مجھے ان کے دیے ہوئے یہ تاثرات اس روز  
 بھی بہت برے لگے تھے اور آج اچانک اور نادانستہ طور پر یاد آ جانے پر پھر میرا دل دکھی ہو گیا تھا۔  
 ”ضروری تو نہیں ماما کا ہر اندازہ درست ہو جیسا کہ وجیہ کے بارے میں غلط تھا۔“ میں  
 نے ایک زعم سے ہونہہ کیا۔

”عصمہ! جلدی واپس آ جانا۔“ انہوں نے پھر مجھے یاد کرانے کو دہرایا۔  
 ”جی ماما۔“ میں نے پھر اسی سعادت مندی سے کہا اور فضل کے ساتھ جا کر گاڑی میں  
 بیٹھ گئی۔

”فضل بھاجی! کیا آپ کسی عالم دین کو جانتے ہیں؟“ میں نے تھوڑی دور تک تو فضل  
 سے شموں کا حال چال پوچھا پھر اصل بات کی طرف آ گئی۔

”عالم دین۔“ فضل نے زیر لب دہرایا اور پھر ایک معنی خیز نظر مجھ پر ڈالی۔

”مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے۔“ میں نے فوراً نظریں چرا کر کہا۔

”سب سے پہلی شوریٰ تو خود ہمارے باطن میں موجود ہوتی ہے اور ہمیں کم از کم صحیح اور

غلامت کا تعین ضرور کروا سکتی ہے۔ بہتر ہے انسان پہلے اپنے آپ سے مشورہ کر لے اگر دل میں کچھ کھٹک ہو تو سمجھو وہ راہ کھوٹی ہے جس پر وہ جانا چاہتا ہے اگر اندر سکون اور روشنی ہو تو آگے بڑھ کر باہر والوں سے مشورے اور فتوے ضرور لے..... علم حاصل کرے راہنمائی لے۔“ فضل اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھانے لگا۔

”میرے اندر کوئی کھٹک نہیں ہے فضل بھابی۔“ میں نے بغیر اپنے اندر جھانکے جھٹ سے کہہ دیا۔ جس پر فضل نے گاڑی کو ایک دم سے فل بریک لگا دی۔ گاڑی کے نائز چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

اب فضل میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں جانے کیوں پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔

”اگر میری بہن برا نہ منائے تو ہم کچھ دیر کے لیے گھر چلیں..... میرے غریب خانے پر تم بس ایک کپ چائے کا پی لیتا اور میں اتنے میں اس عالم دین کا پتا کر لوں گا جسے میرا ایک دوست بہت اچھی طرح سے جانتا ہے۔ بلکہ اس کی تو اچھی خاصی دعا سلام ہے اس سے۔“ فضل نے بڑی زنی سے کہا۔ اس کے لہجے میں کہیں کوئی خفگی یا کسی اور بات کے جاننے کے تاثرات نہ تھے۔

”ٹھیک ہے فضل بھابی۔“ میں نے ڈھیلے سے انداز میں کہا اور فضل نے گاڑی کو دوبارہ اسٹارٹ کر کے موڑ لیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ہم ایک قدرے غیر آباد علاقے میں تھے جہاں فاصلے فاصلے پر کچے کچے گھر تھے تھوڑا آگے جا کر فضل نے ایک دروازے پر گاڑی روک دی۔

”تمہارے بھائی کا غریب خانہ آگیا ہے۔“ فضل نے دوسری طرف سے آکر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا میں ذرا جھجکتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آئی، ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ شموں ہی تھی جسے دیکھ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

”دلنیش بی بی!“ وہ گرم جوشی سے میری طرف بڑھی اور مجھے اپنے ساتھ لگا کر سمجھ لیا۔ اس کے وجود میں سوائے نوکیلی ہڈیوں کے واقعی کچھ نہ تھا۔ اس کے نرم و گداز جسم کی ساری بہاریں خزاں ہو چکی تھیں۔

”شموں! یہ تم ہو؟“ میں نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا اس کی ستارہ سی آنکھوں کی چمک اب کوند کوند کر پڑتی تھی، بلکہ دوسیا گہرے گڑھوں کے بیچ ہلکی سفیدی تھی جو ٹھٹھا کر اپنے ہونے کا پتا دیتی تھی۔

”میں ہی ہوں دلنیش بی بی!“ اس نے مسکرا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”ماشاء اللہ سے آپ تو اور بھی پیاری ہو رہی ہیں۔“ وہ میری طرف پیار سے دیکھتی ہوئی میری تعریف کر رہی تھی۔

”کیا واقعی؟“ مجھے اس کی تعریف پر یقین نہ آیا۔ میں تو خود جس قیامت سے گزر رہی تھی وہ شموں پر ٹوٹنے والے عذاب سے کہیں سخت تھی۔ مجھے تو خود رونے سے فرصت نہیں تھی۔ نہ میں کھاتی، نہ خوش ہوتی تھی، پھر بھی شموں کہہ رہی تھی کہ میں پہلے بھی زیادہ پیاری ہو رہی ہوں، وہ یقیناً اپنی محبت میں کہہ رہی ہوگی۔

”کیا ہوا لٹنیش بی بی؟“ اس نے مجھے کرسی پر بٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔  
 ”کک ..... کچھ نہیں شموں۔“ میں نے نظریں پھیر لیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ اگر چند بل بھی میری آنکھوں میں دیکھ لے گی تو میرے اندر کے سارے راز جان لے گی۔  
 ”آہ ..... ہا ..... یہ محبت بھی تابندے کو ادھر موا کر کے رکھ دیتی ہے ..... زندوں میں رہنے دیتی ہے نہ مردوں میں۔“ اس نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

”لاڈی سائیں کیسے ہیں بی بی سین؟“ آپ کی تو روزفون پر بات ہوتی ہوگی۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا۔“ اسے فوراً ہی وجہ کی لکڑی آن گھیرا۔  
 ”آں ..... ہاں ..... ہاں وہ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک، روز بات ہوتی ہے ہماری۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”روز بات ہوتی ہے ان کی آواز ان کی باتیں ان کی ہنسی، آپ تو روز سختی ہوں گی۔“ وہ ایک دیوانی کی طرح مجھے ٹکلی بانٹ کر دیکھ رہی تھی۔

آج وہ وجہ کے بارے میں جس انداز سے بات کر رہی تھی پہلے تو کبھی وہ ایسی بے باک ایسی جرأت مند نہ ہوتی تھی۔ مجھے آج بھی کچھ اچھا نہ لگا۔ میرے اندر اک جلن ہو رہی تھی۔  
 ”پانی ..... پانی دینا شموں .....“ میرے حلق میں جھج جھج کانٹے چبے لگے تھے۔

”شموں! شموں! یہ لے ٹھنڈی بوتل، گلاس میں ڈال، جلدی کر۔“ فضل نے اندر آتے ہوئے کوک کی بوتل شموں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ شموں وہ بوتل گلاس میں ڈال کر لائی اور میں نے بلا تکلف اسے غٹ غٹ پی لیا۔

”فضل بھائی! چلیں۔“ وہ وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی حالانکہ ابھی تو آئی تھی۔  
 ”جی بس دس منٹ ٹھہر جاؤ، میرا دوست آرہا ہے، وہ ہمارے ساتھ چلے گا نا۔“ فضل نے

مجھے سمجھایا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں ناچار دوبارہ بیٹھ گئی۔

”اچھا تو شموں اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے اپنا وقت گزارنے اور اس کا دھیان بنانے کو پوچھا، وہ جو مجھے ہی دیکھے چلی جا رہی تھی اور مجھے اس کی آنکھیں اپنے لبو میں سرکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اس کے وجود کی ہڈیوں کی طرح شاید اس کی آنکھوں کے بھی کونے نکل آئے تھے وہ میرے اندر چسید کر رہی تھیں۔

”میرے ارادے پر بھلا میرا کیا اختیار..... کسی کا بھی نہیں ہوتا، ہم اپنے بس میں خود نہیں ہوتے، ہاں ہم پر کسی کا بس ہو جاتا ہے، ہم ضرور کسی نا کسی کے اختیار میں چلے جاتے ہیں اک دن۔“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

”میرا مطلب ہے کہ تم شادی کر لو دیکھو! فضل بھاجی بہت اچھے انسان ہیں، تمہیں بہت خوش رکھیں گے، تم ان سے شادی کر لو۔“ میں نے ایک دم سے کہہ دیا، یونہی بے ساختہ ہی۔

”شادی کر لوں، فضل سے کیوں؟“ اس نے الٹا مجھ سے ہی پوچھ لیا۔ ایک ایسا کیوں اس نے میری طرف لوٹا دیا جس کا جواب میرے پاس فی الحال تو یہ ہی تھا کہ۔

”فضل ایک اچھا انسان ہے، یہ اچھا شوہر ثابت ہوگا۔“ میں نے پھر وہی بات دوسرے انداز میں کہی۔

”فضل کو مجھ سے محبت ہے، وہ یقیناً میرا اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ مگر میں اپنا کیا کروں..... مجھے فضل سے صرف ہمدردی ہے، میں اچھی بیوی کیسے بن سکتی ہوں۔“ اس نے پھر اسی جرات سے سچ بولا، میں دیکھ رہی تھی شموں میں جرات اور ہمت بہت تھی، اور ہمیشہ سے تھی اور میں ہمیشہ سے اسی فقدان کا شکار رہی، میں نے تو ہمیشہ ہی اپنے کمزور پہلوؤں کو چھپانے کے لیے حیلے بہانوں اور جھوٹ سے کام لیا تھا۔

”میرا دوست آگیا، ونیشیں بہن! آؤ چلیں۔“ فضل نے آکر بتایا تو میں فوراً اٹھ کھڑی

ہوئی۔

”اچھا شموں میں پھر آؤں گی۔“ میں نے اسے گلے سے لگایا۔

”لاڈلی سائیں کو میرا بھی سلام کہہ دینا۔“ وہ میرے ہاتھ کو آنکھوں سے لگاتی ہوئی

بولی۔



”اچھا کہہ دوں گی۔“ میں نے برے سے دل سے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل

آئی۔



ہم ایک جامعہ مسجد کے امام کے پاس آ گئے تھے۔ وہ ایک نامور عالم دین بھی تھے، اونچا قد، سفید داڑھی اور ہارعب شخصیت، ان کے چہرے پر اک کشش تھی، متناطیسی کشش، میری نگاہیں ان پر پڑیں تو میرا دل ہی بیٹھنے لگا۔

فضل اور اس کا دوست باہر بیٹھے تھے اور وہ چہرہ اور نگاہیں سامنے دیوار پر لگائے مجھ سے

مخاطب تھے۔

”دیکھو بیٹی! جو بات تم نے بتائی ہے اس کی روشنی میں یقیناً تمہارے ساتھ بہت زیادتی اور ظلم ہوا ہے ویسے طلاق تو خود ایک عظیم درجے کا ظلم ہے۔ یہ کبھی مرد عورت پر ڈھاتا اور کبھی عورت خود اسے اپنے لیے لازم کر لیتی ہے، دونوں صورتوں میں یہ برباد کر دینے والا عمل ہے، دو دلوں کو جدا کر کے دو خاندانوں کو کاٹ دینے والا۔ ہمارے خاندانی نظام کو برباد کر کے اجاڑ دینے والا عمل ہے یہ۔“ وہ دھیمے لہجے میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے گویا تھے۔

”اس لیے تو اللہ تعالیٰ کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔“ وہ

مجھے سمجھا رہے تھے اور میرے دل میں اگنے والے وہ خود رو پھول مچھائے جا رہے تھے۔

فضل مجھے واپس گھر چھوڑنے جا رہا تھا بظاہر وہ اور میں دونوں ہی خاموش تھے لیکن شاید ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خود کلام بھی تھے۔

میں اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ ”عصمہ! تمہاری راہیں کھوٹی ہو چکی ہیں اور واپسی کے نشان گرد آلود..... بہتر ہے کہ اب تم اسے بھلا دو۔“

”کسے.....؟“ میرے دل میں جیسے کوئی کانٹا گڑ گیا۔ ”وجہ کو..... اور کسے؟“ میرا نیک کرنا دماغ تیوری کھا گیا۔

”ناممکن.....“ میں اڑ گئی۔

”ناممکن! ہاں ناممکن ہی تو ہے کہ اب تم اسے پاؤ کوئی میرے اندر نہا۔“

”ناممکن نہیں ہے البتہ مشکل اور اذیت ناک ضرور ہے؟“ میرا دل کسی کی شہ پہ اٹھا۔

”استغفار پڑھو اللہ سے ڈرو“ کیا تم اس قدر گستاخ اور باغی ہو جاؤ گی کہ اللہ کے

احکامات پر جان بوجھ کر اپنی ضد کو ترجیح دو گی؟“ میرے اندر کی عصمہ سہم گئی۔

”میں دے کروں گی جو اللہ نے بتایا ہے۔“ دلنشین ڈھیٹ کی ڈھیٹ رہی۔

”یعنی.....؟“ عصمہ کے چہرے پر زردیاں گہری ہو رہی تھیں۔

”یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو دلنشین دھاڑی اور اس نے اپنا چہرہ

عصمہ سے پھیر لیا۔

”دلنشین بی بی!“ فضل کی بہت دور سے آتی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

”جی بھائی!“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ ”گھر آ گیا ہے۔“ اس نے مختصر اُبتایا۔

”گھر..... اچھا۔“ میں نے چونک کر گاڑی کی کمز کی سے باہر دیکھا۔ ہم لوگ تو واقعی

گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔

”آؤنا بھاجی! کھانا کھا کے جانا۔“ میں نے فضل کو اندر آنے کی دعوت دی۔  
 ”نہیں میرا جی! چھانہیں ہے۔ اس لیے کھانا بھی اچھا نہیں لگے گا..... پھر کبھی سہی۔“ وہ  
 صاف انداز میں بولا۔ وہ سنجیدہ زیادہ تھا یا اداس.... میں اس کے کھوئے کھوئے لہجے سے اندازہ نہ  
 لگا سکی مگر وہ مجھ سے کچھ کچھ ناراض بھی تھا۔ یہ اس کے چہرے پر پڑے ہوئے تل بتائی رہے تھے۔  
 ”ڈنٹیش بی بی!“ اس نے اپنی نظریں میری طرف گھمائیں اس کی آنکھوں میں جانے  
 کس ضبط کا پانی تھا۔ میں تو مارے شرم کے ڈوب ہی گئی۔

”اگر پہلے سفر کی صعوبتوں سے پاؤں آبلہ پا اور وجود تھکاوٹ سے چور ہو تو کبھی  
 دوسرے سفر کا ارادہ فوراً نہیں باندھنا چاہیے۔ منزل تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔“ وہ بدستور  
 میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں مارے گھبراہٹ کے شرابور ہوئی جا رہی  
 تھی۔

”تمہارے سامنے جو دوسرا راستہ ہے وہ پھر یلہ نہیں بلکہ کانچ سے بھرا ہوا ہے اور!  
 تمہارے پاؤں بھی ننگے ہیں ذرا سوچ کر قدم رکھنا۔“ اس نے مجھے صیحت کرنی چاہی۔  
 ”جی.....“ میں نے بمشکل جواب دیا۔

”اچھا چلا ہوں۔ جب میری ضرورت ہو تو فون کر لینا۔“  
 اس نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا کر گاڑی کی وڈر اسکرین پر جمائیں اور کچ  
 سے پاؤں ہٹا کر ایک دم سے گاڑی کی اسپینڈر ہادی گاڑی ایک خوفناک آواز کے ساتھ آگے بڑھ  
 گئی۔

”یہ اس کا اظہار غم تھا۔“ میں چند لمحوں وہاں کھڑی خالی سڑک کو دیکھتی رہی پھر گیٹ کی  
 طرف بڑھ گئی۔ گاڑی کا ہارن سن کر چاچا نے گیٹ کھول دیا تھا۔



رات کو دوجیہ کا فون آیا تو وہ بے حد بے چین تھا۔ اسے یہ پوچھنے کی جلدی تھی کہ عالم دین  
 نے کیا کیا۔

”ڈنٹیش! اماؤنا انہوں نے کیا کہا دیکھو کوئی اچھی خبر سنا نا کسی بری خبر کے سننے کی سکت  
 مجھ میں نہیں ہے۔“

اس کی آواز کے رنج کے کی جھلی کھاری تھی جیسے نیندرات بھر اس کی ہلکوں کو چھوئے ہوا اس کے حلق میں گرتی رہی ہو۔

”کیا بات ہے؟“ ”تم چپ کیوں ہو؟“

مجھے چپ پا کر وہ اور بھی بے تاب ہو گیا تھا۔

”ہوں ہاں بتاتی ہوں۔“ میں نے خود کو سنبالتے ہوئے کہا ورنہ تو اس کی آواز سننے ہی میری آواز بھرا گئی تھی اور میرے لہو کے سارے غلبے ریت کے ذروں میں بدلنے لگے تھے۔  
”بولو نا.....! تیشیں؟“ وہ پتتی تھا۔

”وجیہ! ایک راستہ تو ہے مگر.....“ میری زبان پر کالج کی کوئی پھانس جیسی چیز آن چھپی پورا جملہ میرے منہ سے ادا ہوئی نہ رہا تھا۔

”مگر کیا؟“ ”م آج ادھوری باتیں کیوں کر رہی ہو ٹھیک طرح سے بتاؤ نا؟“ وہ کچھ غصے میں آ رہا تھا یہ شاید اس کی برداشت کی حد ختم ہونے کا نشان تھا۔  
پھر میں نے ہمت کر کے اسے وہ راستہ بتا ہی دیا۔ جو مجھے اور وجیہ کو دوبارہ ملا تو سکنا تھا۔  
مگر تھا بڑا کر بناک۔

”نن؟“ ”نہیں۔“ اب وجیہ کے لفظ بھرانے لگے۔

”ہاں وجیہ! صرف یہی اک راستہ ہے۔“ میں نے اسے دوبارہ کہا تاکہ اسے کوئی ابہام نہ رہ جائے۔

”یہ تو سزا ہے عذاب ہے نار جہنم سے بڑھ کر۔“

اس کے اندر بھڑک اٹھنے والی آگ کی تپش میرے مساموں کو بھی چھونے لگی۔

”بے شک ایسا ہی ہے..... بے شک!“

میں نے شدت درد سے اپنی آنکھیں میچ لیں..... مجھے اپنے وجود کا بند بند جلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”لیکن میں یہ کیسے برداشت کروں گا کہ تم میرے سوا کسی اور کے.....“ ”وہ سچ بچہ رو

پڑا تھا۔

”وجیہ! کاش تم یہ پہلے سوچے۔“ آنسو میری ہلکوں سے بھی ٹوٹنے لگے۔

”مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کیسے ہو گیا..... کیسے میں نے اپنے دل پر چھری بھیر دی؟ مجھے

ہرگز پتا نہیں چلا میں تو جب ہوش میں آیا تو میرا دل دو ٹکڑوں میں تڑپ رہا تھا دلنشین! میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، میرا یقین کرو، میرا یقین کرو۔“ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح سسک رہا تھا۔  
 ”وجیہ! وجیہ! پلیز مت رو دو کیو! ایسے تو مت کرو! میں میں مر جاؤں گی مجھے یوں مت آزماؤ۔“

مجھے سے اس کا رونا برداشت نہ ہو رہا تھا۔ اس کے آنسو میرے دل کے شیشے پر ٹکروں کی طرح برس رہے تھے۔  
 ”دلنشین! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے تم سے اس قدر محبت ہو جائے گی میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میرے شب و روز تمہارے بغیر بالکل اندھیرے ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور میں سانس روک کے سن رہی تھی کہ مبادا میرے سانس لینے کی آواز بھی اس کی آواز میں حائل نہ ہو جائے۔  
 ”وجیہ! تم سوچو میری حالت کیا ہوگی؟“ میری کھٹی کھٹی سی آواز نکلی۔  
 ”میں جانتا ہوں..... مجھے سب پتا ہے۔“

”تم اور میں ایک ہی وجود میں سانس لینے والے دو انسان ہیں I Love you۔“ وہ بہت جذباتی تھا۔  
 ”پلیز کچھ کرو دلنشین! جلدی I can't wait“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے فوراً ہی آئے۔

”اوکے تم تم بھروسہ کرو مجھ پر میں کوشش کرتی ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ لیکن میں جانتی تھی یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے نہ ہی فوراً ہو جانے والا کام ہے۔  
 ”ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔“ میں نے اسے سمجھانا چاہا۔  
 ”لیکن کتنا؟“ وہ مزید پریشان ہو گیا۔

”یہ میں بھی نہیں جانتی..... مگر پھر بھی کم از کم آٹھ دس ماہ یا اس سے بھی زیادہ۔“ میں نے اپنے مطابق حساب لگا کر اسے بتایا۔

”یعنی ایک برس؟“ وہ تو جیسے سانس ہی کھینچ گیا۔  
 ”میں تو مر جاؤں گا دلنشین۔“ وہ پھر سے بے حوصلہ ہونے لگا۔  
 ”اللہ نہ کرے.....“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا پھر ہم کتنی دیر باتیں کرتے رہے

ہمیں وقت گزرنے کا کچھ احساس نہ ہوا یہاں تک کہ میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹائم ٹیس الارم دینے لگا صبح کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔

”وجیہ!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”ہوں..... کہو۔“ اس کی بھاری آواز میں رنجکے کا خمار تھا۔

”تجربہ کا وقت ہو گیا۔“ میں نے اطلاع دینے والے انداز میں بتایا۔

”ٹھیک ہے تم نماز پڑھ لو..... مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ وہ ایک جمائی لیتا ہوا بولا۔

”وجیہ! ایک بات کہوں۔“ میں نے کہا۔

”حکم کرو میری جان۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”تم بھی نماز پڑھا کرو..... سچ بہت سکون ملتا ہے نماز پڑھنے سے۔“ اپنا سچ کچ کا تجزیہ

بیان کیا۔

”اور نمازی کی دعائیں بھی رو نہیں ہوتیں۔“ میں نے اسے نرمی سے سمجھایا اور پھر میں نے اسے بتایا کہ میں نے کتنی شدت سے دعائیں مانگی تھیں کہ تمہارا موبائل نمبر مجھے مل جائے اور تم مجھ سے بات کرنے لگو۔

”اچھا وہ تمہاری نمازوں اور دعاؤں کا اثر تھا؟“ وہ ذرا سنجیدگی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ مجھے کچھ حیرانی ہوئی۔

”ڈنٹیشن! ایک بات تم سے شیئر کروں۔“ وہ مجھے کچھ متانے کے لیے تمہید باندھنے لگا۔

”ضرور۔“ میں نے دلچسپی سے کہا۔

”ڈنٹیشن! جب میں تمہیں چھوڑ کر یہاں آ گیا تھا تو میں نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا

تھا کہ تم بس میرے مقدر میں اتنے وقت کے لیے ہی تمہیں۔“ وہ کہتے کہتے رکا اور میرا دل دھڑکنا بھول کر رک گیا۔

”اچھا پھر؟“

”پھر ڈنٹیشن! میں نے تمہیں بھلانے کے لیے ڈرک اور کلب میں خود کو گم کر لیا اور میں

نے سوچ لیا تھا کہ میں جلد ہی الوینا سے شادی کر لوں گا۔“ وہ کہہ رہا تھا اور میں برزخ میں لٹک گئی تھی۔

”ا..... چھا..... پھر.....؟“ میرے خشک ہوتے ہونٹ پھٹنے لگے۔

”میں تمہیں جلد ہی بھول بھی جاتا.... لیکن پھر ایک رات تم اچانک میرے خواب میں آ گئیں۔ میں نے دیکھا تم میرے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی ہو اور زار و قطار روتی جا رہی ہو تم ہا بار یہی کہہ رہی تھیں وجہ! پلیز مجھ سے بات تو کرو۔ پلیز مجھ سے بات کرو۔“ کہتے کہتے وہ پھر سانس لینے کو رکا اور میں تو جیسے آگ میں جھلنے لگی۔

”پھر مجھے لگا کسی نے مجھے جھنجھوڑ کے چکا دیا ہو میں ڈر گیا تھا دلنشیں! ہڑبڑا کر اٹھا تو میں نے دیکھا میرے موہاںل پر فضل کا فون مسلسل آ رہا تھا فضل سے بات ہوئی تو اس نے مجھے تمہارا ٹھیک وہی پیغام دیا جو مجھے خواب میں کہہ رہی تھیں کہ پلیز وجہ! مجھ سے بات کرو فضل نے یہ بھی بتایا کہ تم بہت روتی ہو میرا نمبر لینے کے لیے منتیں کرتی ہو بس دلنشیں! اب سے میرے دل میں تمہاری یاد کا ایسا خنجر گڑا کہ مجھے اب ایک ہل بھی قرا نہیں۔“

اس نے اپنی بات پوری کی تو مجھے اپنی رکی ہوئی دھڑکنیں بحال ہوتی ہوتی محسوس ہوئیں۔

”وہ بے شک میری دعائیں ہی تھیں وجہ! جنہیں میرے اللہ نے قبول کر لیا۔“ میرے دل میں چمپا ہوا مسجد کا وہ پرنا لہ پھر سے پہنے لگا۔

”اللہ بے شک بڑا مہربان ہے..... وہ اپنے بندوں کی التجائیں ضرور قبول کرتا ہے۔“ میرے دل کا پانی آنکھوں کے کناروں پر آ گیا۔

”وجہ! تم بھی اسی سے مانگو“ بے شک وہی دینے والا ہے کسی اور کے پاس یہ قدرت کہاں؟“ میری آواز بجھنے لگی۔

”ن..... م..... از..... اچھا میں بھی پڑھا کروں گا۔“

اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی سی نکلی۔

”دلنشیں! میرا دل بہت بے قرار ہے.... میرے سینے پر اک پہاڑ کھڑا ہے اور..... اور

اس پہاڑ پر سے ہر وقت کسی کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔“

”کس کی وجہ؟“ میرا دل ادا سی میں گھر گیا۔

”کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم رورہی ہو..... اور کبھی؟“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”اور کبھی کیا؟“ وجہ! مارے تجسس اور خوف کے میرا دل ٹپکنے لگا۔

”کبھی لگتا ہے صوفی رورہی ہے..... اس کے رونے کی آواز اتنی کرناک ہوتی ہے کہ

میرے روکنے کڑے ہو جاتے ہیں اور میں لرز کے اٹھتا ہوں اور بستر چھوڑ دیتا ہوں یقین کرو  
 ورنہ! پھر مجھے نیند نہیں آتی اور کوئی میرا دل اپنے پیروں تلے پکٹتا چلا جاتا ہے۔ پھر نہ شراب کام  
 آتی ہے اور نہ ہی نیند کی گولیاں میں بہت پریشان ہوں بہت پریشان۔“ وہ پھر سسکا اٹھا۔

”وجہ امت یا کرو پلیر۔“ میں نے اسے زیادہ پینے سے روکنا چاہا۔

”تو پھر کیا کروں؟“ وہ گویا بے حد بے بس تھا۔

”نماز پڑھ کے دیکھو۔“ میں نے مشورہ دیا..... وہی مشورہ جو میں اکثر اسے پہلے بھی دیا

کرتی تھی۔

”مجھ جیسے کی نماز بھلا کہاں؟“

”ایسا مت سوچا کرو بس اپنے لیے توبہ کرو معافی مانگو اللہ سے بے شک وہ معاف کرنے

والا ہے۔“

مجھے پتا تھا منوبی کا ناحق قتل اس کے ضمیر کا بوجھ بنتا جا رہا تھا۔

”اچھا تم جاؤ نماز پڑھو اور میرے لیے بھی دعا کرنا۔“ اس نے مجھے نماز پڑھنے کا کہہ کر

فون بند کر دیا اور میں سوچنے لگی ”اللہ واقعی قادر مطلق ہے اس کے لیے بھلا کیا ناممکن ہے۔“

اس نے ”کن“ کہا ہوا اور وجہ کے دل میں میرا خیال اور آنکھوں میں خواب خود بہ خود

بس گئے ہوں گے ورنہ تو وہ بتا ہی رہا تھا کہ وہ مجھے بھلانے کا ارادہ کر چکا تھا بلکہ وہ تو الوینا سے

شادی۔“ مجھے ایک جمر جبری سی آگئی اور میں تجزی سے ہاتھ روم کی طرف لپکی تاکہ جلدی جلدی وضو

کروں نماز ہی دعا کا راستہ اور وسیلہ ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرض کی ہے تاکہ اس کا بندہ اس سے اپنی

حاجتیں مانگتا رہے۔ اب میرے دل میں یہ احساس اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔

❖ ❖ ❖

وجہ کی رجسٹرڈ پوسٹ میں نے وصول کر لی تھی اور میرے والدین کے چہروں پر چند روز

قبل کھلنے والی مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی..... وجہ نے مجھے طلاق دے دی۔

یہ سانحہ میری ماما کے لیے ناقابل برداشت تھا چنانچہ وہ دوبارہ ہسپتال میں داخل ہو گئیں

اور میرے بابا! وہ تو چلتی پھرتی اک دیوار بن کر رہ گئے نہ وہ بولتے تھے نہ کچھ سنتے تھے کم کھاتے اور

میرے سامنے آنے سے کتراتے رہتے میرا بھی زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزر



جاتا..... ہسپتال میں نوراں ممائی تھیں میرے لیے وقت بڑا عالم ہو گیا جس کا ایک ایک لمحہ صدی برابر تھا جو کتنا ہی نہ تھا اب ہر روز میری اور وجیہ کی بات نہ ہوتی تھی..... بلکہ ہفتے میں ایک آدھ بار وہ بھی بالکل عام سی نہ ہی وجیہ شدت جذبات سے اپنا حال دل کہتا تھا اور نہ مجھے اپنے لبوں میں کوئی بالچل محسوس ہوتی تھی۔ یوں کہہ لیں کہ ہم دونوں بے حد ادا اس تھے اور اس سے بھی بڑھ کر پریشان۔

”دلنشیں!“ آج بھی چھ روز کے بعد وجیہ کا فون آیا تھا اور وہ آواز ہی سے پیار لگ رہا تھا

”کیا بات ہے وجیہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کی خیریت معلوم کرنی

چاہی۔

”قلو ہو گیا ہے شاید۔“ وہ کہنے لگا۔

”دوالی۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بس دل ہی نہیں چاہتا کہ انہوں۔“ وہ بدستور ادا اس تھا۔

”کوئی تمہارے پاس ہے یا تمہا ہو؟“ مجھے ذرا فکر ہوئی۔

”نہ کوئی میرے پاس اور نہ ہی میں تمہا ہوں۔“ وہ کھویا کھویا سا تھا۔

”اچھا۔“ میں نے ایک سرد آہ کھینچی یعنی وہ میرے والی کیفیت میں ہی جلا تھا۔ میں بھی

اسی طرح سے محسوس کرتی تھی۔ بالکل اکلی گھنٹوں ایک ہی جگہ پر گرم سم سی بیٹھی رہتی مگر مجھے لگتا کوئی میرے اندر سرگوشیاں کر رہا ہے۔

”ایک بات کہوں وجیہ۔“ میں نے اپنے دل میں آئے خیال کے مطابق کہا۔

”ہاں کہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم فضل کو اپنے پاس بلا لو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”اچھا میں اسے کہتا ہوں۔“ وہ فوراً مان گیا۔

”اپنا خیال کرو ڈاکٹر کو دکھا کر دو الو۔“ میں نے اسے ہدایات دیں جس پر اس نے پھر

فورا ہی ہامی بھری۔ اب تو کئی روز سے ہماری درمیان ایسی گفتگو ہو رہی تھی دو تین دن کے بعد اس نے مجھے فون کیا تو بتانے لگا۔

”دلنشیں افضل میرے پاس آ گیا ہے..... اور اب میری طبیعت بھی کافی ٹھیک ہے تم

پریشان نہ ہونا۔“ وہ مجھے تسلی دے رہا تھا۔

”چلو ایہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔  
 ”میں نے اچھا کہاں کیا دلنشین!“ وہ بات کو دوسری جانب لے جاتے ہوئے دکھ سے

بولے۔

”دلنشین!“ اس نے مجھے چپ پایا تو پھر مخاطب کیا۔ ”تم مجھ سے ناراض ہونا..... میں نے تمہیں اتنا بڑا صدمہ دیا۔“ وہ اپنے جرم کا اقرار ایک بار پھر کر رہا تھا۔  
 ”ہاں نہیں لیکن میرے والدین بہت سخت صدمے کا شکار ہیں آج کل۔“ میں نے اپنے اندر تو سوائے اک خاموش اور گہری اداسی کے کچھ اور نہ پایا تھا البتہ میرے والدین.... ان کی حالتیں مجھے مار دے رہی تھیں۔

”ہاں میں جانتا ہوں ان کے دلوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔“ وہ سخت شرمندہ تھا۔  
 ”جن کی بیٹیوں کو یوں ایک دم سے بلا وجہ ہی فیصلے مل جائیں ان کے ماں باپ کس طرح سے زعمہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں وجہ۔“ بہت دنوں کے بعد میری آنکھیں گیلی ہوئی تھیں۔  
 ”میں، میں اپنے کیے پر سخت نادم ہوں..... کاش وقت پیچھے کو لوٹ جائے کاش۔“ وہ بے چین اور بے قرار تھا۔

”وقت کبھی اپنے قدموں پر نہیں پلٹتا..... یہ تو صرف آگے بڑھنے کے حکم کا تابع ہے۔“  
 میرے اندر اک کنواں کھد رہا تھا..... گہرا اور گہرا جس میں میری ذات دھنستی جا رہی تھی۔  
 ”وجہ! کاش تم ایسا نہ کرتے۔“ میرے گرد اس کنویں کی دیواریں تنگ ہونے لگیں اور میں نے مارے گہرا ہٹ کے فون بند کر دیا ساتھ ہی اپنی آنکھیں بھی کاش لفظ اپنے اذیت ناک معنوں کے ساتھ میری روح کو گھائل کر رہا تھا..... اس کے کاف..... شین کے درمیان کا الف دو دھاری تلواریں کر میری شہرگ کو چھو رہا تھا۔

”یا اللہ میری توبہ.....“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور میں بے سدھ ہو کر بستر پر گر گئی۔



ماما ہسپتال سے گھر واپس آ گئی تھیں اور میں ان کا سامنا کرنے کی سکت سے محروم تھی

میرے جوڑ میرے ریشے میری اعصاب شل اور بے جان تھے اور میں صبح ہی سے اپنے سن ہاتھ پھیروں کو سہلاتی ہوئی اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”عصمہ بیٹا۔“ نوران مامی کی آواز ایک گرم سیال کی طرح سے میری سماعتوں سے میرے دماغ پر گری۔

”جی مامی۔“ مجھے لگا میں کم از کم بول تو سکتی ہوں۔ ”بیٹا! آپ کو بیگم بلار ہی ہیں۔“ وہ میرے بے حد قریب کھڑی تھیں۔

”ماما..... ما۔“ میرے ہونٹوں کا پتھر بھی پکھلا۔

”جی وہ بلار ہی ہیں آجاؤ۔“ مامی نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما تو مجھے ان کا لمس بھی کر نٹ جیسا لگا..... میرے اعصاب جھنجھٹا اٹھے اور میں فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یعنی میرا وجود سلامت تھا بس میرے احساسات ہی جمود کا شکار تھے اور میری نفسیات کی سستی نے مجھے بت بنا رکھا تھا۔ میں نوران مامی کے ساتھ چلتی ہوئی ماما کے کمرے میں آ گئی۔

”ادھر آؤ عصمہ! میرے قریب۔“ مجھے اپنے سے دور کھڑا پا کر ماما نے نرمی سے کہا۔

”جی۔“ میں خود بہ خود ان کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”مجھے پتا ہے تم کس قیامت سے گزر رہی ہو۔ تمہاری اذیتوں کی گزر گاہ میرے لہو سے ہی متصل ہے۔“ انہوں نے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے یہ ان کی آواز کی نمی بتا رہی تھی۔

”جی..... ماما۔“ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی جو جانے کب سے میرے سینے پر جمی پڑی تھی۔

”کیا کہوں میری بچی! یہ تیرا عیب مشیتِ ایزدی سے ہی ہو گا ورنہ بظاہر تو کوئی مسائل نہ تھے۔“ وہ میرے ساتھ ہونے والے ظلم کی بات کر رہی تھیں۔

میں سر جھکائے بیٹھی صرف جی اُچی کر رہی انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”تم پریشان نہ ہونا..... اب پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھیں اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے سہلا رہی تھیں اور مجھے میرے دل پر پڑے آبلوں کو راحت مل رہی تھی ”دیکھو! میں صدمہ برداشت نہیں کر سکی اور بیمار ہو کر ہسپتال پہنچی مگر کیا ہوا زندگی تو نہیں ہاری نا..... ہماری زندگی کی ڈور تو حکمِ اللہ سے بندھی ہے۔ یہ دکھ درد صدمے اس کا ذائقہ کڑوا

ضرور کرتے ہیں..... اے ختم نہیں کر سکتے۔“ وہ مجھے زندگی کی اٹل حقیقت سمجھا رہی تھیں۔

”تمہارا صدمہ اس وقت بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آسمان کو چھوتا ہوا پہاڑ اور وہ پہاڑ تمہارے دل پر آن کھڑا ہے لیکن۔“ ان کی سانسیں اب زیادہ بات کرنے سے پھولنے لگتی تھیں وہ ذرا رکیں سانس لی اور پھر بولیں۔

”وقت بہت بڑا حکیم ہے بہت دانا اور شافی ہے تم دیکھو گی کہ دیرے دیرے یہ پہاڑ مٹی ہونے لگے گا اور بہت جلد وہ مٹی تمہارے خیر میں کھل جائے گی اور تمہیں یاد بھی نہ رہے گا کہ تم نے کیا بوجھ برداشت کیا تھا۔“

ان کے ہاتھ میرے ہاتھ سے ہٹ کر میرے چہرے کے گرد آگئے اور میرا چہرہ ایک نرم اور شافی ہالے میں آگیا۔

”ماما!“ میں نے وہ دونوں ہاتھ تمام کراہتی آنکھوں سے لگا لیے۔

”میری بیٹی! میری جان!“ ماما نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

پھر کتنی دیر ہم دونوں ماں بیٹی روتی رہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہ چلا..... بس محسوسات تھے جو بتا رہے تھے کہ اندر کی جلن پر کسی نے غنڈی غنڈی شکنم برسادی ہو میرا آبلہ پادل اور بے قرار روح کافی حد تک آرام محسوس کر رہے تھے اور میرے اندر شرمندگی کا احساس کم ہونے لگا ورنہ تو میں سوچ رہی تھی کہ اپنے نصیب کے اس داغ کے لیے میں ہی مورد الزام ٹھہرائی جاؤں گی لیکن میری ماما نے مجھے کوئی طعنہ دینے کے بجائے میرا درد بانٹ لیا۔ وہ میرا آدھا درد کھینچ کے اپنے اندر اتار چکی تھیں۔ حالانکہ ان کے اپنے اندر پہلے ہی سے درد کا اک سمندر موجود تھا۔ ماں کا مفہوم پوری تفسیر کے ساتھ مجھے سمجھا رہا تھا۔



”ڈنٹش! کیسی ہو؟“ اس رات وجیہ کا فون آیا تو میں عشاء کی نماز سے فارغ ہی ہوئی

تھی۔

”الحمد للہ تم کیسے ہو۔“ میں نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”میں بھی اب ٹھیک ہوں۔“ اس کا لہجہ بھی صاف تھا کسی بھی ڈپریشن سے پاک۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”میں! ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی ہوں۔“ میں نے پہلے بتایا اور پھر اس سے

پوچھا۔

”وجہ! کیا تم نے نماز پڑھی؟“ مجھے امید تھی وہ کہے گا۔

کل سے ضرور پڑھوں گا، مگر اس نے تو مجھے حیران ہی کر دیا، یہ کہہ کر۔

”میں نے فضل کے ساتھ جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔“ اس کی آواز میں

خوشی کا عنصر نمایاں تھا۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ مجھے بھی سچ بخوشی ہوئی یہ سن کر۔

”دلنشیں! میں اگلے ہفتے آ رہا ہوں۔“ اس نے مجھے یہ اطلاع دے کر بے چین کر دیا۔

”تم آ رہے ہو۔“ شوق دیدار نے میرے دل میں اک چٹکی بھری۔

”ہاں .... وہ زویا کی شادی ہے نا۔“ اس نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

”زویا کی شادی کس سے؟“ مجھے اتنی جلدی ایسی خبر کی امید نہ تھی اس لیے عجیب سا

لگا۔

”وہ ..... وہ چھوڑو تم ..... کوئی اور بات کرو۔“ وجہ مجھے بتانے سے گریز کر رہا تھا۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو مراد ہی سے ہو رہی ہے نا زویا کی شادی۔“ نہ چاہتے ہوئے

بھی میرے لہجے میں طنز آ ہی گیا۔

”ہاں ..... ظاہر ہے وہ اس کا منگیتر تھا ..... اسی سے ہوئی تھی۔“ وجہ کو بھی شاید میرا یہ

کہنا اچھا نہ لگا تھا۔ ”اور صوبی کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا؟“ مجھ سے اپنا غصہ دہانا مشکل ہو گیا، مجھے

غصے سے بھی زیادہ صوبی کے ناحق قتل کا غم تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ان لوگوں کی حد درجہ بڑھی

ہوئی ہے جسی کا افسوس۔

”دلنشیں! چھوڑو ..... تم اپنی بات کرو۔“ وہ اس موضوع پر بات شروع کر کے بچھتا رہا

تھا۔

”اپنی بات! میں اپنی کیا بات کروں وجہ۔“ میرے لبوں پر شکوہ بولنے لگا۔

”جس بات نے میری ہر بات کو بے وقعت اور بے معنی کر دیا، میرے لفظ کو ٹکے کر

دیے، تمہاری ساتتیں اسے تو سننے کو تیار نہیں اور .....“ میرا انداز دکھ سے بھر گیا۔

”I M Sorry“ وہ شرمندگی سے بولا۔

”صرف Sorry کسی کی ہنسی کھیلتی زندگی کے دامن پر طلاق کا انٹ داغ لگا کر کسی معصوم کو ناحق قتل کر دینے کے بعد صرف Sorry“ مجھے اس وقت وجہ اچھا نہ لگا۔

”صنوبی نے مراد سے نکاح کر لیا تو تم لوگوں نے اسے غیرت کا اتنا سنگین مسئلہ بنایا کہ بے چاری کی جان ہی لے لی اور اب جو تم کر رہے ہو وہ کیا ہے؟“ مجھے ان کی بے غیرتی پر گھن آ رہی تھی مجھے لگ رہا تھا صنوبی میرے اندر سے رونے لگی ہو۔

”ڈنٹشیں! پلیز۔“ وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔

”لگتا ہے تمہارے سینے پر اگئے والے پہاڑ کی چوٹی سے صنوبی کے رونے کی آوازیں آتا بند ہو گئیں کیا تم نے اسے وہاں سے بھی دھکا دے کر دوسری بار مار دیا ہے؟“ میں بولتی جا رہی تھی اور وہ چپ ہو گیا تھا۔ ایسا چپ کہ اس نے فون ہی بند کر دیا۔

”صنوبی!“ میں نے اپنے دل کے پہاڑ پر صنوبی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

”صنوبی!“ میں سسک رہی تھی۔

”بھرجائی.....“ اس کی ڈری سبھی سی آواز واقعی میرے دل کے کوہسار سے آگئی۔

”صنوبی!“ میں نے اپنے ہی وجود کے گرد اپنے بازو حائل کر دیے اور مجھے لگا صنوبی کا لرزنا کا پتا وجود ان میں سا گیا ہو۔

”میرا بھورایا گاں نہ جائے گا تم دیکھ لینا بھرجائی۔“ وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

”میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر دیا ہے۔ تم دیکھنا اس کا فیصلہ جلد ہی آئے گا۔“

”بے شک..... وہ انصاف کو پسند کرنے والا اور اسے قائم کرنے والا ہے۔“ میں نے اس کے احساس کو اپنے ساتھ سمجھ کر اپنے اندر سمولیا اور وہ کبھی نہ بھولنے والی یادیں کر میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔



”صنوبی کا ناحق بہایا گیا لہو مٹی میں جذب ضرور ہو گیا تھا مگر چھپنے والا نہ تھا۔ معصوم کے خون کے چھینٹے تو عرش کو چھوتے ہیں پھر بھلا اسے انصاف کیونکر نہ ملے۔“ مجھے یقین تھا صنوبی کے قاتل سکون نہ پائیں گے۔ اس کا قتل ایک فرد واحد نے نہ کیا تھا بلکہ یہ تو اجتماعی قتل تھا۔ اس کا محرک

وہ روایات اور رسوم تھیں جو ایسے خود غرض اور بے حس لوگوں نے غیرت کے نام سے منسوب کر دی تھیں، اور ایسے لوگ خصوصاً زمیندار طبقہ یا پھر ہمارے گاؤں دیہات کے جاہل عام سی بات پر بھی اپنی بہن، بیٹی، بیوی کسی کو بھی بد چلنی کے الزام میں موقع پر ہی قتل کر دیتے ہیں اور اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کرتے ہیں۔ غیرت قتل کے نام پر اپنی کوئی دشمنی یا مفاد کا نکلنے کی خاطر بے قصور عورتوں کو اس کی بھیٹ چڑھاتے ہیں اور اسے قتل خطا کی مد میں درج کرا کے چند سال کی قید کاٹ کر واپس آ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ قتل بھی قتل عمد ہی ہے اور اس کی سزا بھی سزائے موت ہی ہے۔ مگر قانون انصاف ہے کہاں؟“ میں اپنے سے الجھ رہی تھی۔

”ہے نا انصاف، کیوں نہیں ہے، بھلا اللہ سے زیادہ منصف کون ہے؟ اور اس کی گرفت سے بھلا خطا وار کبھی بچا ہے۔“ میرے دل نے گواہی دی۔

”صنوبی کے قاتل..... یعنی وجیہ!“ کسی نے میرے دل پر کھونسہ دے مارا۔

”وجیہ..... وجیہ..... وجیہ.....“ مجھ پر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

”یا اللہ رحم کرنا۔“ میں نے صنوبی کے قتل کا حساب مانگتے مانگتے وجیہ کے لیے رحم کی اور درگزر بھی مانگ لیا۔ یعنی میری دعا اور میرے جذبے دونوں ہی ملاوٹ زدہ تھے۔ دونوں میں کھوٹ تھا۔ صنوبی کے لیے انصاف کا مطلب تھا وجیہ کی موت۔ اور وجیہ پر رحم کا مطلب تھا صنوبی کے ساتھ ظلم میں اپنے آپ سے الجھتی نظریں چراتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور اس رات مجھے لگا میرے بستر پر کوئی اذان فجر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا ہو؟

کون؟

”صنوبی یا وجیہ!“ یہ سوال میرے دل کے پہاڑ پر سیدھا کھڑا ہو گیا، جیسے کوئی آسمان کی

طرف منہ کر کے اپنا حال دل کہتا ہو۔



”عصمہ! بیٹی!“ ماما نے مجھے پیار سے پکارا، اب وہ کافی بہتر تھیں اور آج خود چل کر برآمدے میں پچھی کر سیوں تک آئی تھیں۔

”جی ماما!“ میں جو وہاں پہلے سے بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی اٹھی اور انہیں ہاتھ تھام کر کرسی

پر بٹھا دیا۔

”تم سے ایک بات کرنی تھی، اگر تم برا نہ مٹاؤ تو.....“ وہ میری طرف بڑی ہی التجائیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں ان کی درد بھری جھکی جھکی سی نگاہیں مجھے پریشان کر گئیں۔

”کہیں ماما! کیا بات ہے؟“ میں ان کے گھٹنوں پر اپنا چہرہ رکھ کے نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔

”تمہاری عدت ختم ہو گئی ہے، اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے ماشاء اللہ خود کو صبر اور ہمت سے کافی حد تک سنبھال بھی لیا ہے۔“ وہ کچھ تہیہ سی باندھ رہی تھیں۔ میری چھٹی حس پہلنے لگی کہ ضرور کوئی بہت بڑی بات ہے جو ماما کہنے والی ہیں۔

”جی ماما“ میں نے نظریں جھکا لیں۔

”بیٹی! میری صحت تمہارے سامنے ہے، لگتا ہے وقت اب مجھے زیادہ مہلت یہاں رہنے کی نہیں دے گا۔“ وہ بے حد مغموم تھیں۔

”اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو۔“ میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”ہم سب اللہ ہی کے حکم کے تابع ہیں، ہماری ہر سانس اپنے مقررہ وقت کی پابند ہے، اور وقت وہ تو اک، ناک، روز ختم ہی ہونا ہوتا ہے ہر کسی کا۔“

”ماما! پلیز ایسی باتیں نہ کریں۔“ مجھے ان کی زندگی بے حد عزیز تھی، اور چاہتی تھی کہ وہ عمر دراز پائیں۔

”عصمہ! نصیر احمد نے تمہارے لیے پھر سے پیغام بھیجا ہے۔“ ماما نے اصل بات کو نہایت سادگی سے کہہ دیا، اور میں اسے سن کر پھر بھی جھٹکا کھائے بغیر نہ رہ سکی۔

”نصیر احمد نے؟“ مجھے تو جیسے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

”ہاں عصمہ! اس نے ابھی تک شادی نہیں کی، اور اسے جب یہ خبر ملی کہ تمہارے ساتھ اتنا بڑا سناخ ہو گیا ہے تو اس نے.....“ ماما سانس لینے کو رکھیں پھر کہنے لگیں۔

”اس کی نیت میں تمہارے لیے خلوص ہے، بھلائی ہے، اسے دوبارہ غلط نہ سمجھنا۔“ وہ مجھے سمجھا رہی تھیں اور میں چپ کی چپ اس پیغام کے یوں اتنی جلدی آ جانے پر دنگ تھی، یہ کیسے ہو گیا تھا، اور کیوں، میں حیثیت ایزدی کی حکمت اور اس کی رحمت کے درمیان کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

”تو پھر میں خاتون آپا کو کیا جواب دوں تم مجھے سوچ کر جواب دینا۔“ ماما نے مجھے چپ پا کر کہا۔



”جی ماما!“ میں نے مختصراً کہا۔

”چائے بنا کر لاؤں آپ کے لیے۔“ میں نے وہاں سے اٹھنے کا کہا نہ کیا۔  
 ”ہاں بنا لو۔“ وہ مسکرا کر بولیں..... میں نے ان کے چہرے کو پرسکون دیکھا تھا، وہ بھی  
 مہینوں کے بعد آج وہ واقعی بیمار نہ لگ رہی تھیں مجھے ان پر بہت سارا پیار آگیا تھا۔  
 ”میری ماما!“ میں نے بے ساختہ ہی جبکہ کران کا بوسہ لیا اور چائے بنانے چل دی۔  
 ”اللہ تمہیں آپاد کرنے اور پھر کبھی کوئی آزمائش تمہارے گھر کی دیواروں سے جھانکنے۔“  
 ان کی دعا نے میری پشت پر چھکی دی، یقیناً وہ میری مسکراہٹ کو میری رضامندی سمجھ رہی تھیں۔ اور وہ  
 غلط نہ تھیں یہ میرا دل کہہ رہا تھا۔ حالانکہ میرے احساسات اس وقت کسی اور خوشی سے ہمکنار تھے۔



آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آج صبح ہی سے ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کتنی قسمتی اور  
 پھر رستی بوندیں، ہلکی ہلکی چلتی ہوا اور تازگی سے بھرپور ٹھنڈک، میرا پسندیدہ موسم تھا۔ میں چھت پر  
 چہل قدمی کر رہی تھی اور موسم سے خوب لطف اٹھا رہی تھی۔ جب میرے موبائل کی واٹریشن کے  
 ساتھ اسکرین پر وجیہ کا نام چمکنے لگا۔

”وجیہ! میں نے ایک طرف کو بیٹھ کر فون آن کیا۔  
 ”السلام علیکم۔“ اس کی تازہ دم آواز بالکل ایسے محسوس ہوئی جیسے وہ پاس کھڑا خود سلام کر

رہا ہو۔

”علیکم السلام کیسے ہو وجیہ!“ میں نے پوچھا۔  
 ”الحمد للہ۔“ اس کا انداز میرے والا تھا مجھے خوشی ہوئی۔  
 ”کہاں ہوں کیا اپنے گاؤں میں۔“ میں نے پوچھا۔  
 ”خیر میں تو اس وقت کویت ہوں۔ اس نے بتایا۔  
 ”تم تو دینی میں تھے پہلے پھر پاکستان آ گئے تھے اور اب۔“  
 ”ہاں اب میں کویت میں ہوں اور اگلے ہفتے سعودیہ جا رہا ہوں۔“ اس نے ایک اور خبر

دے دی۔

”سعودیہ.....“ میرا دل اڑ کر مکہ کی حدود میں داخل ہو گیا۔

”ہاں دلنیش! میں عمرہ کرنے جا رہا ہوں۔“ اس کی آواز شدت جذبات سے رنہ گئی۔  
 ”عمرہ.....“ میرے ارمان بھی مچلنے لگے۔ مجھے یاد آ گیا شادی کے بعد جب وجیہ نے  
 مجھے اپنی مون پر جانے کا پوچھا تو میں نے اسے کہا تھا۔  
 ”عمرہ کرنے چلتے ہیں وجیہ۔“

”میں اپنی مون کا پروگرام بنا رہا ہوں، توبہ استغفار کا نہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔  
 ”ایسے بے ادبی سے نہیں کہتے۔“ میں نے برا مانتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔  
 ”سوری میرا مطلب نہیں تھا۔ لیکن یا اتم بھی تو رومانس کے دنوں میں تقویٰ اور پرہیز  
 کی باتیں کر رہی ہو۔“

وہ شرارت سے میرے بال بکھیرتا ہوا بولا تھا۔ پھر سنجیدہ ہو کر مجھے سمجھانے لگا تھا۔  
 ”چلیں گے..... ان شاء اللہ تعالیٰ عمرے پر بھی چلیں گے، بلکہ حج پر چلیں گے، تم فکر  
 کیوں کرتی ہو۔“ اور اب وہ جا رہا تھا، اکیلا، میرے بغیر، میرے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔  
 ”تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہاں پر جا کر مانگنے والے کو سب ملتا ہے، اس کی کوئی دعا رد  
 نہیں ہوتی۔“ وہ مجھے یاد کر رہا تھا۔

”ہاں میرے اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد ﷺ کے یہی فرمودات ہیں۔“ میرا دل  
 قطرہ قطرہ ہو کر پلکوں پر سے ٹوٹ رہا تھا۔  
 ”تو بتاؤ دلنیش! میں کیا مانگوں۔ مجھے دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے مجھے تو کچھ بھی پتا  
 نہیں ہے۔ تم بتاؤ میں کیا مانگوں؟“ وہ بھی شاید بمشکل اپنے آنسو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کی آواز  
 کا ہماری پین بڑھ رہا تھا۔

”جو تمہارے دل میں ہو۔“ میں نے اپنے دل کی بات دل میں ہی روک کر کہا۔  
 ”میرے دل میں تو صرف تم ہو دلنیش!“ میں کہیں اپنی نظروں سے اوجھل کر کے جی  
 نہیں پار رہا۔ مر رہا ہوں..... قطرہ قطرہ..... میں! تمہیں پاتا چاہتا ہوں۔“ آج پھر وہ جذباتی  
 ہو رہا تھا۔

”وجیہ!“ میں سسک پڑی۔  
 ”دلنیش! میں تمہیں اللہ سے مانگنے جا رہا ہوں۔ میں تو بس اس کے سامنے سوال ڈالنے  
 جا رہا ہوں۔ اس سے التجا کرنے اس سے مدد مانگنے جا رہا ہوں۔ اس سے التجا کرنے اس سے دعا

ماگنے جا رہا ہوں۔ بتاؤ کیا غلط کر رہا ہوں؟“ وہ مجھ سے سوال کر کر کے مجھے امتحان میں ڈال رہا تھا۔  
ایسے سوال جن کا جواب آسان نہ تھا۔

”وجہ! تم کہتے ہو پہلی نگاہ پڑنے پر اللہ سے اس کی محبت مانگنا کہ تمہیں اپنی محبت سے  
نوازدے۔ سوچو ذرا جسے وہ چاہے اس کا تو بیڑا پار ہی پار ہے۔“ میں اسے سمجھانے لگی۔  
”اللہ کی محبت.....“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”مجھ گناہ گار اور خطا کار سے وہ محبت کرے گا۔“ اسے یقین نہ آ رہا تھا۔  
”پاگل! جو اس کے در پر چلا جاتا ہے اس کی بخشش پالیتا ہے اور اپنے گناہوں سے ایسے  
پاک ہو کر لوٹتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے نومولود بچہ۔“ میں اسے اسی طرح سمجھانے لگی جیسے کوئی  
کسی چھوٹے بچے کو سمجھاتا ہے۔

”اچھا.....“ اس کے پاس جیسے لفظ ختم ہونے لگے۔ ”وہ مجھے اور تمہیں ملا دے گا نا؟“  
اس کے اندر بے پناہ یاس تھی

”تم اپنا ایمان مضبوط اور اس پر بھروسہ کامل رکھو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔  
”میرے لیے بھی دعائیں کرنا وجہ!“ میں نے لالچ سے کہا۔  
”ساری دعائیں تمہارے لیے ہی تو کروں گا۔ بس ان کا اثر اپنے لیے مانگوں گا۔“ وہ  
روتے روتے ہنس دیا تھا۔

”ہتا ہے میں نے باقاعدگی سے نماز جاری رکھی ہوئی ہے اور روز سورۃ یاسین بھی پڑھتا  
ہوں۔“ وہ ایک بچے کی طرح خوش ہو کر بتا رہا تھا۔

”پورے قرآن پاک کو بھی اس کی ترتیب سے پڑھنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے پہلے  
پارے سے شروع کر کے پچھلے روزانہ چند آیات پڑھو۔“

”اچھا اب ایسے شروع کروں گا۔ بلکہ میں پر قرآن ختم کر کے آؤں گا۔“ وہ مان گیا۔  
”وجہ!“

”ہوں.....!“

”وجہ! اما کا خیال ہے کہ وہ اگلے جمعے میرا نکاح کرادیں۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے  
بتایا۔ میرا خیال تھا وہ موڈ خراب کر لے گا۔

”اچھا.....“ وہ ناراض ہونے کے بجائے اداس ہو گیا۔ اور پھر اس نے مجھے اللہ حافظ

کہہ کر فون بند کر دیا۔



کل میرا نصیر احمد سے نکاح تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا میرے بابا اور اما کے چہروں پر گہرا اطمینان تھا اور وہ خوش تھے۔ اس کے باوجود مجھے ذرا سا محسوس نہیں ہوا تھا کہ یہ تو ان کی دیرینہ خواہش تھی جو اب جا کر پوری ہو رہی تھی۔

ایسا نہیں تھا۔ وہ میری وجہ کے ساتھ شادی کو بھی قبول کر کے خوش تھے۔ اور جب وجہ نے مجھے چھوڑا تب بھی وہ اسی قیامت سے گزر رہے تھے جو اس دنیا کے والدین پر ایسے سانحات کے بعد بنتی ہے۔ اور انہوں نے وجہ کے اس عمل کی سخت مذمت کرنے کے باوجود نہ تو مجھے طعنے دیئے تھے نہ بات بے بات وجہ کو برا بھلا کہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں حقیقت پسند انسان تھے اور عملی طور پر قرآن و سنت پر چلنے والے مسلمان تھے۔ جب ہی تو انہوں نے میرے عقد ثانی کا فیصلہ فوراً ہی کر لیا تھا۔ میری حالت عجیب سی تھی میں خوش تھی نہ غم زدہ۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی خاتون آپا نصیر احمد کے ساتھ آکر نکاح کا جوڑا اور کچھ ضروری لوازمات دے کر گئی تھیں۔

میں نے دیکھا جب وہ مجھے اپنے ساتھ لگا کر میرا ماتھا چوم رہی تھیں تو ان کے چہرے پر ایک بھی ایسا غلغلہ نہ تھا جو میرے لیے ناپسندیدہ ہوتا یا خوشامد اندہ ہوتا۔ ان کے سادہ دل کا خلوص ان کے عمل سے ظاہر ہو رہا تھا۔ انہیں میں طلاق یافتہ ہو کر بھی اتنی پیاری بھی جتنی اس وقت تھی جب وہ مجھے پہلے مانگنے آئی تھیں۔

”اللہ تیرے نصیبوں میں تیری محبت لکھ دے۔“

مجھے پیار کرنے کے بعد انہوں نے دعا دی۔ مجھے ان کی یہ دعا کچھ عجیب سی لگی تھی۔ اور شاید اچھی بھی نہ لگی تھی۔

”میری محبت اور نصیر کی محبت.....“ مجھے کچھ الجھن سی ہوئی۔ اس وقت میرے دل نے چٹل کھائی۔

”نصیر احمد سے شادی آج بھی تمہاری مجبوری ہے۔ ہے نا؟“

”شٹ اپ.....“ میں نے اسے جھڑکا اور خاتون آپا کو مسکرا کر اللہ حافظ کہنے لگی۔

”جیتی رہو۔ آبا رہو۔“ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔

اور میں اپنے دل کے چور سے نظریں چراتی ہوئی پھر سے وضو کر کے جائے نماز پر آ گئی۔ میرے اندر جب بھی ندامت کے کاغذ چھتے میں بھاگ کر اللہ سے رجوع کر لیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ میرے دل کی حالت جانتا ہے تو پھر بہتر ہے میں خود ہی اپنی خامیوں کے اعتراف کرتی رہوں۔ اس طرح کم از کم میں اس سے بار بار معافی تو مانگتی تھی۔ اور وہ مجھے معاف کر دیتا تھا۔ میری دعاؤں کی قبولیت اس کی گواہ تھی۔ میں اس سے جو بھی مانگ رہی تھی وہ مجھے بغیر انتظار کی اذیت میں ڈال دیتے جارہا تھا۔ اس کا صاف مطلب تو یہی تھا کہ مجھ سے وہ خفا نہیں ہے اور پھر وہ مجھ سے خفا ہوتا میں نے ایسے تو کوئی کام نہیں کیے تھے۔ میں تو اسی سے دست سوال پھیلانے ہوئے میں نوافل ادا کر کے دعا مانگ رہی تو بے شمار سوچیں بے شمار سوالات میرے دل و دماغ کو الجھا رہے تھے۔

”مجھے اعتراف تھا کہ میں بے حد گناہ گار بے حد کتر ہوں۔

اگر اس دنیا سے نکال دی جاؤں تو ”خس کم جہاں پاک“ والا مقولہ درست ہو جائے پھر بھی میرا رب مجھے چاہتا تھا۔

اور اس قدر چاہتا تھا کہ مجھے نوازتا جا رہا تھا۔

اس طرح جیسے کہ وہ صرف میرا ہی اللہ ہو۔“ میرے دل کی بے چینی کو کافی حد تک سکون مل گیا۔ اور میرے دل کا چور بھی جیسے کہیں منہ چھپا کر چھپ گیا۔ میں نے اٹھ کر وہ ساری چیزیں سنبھالیں جو خاتون آپادے کر گئی تھیں۔ سرخ کا مدانی خراہ، سونے کی چھ چوڑیاں، ایک مناسب سے وزن کا یا قوت جزا سیٹ۔ جو مہینا خاتون آپا کا ہوگا۔ اس کا ڈیزائن بتا رہا تھا۔ بڑا خوب صورت سیٹ تھا۔ میں نے یونہی اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا اور.....

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میرا عکس وہاں ڈول رہا تھا مجھے اپنے دو چہرے دکھائی دیئے اور میں ڈر کے پیچھے ہو گئی۔

❖ ❖ ❖

”نصصہ“

”نصصہ“ جیسے کوئی مجھے آواز میں دے رہا تھا۔

”نصصہ“ تیسری آواز پر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”لگ..... کون۔“ میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کھٹی کھٹی میں آواز

میں پوچھا۔

”میں دلشیں! اٹھو میں میری بات سنو۔“

سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے ایک چہرہ بول رہا تھا یہ وہی چہرہ تھا جو شام کو میں نے دیکھا تھا..... میں ٹھیک اسی طرح ڈر گئی جیسے شام کو ڈر گئی تھی۔  
”دیکھو! اس وقت کمرے میں میرے اور تمہارے سوا کوئی بھی نہیں مجھے ایک بات بتا

دو۔“ وہ چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”کیا.....؟“ میں نے سوکھے ہوئے حلق کو اپنے تھوک سے تر کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم نصیر احمد سے شادی کیوں کر رہی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”میں..... میں!“ مجھے جواب سمجھ نہ آ رہا تھا۔

”کیا صرف اپنے والدین کے کہنے پر؟“ وہ میری حالت کو نظر انداز کر کے پوچھ رہا

تھا۔

”ہاں ظاہر ہے۔“ میں نے اسی جواب کو مناسب جان کر ہائی بھری۔

”اچھا کیا تم نے وجیہ کو بھلا دیا ہے؟“ اس کا اگلا سوال بے حد ٹیکھا تھا جس کا جواب

میرے پاس نہ تھا۔ سچ نہ تھا۔

”میرا خیال ہے کہ نہیں۔“ وہ چہرہ طنز سے مسکرایا۔ ”دیکھو عصمہ! اگر تم نصیر احمد کو اپنے

بساط دل پر ایک مہرے کی طرح رکھنے جارہی ہو تو سوچ لو کہ تم کیا کرنے جارہی ہو۔“

”تم..... تم بکواس نہ کرو تمہیں کیا خبر میرے دل کا حال، تم کیسے جان سکتے ہو؟“ اس

چہرے کی بڑھتی ہوئی جرات پر مجھے غصہ آ گیا میں اسے جھڑکنے لگی۔

”تمہارا حال دل میں نہیں تو اللہ تو جانتا ہے نا، وہ اللہ جس کی محبت کا دم تم آج کل خود پر

فخر کر کے بھرتی نظر آتی ہو۔“ اس نے مجھے طعنہ دیا۔

”یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ تم سے مطلب؟“ میں نے پھر بھی اپنے پروں پر پانی نہ

پڑنے دیا۔

”اللہ اور بندے کا معاملہ کیا ہوتا ہے اس کے معنی ڈھونڈو عصمہ! تم اللہ کی قربت کی

دعوے دار ہو تو اس کی صفات پر بھی غور کرو بس یہی بات تھی جسے سمجھانے کے لیے میں نے تمہیں اس

وقت جگایا تھا۔“

دلنشین کا چہرہ آکھینے میں ہی غائب ہو گیا اور میں اپنے پسینے سے شرابور جسم کو کاٹتا ہوا محسوس کرنے لگی..... حالانکہ آج سخت سردی تھی۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟“ میں سوچنے لگی۔ ”کچھ بہت پر اسرار..... بہت انوکھے

واقعات۔

یہ دلنشین کا چہرہ۔

یہ سب کیا تھا۔ حالانکہ میں ہی تو دلنشین تھی اور میں ہی عصمہ..... میں میں تو ایک ہی ہوں یہ تو میرے دو نام تھے اور میرے ہی کیا اکثر لوگوں کے دو نام ہوتے ہیں پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ جب بھی میرے اندر سے آواز اٹھتی تو عصمہ کے نام سے اٹھتی..... اور باہر کے ہوئے مجھے دلنشین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کیا میرے ساتھ کوئی جن تھا۔

جن کا خیال آتے ہی میری کھمبھی بندھ گئی۔

”نہیں نہیں یہ تو میرے واسطے ہیں..... میں نے نفسیاتی طور پر اپنے مانی الضمیر کو اپنے اوپر طاری کر لیا ہے لہذا وہ شکل اختیار کر کے مجھ سے باتیں کرنے لگا ہے ورنہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اور پھر جن کہاں سے لگ گیا میرے پیچھے.....؟“ میں نے خود کو ہار کرانا چاہا..... حوصلہ دینا چاہا۔

تجسسی میں نے محسوس کیا میرے وجود کا چمکنا لکڑی کا ہو گیا ہے اور میرے رگ رگ میں پانی بہنے لگا ہے میرے خیال پر اس لمحے ایک دھند میں لپٹی ہوئی مسجد آہستہ آہستہ واضح ہونے لگی..... جس کے معن پر سے ایک شخص کبل کی ہیکل درست کرتا ہوا اٹھا اور میرے وجود کی دیواروں سے باہر نکل گیا..... جب وہ اپنی ہیکل درست کرتا تھا تو میری نظر اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی اور میری ساری جان سمجھ کر میری شہ رگ میں آن پھنسی تھی۔

✖ ✖ ✖

میں دوسری بار دلہن بن چکی تھی۔ سرخ کامدانی غرارے اور یا قوت کے اس میکس سیٹ سے بھی عصمہ..... پھر سے سرخ گلابوں کی بیج پر تھی اس وقت میری حالت ناقابل بیان تھی۔ میرے احساسات میری کیفیات اور یہ سارا ماحول میں ایک قیامت سے دو چار تھی..... میری حالت وہی عورت جان سکتی تھی جو میری طرح سے اپنا محبوب پیچھے چھوڑ کر آئی ہو اور یہ گوارہ نہ کر سکتی ہو کہ اسے

سوائے اس کے محبوب کے کوئی اور چھوئے مگر وقت اسے اس آزمائش میں ڈال بھی دے۔  
تازہ گلابوں کی مہک مجھے کانٹے جاری تھی اور کاہنی غرارے کی ہر تار تپے لوہے کی تار  
لگ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں اسی لمحے کسی کے گلا کھنکھارنے کی آواز  
نے میرے اندر کے لاوے کو ہوا دے دی۔

”السلام علیکم۔“ وہ آکر میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔ میں تو چاہتی تھی کہ اسے کوئی جواب نہ  
دوں۔ مگر میرے لبوں سے بے اختیار ہی نکل گیا۔

”علیکم السلام.....“ میرا حال چال دریافت کرنے کے بعد وہ بولا۔

”آپ آرام اور سہولت کے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں ہم روایتی سے میاں  
بیوی بننے کی بجائے اچھے دوست بننے کی کوشش کریں۔“ وہ بہت سلیقے سے بات کرتا تھا اس کی آواز  
ہو بہو جیہ کی آواز جیسی تھی یہ مجھے آج محسوس ہونے والی پہلی بات تھی جو بری نہ لگ رہی تھی۔  
”معصمہ! میں وعدوں اور دعوؤں پر انحصار کر کے خود کو اچھا ثابت کرنے والا مرد نہیں  
ہوں۔“

وہ کہہ رہا تھا..... بڑے ٹھہراؤ اور نپے تلے انداز میں۔

”میں تو بس ایک عام سامرد ہوں..... میرا ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے مماثلت  
رکھتے ہیں اور میں اپنے جذبات کے اظہار پر یقین رکھتا ہوں۔“ اس نے اپنی شخصیت کو مختصر ادا  
کرنے کی کوشش کی۔

”میں چاہوں گا کہ تم بھی..... اچھا میں تم سے کہہ سکتا ہوں یہ ”آپ“ کے ساتھ لگا ہوا  
تکلف غیریت لگے گا۔“ اس نے مجھ سے کہنے کی اجازت طلب کی۔

”جی جیسے آپ کو مناسب لگے۔“ میں نے خود کو اس سے متاثر ہوا پایا۔

”تم بھی مجھے آپ نہ کہو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“

وہ تھوڑا سا بے تکلف ہوا اور کھسک کر اوپر ہو گیا اس نے نیلے کو بیڈ کی پشت پر کھڑا کر کے  
لیک لگائی تھی۔

”میں نے کہا تم ایزی ہو کر بیٹھ سکتی ہو۔ تاکہ ہم سکون سے باتیں کر سکیں۔“ اس نے  
ہاتھ بڑھا کر میرا دوپٹہ ذرا سر پر پیچھے کر دیا..... کچھ لمحے اس کی نظروں کی تپش میرے چہرے پر  
رہی..... پھر وہ گویا ہوا۔



”تم بہت حسین ہو بہت۔“ اس کے لبوں پر میری تعریف تھی۔ میں نے بے چینی سے

پہلو بدلا۔

”اچھا! یہ ایک چھوٹا سا تھنہ۔“ اپنی دوستی کی ابتدا کرتے ہوئے۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک ڈیما نکالی اور اسے کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ ایک نازک سی چین میں اللہ کا لاکٹ دمک رہا تھا کوئی اور وقت ہوتا جیسے میں پہلے تھی تو نصیر احمد کو پینڈا اور کنجوس اور جانے کیا کیا کہتی مگر اب.....! اب تو مجھے اس لاکٹ میں دکنے والے الفاظ پر اپنا آپ پورا بچھاؤ ہوتا محسوس ہوا۔

”اگر برا نہ مٹاؤ تو.....“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں یہ لاکٹ خود مجھے پہنانے کی خواہش تھی۔ میں نے وہ لاکٹ ڈیما میں سے اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا..... جس پر وہ مسکرا دیا..... میں نے دیکھا وہ ایک عام سی شکل و صورت کا مرد اپنے چہرے پر خاصی کشش رکھتا تھا ایک نادانستہ سی مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی اور میرے اندر جلنے والے الاؤ پر جیسے شبنم گرنے لگی۔

ویکھا۔

سامنے بٹھاتا ہوا ہنس پڑا۔

”مذاق کیوں؟ سنجیدہ کیوں نہیں۔“ اب میں نے ذرا برا منانے کی ایکٹنگ کی۔

”تو تمہارا مطلب ہے کہ سچ بچ۔“

وہ میری طرف اٹکی اٹھائے مجھے حیرت اور خوشی کے طے جلے جذبات سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”سو یقینی سچ۔“ میں نے بہت ہی ہلکی ہی شکل بتائی۔ تاکہ میری ہنسی نہ نکل سکے جو  
 اس کے معصوم سے چہرے پر بے وقوفانہ حد تک ٹھہری ہوئی حیرت کو دیکھ کر نکلنے ہی والی تھی۔  
 ”اچھا تو میں آفس فون کر دیتا ہوں۔“ وہ ناشتا چھوڑ کر فون کی طرف بڑھا۔  
 ”ارے۔۔۔ اتنی جلدی کیا جلدی ہے۔ آج تو آفس جاؤ۔“

میں نے چائے کا کپ اس کے سامنے کرتے ہوئے اسے فون کرنے سے روکا۔  
 ”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ بغیر برا منائے ناشتے کی طرف واپس آ گیا۔  
 ”نعمہ!“ اب وہ سنجیدہ تھا اور بالکل نارمل انداز میں ناشتا کر رہا تھا۔

”کہو۔“ میں نے اس کی پلیٹ میں اور چنے لٹکائے ہوئے کہا۔  
 ”آج اماں جان واپس آ جائیں گی۔“ اس نے مجھے گویا اطلاع دی۔  
 ”خالہ جان۔“ میں نے خاتون خالہ کو کہا۔ میں نے بچپن سے آج تک کبھی انہیں خاتون خالہ کے علاوہ کچھ نہ کہا تھا۔ حالانکہ ماما مجھے ہمیشہ سمجھاتی تھیں۔

”بڑی بات۔ ان کا نام لے کر یوں مت پکارا کرو۔ خالہ جان کہا کرو۔“ تب وہ مجھے کہیں سے بھی ”خالہ جان۔“ جیسی میٹھی اور عزیز نہ لگتی تھیں۔ اور اب ایک بار بھی مجھے ماما نے نہ کہا تھا اور میں انہیں خالہ جان کہنے لگی تھی۔

”عصمہ! اماں جان دو پہر کی گاڑی سے آرہی ہیں میں انہیں اسٹیشن سے لے آؤں گا تم ذرا کھانے پر اہتمام کر لیتا۔“

نصیر احمد نے مجھے دوبارہ کہا۔ تو مجھے یاد آیا کہ خالہ جان تو ہمارے ولیمہ کے اگلے روز ہی ملتان چلی گئی تھیں وہاں ان کی بہن سخت علیل تھیں۔ ویسے نوراں ماما کا تو یہ بھی کہتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ملتان گئی ہیں تاکہ میری اور نصیر احمد کی انڈر اسٹینڈنگ جلد ہو سکے۔

”کیا ان کے ساتھ کوئی اور بھی آرہا ہے؟“ میں نے ناشتے کے خالی برتن اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”اماں کے ساتھ بھلا اور کون آئے گا۔ ماما تو خود بیمار ہیں۔“ نصیر احمد اپنی خالہ کو ماما کہتا تھا۔

”ٹھیک ہے میں کھانا بنا لوں گی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔“ میں نے مسکرا کر نصیر احمد کی تسلی کرائی۔ تب وہ مجھے اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اور میں کچن میں آ کر نسیم باجی کو کام سمجھانے لگی۔ نسیم باجی یہاں کام کرنے والی عورت تھی۔ کوئی پینتالیس سے پچاس سال کے درمیان دہلی پتلی عورت۔ جو واقعی اپنے کام سے کام کر مکتی تھی۔



میں باہر مچن میں موجود چھوٹے سے باغیچے میں آ گئی۔ موتیا کے سفید سفید کھلے ہوئے پھول پورے باغیچے میں خوب چھپ دکھارہے تھے اور ان کی خوشبو زبردستی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک تو ابھی صبح ہی تھی کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا دوسرا آج آسمان بھی ابر آلود تھا۔ اس لیے موسم

تقریباً سہا ہای تھا۔ میں نے چہل اتار دی۔ اور نرم نرم گھاس پر کچھ دیر چہل قدمی کرتی رہی پھر موتیا کے پھول بننے لگی۔ میں نے اپنے دوپٹے میں ڈھیر سارے موتیا کے پھول بھر لیے تھے۔ اور انہیں نرمی سے تھامے ہوئے۔ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آ کر میں نے وہ سارے پھول اپنے بچے کے ساتھ رکھ دیئے اور یونہی انہیں چھونے لگی۔

”موتیا کے پھول۔ اور میں؟“

”موتیا کے پھول اور وجیہ۔“

”پھول اور خوشبو۔ میں اور وجیہ۔“

میرے اندر بہت سی سرسراہٹیں ہونے لگیں۔

”چتا نہیں وجیہ کیا ہوگا؟“ یہ خیال آتے ہی میرا دل اداس ہو گیا کہ میں نے اس کا موبائل نمبر ڈائل کر دیا۔

تیسری تہیل پر وجیہ کا فون اٹینڈ ہو گیا۔ مگر آگے وجیہ کی جگہ فضل تھا۔

”کیسی ہو دلنشین بہن؟“ وہ بڑے ہی پیار سے پوچھ رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ میں نے ڈھیلے ڈھیلے انداز میں پوچھا۔

”شکر ہے میرے رب کا؟“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ پھر خود ہی بتانے لگا۔

”لاڈلی سائیں تو آج کل مدینے میں ہیں۔ اور وہاں فون تو وہ لے کر نہیں گئے۔“

فضل جانتا تھا کہ میں پوچھوں گی کہ وجیہ کہاں ہے؟

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

”وجیہ وہاں پر ہے۔ مدینے میں؟“ میرے روٹے کھڑے ہوئے گئے اور رپڑھ کی

ہڈی تک سنناٹا ہونے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر بہت سی آوازیں ہوں اور

سب کی سب سے ایک ہی صدا آتی ہو۔

(اے اللہ! میں حاضر ہوں) میں اٹھی اور وضو کرنے چل دی۔



خالہ جان آئیں تو بے حد خوش تھیں۔ میرے لیے ملتان سے بہت سے تحائف لائی

تھیں۔

”عصمہ! یہ ملتانى سوہن حلوہ بہت مزے دار ہے۔ یہ خاص تمہارے لیے ہے۔ سنبال کر رکھ لینا۔ مجھے پتا ہے تمہیں بچپن سے حلوہ بہت پسند ہے۔ اور۔ اور یہ دیکھو! ملتانى کھسے۔ یہ چنل اور یہ کڑھائی والا سوٹ۔“ وہ ایک ایک چیز مجھے دکھا رہى تھیں اور بچوں کی طرح سے خوش ہو رہى تھیں۔

”جی بہت اچھی ہیں تمام چیزیں۔“ مجھے واقعی ساری چیزیں بہت پسند آئى تھیں۔ میں نے انہیں اٹھا کر اپنى الماری میں رکھ دیا۔

”اچھا بھئی تم دونوں ساس بہو اب کرو باتیں میں واپس آفس پہنچوں۔“ نصیر احمد نے کھانا کھاتے ہی اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ واپس آفس چلا گیا اور خالہ جان آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ اور میں اپنے کمرے میں آگئی۔ کتنی عام اور روزمرہ کی مصروفیات والى زندگی ہو گئی تھی۔ میں لیٹ کر سوچنے لگی۔

نصیر احمد سے میرے نکاح کو کوئى پندرہ روز ہونے کو تھے اور میں نے معمولات زندگی کی اس ڈگر کو نکاح کے تیسرے روز سے ہی اپنا لیا تھا۔ اس شادی شدہ زندگی میں کہیں کوئى نیا پن نہ تھا۔ میں تو خیر نویلى دہن نہ تھی۔ مگر نصیر احمد؟ وہ بھی تو بالکل نارمل تھا۔ اگرچہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ مگر اس کے جذبات میں کوئى طغیانی نہ تھی۔ وہ بالکل ٹھہرے ہوئے پانیوں جیسا شفاف اور بے شکن تھا۔ اس کے اندر جو کچھ بھی تھا صاف دکھائی دیتا تھا۔

”نصیر احمد۔ کیسا تھا۔؟“ میں جان بوجھ کے اس کے بارے میں سوچنے لگی۔

سانولى سلولى سی رنگت پر بالکل عام سے نقوش۔ البتہ اس کا قد کاٹھ بہت اچھا تھا۔ جگى جگى سی نظریں اور گنبیر لہجہ۔ اس کے انداز سے اس کی بہترین تعلیم اور تربیت جھلکتى تھی۔ اور سب سے بڑھ کر۔ وہ بے حد ہمدرد اور غمگسار تھا۔ کیونکہ شروع کے پانچ چھ روز میں اس نے میرى بہت دلجوئى کی تھی۔ وہ بہت اچھا دوست تھا۔

”دوست!“ میرے احساس نے میرے دل پر ایک چٹکى بھرى۔ اور میں قدرے شرمندہ ہو گئی۔

”عصمہ بی بی! وہ تمہارا شوہر اور تم اس کی منکوحہ؟ پھر بھی تم دونوں کے بیچ ازدواجى تعلقات مفقود ہیں؟

کیا تمہارے اندر کا چرما بھی بیٹھا ہے۔ اور اس شریف النفس کی زندگی سے

خوشیاں چرا کر اپنی برباد آرامگاہ کو دوبارہ سجانا چاہتا ہے؟“ میری سوچوں کے منہ نوکیلے ہو کر مجھے کھرچنے لگے۔ میرے پاس ان باتوں کے کوئی جواب نہ تھے۔ میں نے اپنے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پڑی ہوئی۔ نجمہ شاہین کی شاعری کی کتاب ”میں آنکھیں بند رکھتی ہوں“ اٹھائی اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

بھر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے

اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

میں ایک غزل کے اشعار پڑھنے لگی۔ نجمہ شاہین کو میں نے پہلے نہیں پڑھا تھا۔ یہ شعری مجموعہ نصیر احمد میرے لیے خرید کر لایا تھا۔ نصیر احمد کا ذوق ادب بہت اعلیٰ تھا۔ اس کے پاس پوری ایک لائبریری موجود تھی۔ اور ابھی برسوں شام ہی اس نے مجھے کچھ کتابیں لا کر تحفہ کی تھیں۔ ان میں یہ مجموعہ بھی تھا جسے میں نے ابھی کھولا تھا۔ مجھے یہ غزل اپنے ہی حسب حال لگی۔ مجھے لگا میں ان اشعار کو پڑھنے کے بجائے لکھ رہی ہوں

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو

زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے

جبر کی آگ میں جلنے سے نہیں ڈرتی

میں

عشق مجھ میں ابھی بے خوف و خطر باقی

ہے

سانس لینا تو شاہین نہیں ہے جیون

ڈھونڈ کر لاؤ میری روح اگر باقی ہے

غزل پڑھتے پڑھتے میرا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ اور میرے وجود کی وہ ساری کرچیاں پھر سے بکھر گئیں جنہیں چنتے چنتے میرے احساس کی انگلیاں لہولہاں ہو گئی تھیں۔ اور میرا مردہ وجود اپنی پھڑکی ہوئی روح کے لیے پھلنے لگا۔

”میں کس قدر اذیت و کرب کا شکار تھی۔ یہ میں ہی جانتی تھی۔ یا پھر مجھ جیسی حراماں

نصیب وہ عورتیں جو ایسی دودھاری تلوار پر جی رہی ہوں کہ ان کے دل میں کوئی اور بستا ہو اور وہ خود کسی اور کے خواب سجاتی ہوں۔“ میں نے وہ کتاب بند کر کے اپنی زندگی کے اس کریناک باب

زندگی کو بند کرنا چاہا۔ جواب ناممکن ہو چکا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا۔ میرا دل میری آنکھوں کے بند توڑ کے نکلے پرا گیا ہو۔

”وجیہ۔“ یہ وہ بے ساختہ..... سسکی تھی جو خود بخود میرے لبوں سے آزاد ہوتی رہتی تھی۔

”وجیہ! تم کہاں ہو؟ آئی مس یو۔“

میں نے اپنی آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور اپنے ڈریسنگ روم کی طرف بھاگی..... وہاں پر چھپائی ہوئی اپنی ڈائری لکالی اور وجیہ سے باتیں سے کرنے لگی۔ میرے پاس وجیہ سے باتیں کرنے کے یہی دو تین ذریعے تھے۔ موبائل فون، خیالات اور یہ ڈائری۔ پہلے دو ذریعے اگر میسر نہ آتے تو پھر یہی ڈائری میرے اندر کو اظہار بخشی تھی۔ یہ میرا دوسرا دل تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کو زہ دل میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اور پھر میں گرد و پیش سے بے خبر ہو گئی۔



”نصیر احمد! تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ اگلی دوپہر نصیر احمد کا آفس سے فون آیا۔  
 ”خیریت تو ہے۔ اس وقت کہاں جانا ہے۔؟“ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس دوپہر میں ہم نے کہاں جانا ہے جو میں تیار ہو جاؤں۔  
 ”تم تیار ہو۔ میں بس یوں آیا۔“ نصیر احمد نے جذباتی انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔  
 میں نے بھی فوراً ہی غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے ہلکے پھلکے سے میک اپ کے ساتھ تیار ہو گئی۔  
 ”ارے واہ! تم تو خاصی اکیٹو ہو۔“ مجھے یوں تیار پا کر نصیر احمد نے حیرانی کے ساتھ ساتھ ستائشی نظروں سے بھی دیکھا۔

”شکر ہے تم نہ تو تیار ہونے میں دیر لگاتی ہو اور نہ بہت مصنوعی انداز میں تیار ہوتی ہو۔“  
 نصیر احمد نے میری کمر کے گرد بازو جمائل کر کے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔  
 ”اچھا تو ہم نے جانا کہاں تھا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے نصیر احمد کو یوں اپنے قریب آنا اظہار الفت کرنا برا نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کا اظہار محبت تو مجھے بہت ہی سادہ اور معصوم سا لگتا تھا۔ جس میں کوئی ضد یا زور زبردستی نہیں ہوتی تھی۔

”میں نے کہا زوجہ محترمہ آپ چلیں تو سہی۔ کہیں تو جائیں گے ہی۔ ہو سکتا ہے تمہیں کہیں بھگا کر لے جانے کا پروگرام ہو۔“

وہ شرارت سے میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خالص رلیس لگانے والے اسٹائل میں کھڑی ہو گئی۔

”اوکے۔“

وہ مجھے کھینچ کے تقریباً بھگاتا ہوا باہر لے گیا۔

”ارے۔ ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ رکو۔ کیا ہم چھوٹے سے بچے ہیں۔“ میں نے کار پورچ میں پہنچ کے اس کا ہاتھ کھینچا۔

”کیوں خوش ہونے کے لیے کیا بچہ ہونا شرط ہے؟“ وہ ڈرا کر اور اپنی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

”نہیں بچہ ہونا نہیں بلکہ خوش ہونے کے لیے زندہ دل ہونا ضروری ہے۔“ نادانستہ ہی میرے ہونٹوں سے نکل گیا۔

”بالکل غلط۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”بلکہ کسی بھی دل کی زندگی کے لیے خوشی ناگزیر ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں خوش رہنے کی کوشش جان بوجھ کر بھی کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ ہمارا دل زندہ اور ہماری روح مطمئن رہے۔“ اس نے میری ناک کی نوک کو بالکل وجہیہ کے انداز میں پکڑ کر چٹکی میں دھپایا اور پھر ہنس دیا۔

”بیٹھو مادام عصمہ! اور نہ دیر ہو جائے گی۔ اور پاسپورٹ آفس کا وقت ختم ہو جائے گا۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ میرے لیے کھولا۔

”پاسپورٹ آفس؟“ مجھے مزید حیرت ہوئی۔

”جی ہاں۔ پاسپورٹ آفس۔“ اس کی مسکراہٹ گہری اور معنی خیز تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جانو ہم ملک سے باہر رہے ہیں۔ مگر کہاں یہ مجھے خود معلوم نہیں۔“ اس نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بتایا۔

”یہ کیا تم آج ادھوری باتیں کر رہے ہو۔؟“ مجھے ہر بات کے سامنے لگا سوالیہ نشان



کوفت میں جٹا کر رہا تھا۔

”میری دوست! قسم لے لو اپنی کہ مجھے واقعی خبر نہیں ہم کہاں جا رہے ہیں۔ وہ تو باس نے مجھے آفس میں بلایا۔ شادی کی مبارکباد دی اور کہا کہ تمہاری شادی پر میں آنہیں سکا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر تمہارے لیے کبھی کی اور میری طرف سے ایک زبردست سرپرائزنگ گفٹ ہے۔“

”میں نے پوچھا کیا؟“ وہ بولے۔ ”یہی تو سرپرائز ہے۔ بس تم جاؤ اور جا کر اپنا اور اپنی مسز کا پاسپورٹ بناؤ۔ اب دیکھیں تمہارے نام کا قرحہ کہاں کا نکلے اور تمہارا مینی مومن او پروالے نے کہاں پلان کیا ہو۔“

نصیر احمد نے مجھے بتا دیا۔ یہ بات میرے لیے بھی خوشی اور سانس کی تھی۔ اور اس کا جواب ہم دونوں کو معلوم نہ تھا اس لیے ہم نے بس خاموشی سے پاسپورٹ بننے کی سرکاری دکان غازی کارروائی مکمل کروائی اور گھر واپس آ گئے۔



”عصمہ!“ رات کو نصیر احمد نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر کے توجہ میری طرف کی۔

”ہاں کہو۔“ میں جوٹی وی پر اپنا فوٹو پروگرام دیکھ رہی تھی۔ ٹی وی بند کر کے اسے دیکھنے لگی۔

”تمہارا کیا دل کرتا ہے کہ ہم کہاں جائیں۔؟“

وہ میرا بازو سیدھا کر کے اس پر اپنا سر رکھ کے لیٹ گیا۔

”ہاں۔ یہ تو سوچنے کی بات ہے۔؟“ میں نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں ہلکی ہلکی پھیرنی شروع کر دیں۔ اب کوئی میرے بے حد قریب ہوتا یا میں کسی کے قریب تو میں اپنا اظہار محبت ایسے ہی کرتی تھی۔ ماما ہوتیں تو میں باتوان کی کنپٹیاں دبائے لگتی یا پھر پاؤں سیدھے کر کے اپنی گود میں رکھ لیتی اور ہولے ہولے دبائے لگتی۔ یہ عادت مجھے چند ماہ سے ہی مجھ میں عود کر آئی تھی۔ ورنہ تو میں بڑی کٹھوردل کی تھی۔ میرا دل کسی ایویں تیویں پر ہلاک ہو جاتا تھا۔

”عصمہ! تمہارے ہاتھوں میں کتنی نرم مٹ ہے؟“

اس نے میرے ہاتھ تمام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیے۔

”ہاں۔ میں جانتی ہوں۔“ میں نے اتر کر کہا۔

”اچھا بڑا اعتماد ہے۔“ وہ گھوم کر الٹا ہو گیا۔ اب ہم دونوں کے چہرے آنسو سانسے تھے۔ وہ کچھ لمبے مجھے دیکھ کر مسکراتا رہا۔ پھر میرے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولا۔ ”ہلکی۔“

”اچھا! اگر ہم لوگ ملا بیٹھ جائیں تو؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”تو..... کیا؟ جہاں بھی جانا ہوگا وہ تو قرعہ اندازی ہی سے معلوم ہوگا۔ ہم کیوں اپنے

خوابوں کو پریشان کریں۔“

اب میں نے بھی اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا دی تھی۔

”ارے۔“ وہ ہنس پڑا۔

”حساب برابر۔“ اس کی ہلکی میری طرف تھی۔ اور میں اقرار میں گردن ہلا رہی تھی۔

”تم ناعصمہ! ذرا بھی نہیں بدلیں۔“ نصیر احمد نے میرے چہرے پر میرا بچپن تلاش

کرتے ہوئے کہا۔

”ایک بار ہم لڑکے کی میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ تم نوران مامی کے ساتھ کہیں سے آ

رہی تھیں۔ میں نے ہٹ لگا کی تو گیند تمہیں لگ گیا۔“

وہ میرے بچپن کا ہی کوئی واقعہ بیان کر رہا تھا۔

”اچھا پھر۔“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”تم ذرا بھی نہیں روئیں اور وہی گیند اٹھا کر میرے قریب آئیں اور بال میرے سینے پر

ماریں، سچ اتنی زور سے کہ اس روز سے آج تک یہاں درد ہے۔“ نصیر نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر

بانیں جانب ٹھیک دل کی جگہ پر رکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”اوں۔ تو یہ خاصا پرانا مرض ہے۔“

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے چھیڑا۔

”بہت پرانا۔ جب تم اتنی سی تھیں۔“

”اور تم۔ تم کتنے بڑے تھے؟“ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کے جرح کے انداز

میں پوچھا۔

”میں تم سے کوئی اتنا بڑا ہوں گا تب۔“ اب کی بار اس نے اپنا ہاتھ کوئی تین فٹ اونچا

کیا زمین ہے۔

”میں تم سے عمر میں بھی بڑا ہوں۔ کوئی سات آٹھ برس۔“ مجھے چپ پا کر اس نے وضاحت کی۔ اور میں اسے غور سے دیکھنے لگی۔ یہ وہی نصیر احمد تھا جو مجھے کبھی ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور آج اس کے ساتھ باتیں کرتا ہنسا سوتا جاگتا یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا۔ ہماری زندگی میں اور کوئی کشش نہ تھی۔ نہ کوئی بے جا کاسیر پانا، نہ گھر میں آسائش و آرائش۔ بے حد سادہ اور آسان سی زندگی تھی۔ مگر کیسی جاذب لگنے لگی تھی۔ ہم کل چار افراد تھے۔ خالہ جان، نسیم، حاجی، نصیر احمد اور میں۔ جن میں سے نسیم باجی تو شام کو واپس اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ اور خالہ جان وہ تو بے حد بے ضرری ہستی تھیں۔ جن کا کام عبادت اور محبت کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ تو بس آتے جاتے مجھے پیار کرتیں اور دعائیں دیتیں۔ لیکن میں نسیم باجی میرے ساتھ کچھ ہاتھ بٹاتیں اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتیں۔ میں اور نصیر احمد۔ جب تک ساتھ ہوتے باتیں کرتے۔ نصیر احمد کی حس مزاح بھی کافی اچھی تھی۔ وہ کوئی نا کوئی چٹکتے بھی سنا سنا کر مجھے ہنساتا رہتا تھا۔

یہ وہی نصیر تھا جسے میں نے کبھی نظریں اٹھا کر بے تکلفانہ گفتگو کرتے نہ پایا تھا۔ اور اب یہ جتنی دیر میرے ساتھ ہوتا۔ میرا ہاتھ تھا۔ رہتا۔ مجھے اپنے زانو پر سر رکھنے کو کہتا۔ یا میرے بازو پر اپنا سر رکھ کے لیٹتا۔ اس کے سارے جذبات اور محبت بس اتنی ہی رومانوی تھی۔ ایک حد ایک دائرہ اخلاق کے اندر۔ اس کے آگے بڑھنے کی کوشش تو اس نے کبھی نہ کی تھی۔ حالانکہ وہ اس کا حق رکھتا تھا۔ میرے اور نصیر احمد کے درمیان ابھی بھی ایک ان دیکھی فاصلہ تھی بلند اور موٹی سی فاصل۔

”عصمہ! تمہیں پتا ہے میں تمہیں کب سے چاہتا ہوں۔ اور کتنا چاہتا ہوں۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔ تم بتاؤ۔“ مجھے اس کی آنکھوں کی یہ شفاف اور شندے پانیوں والی گہری جھیلیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

”شاید تب سے جب ابھی تم نے پاؤں پاؤں بھی چلنا نہیں سیکھا تھا۔“

پتا ہے تم بہت صحت مند اور خوب صورت تھیں، گلابی گلابی سی، اماں کہتی ہیں میں تمہیں کھنٹوں گود میں لیے بیٹھا رہتا تھا۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا۔ نصیر احمد پھر تب سے ہی اماں نے شروع کر دیا تھا۔ نصیر احمد تیری دلہن تو میں عصمہ جیسی لاؤں گی اور میں کہتا تھا میں عصمہ سے ہی شادی کروں گا، ورنہ کروں گا ہی نہیں۔“ وہ خوش ہو کر بتا رہا تھا۔

”اچھا تو تمہاری نیت بچپن سے ہی مجھ پر خراب تھی۔ یعنی تم تو اچھے خاصے گئے تھے۔ وہ

کیا کہتے ہیں، شکل مومنوں اور کثرت کافروں۔“ میں نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے منہ پھیلا کر کہا۔

”میں بد نیت یا بد نظر نہیں تھا عصمہ! بس اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔“ وہ شرمندہ اور سنجیدہ ہو گیا۔

”چلو دل کے معاملے پر تمہارا جرم معاف کیا۔ اور تمہیں باعزت بری کیا۔“ میں نے اس کا جھکا ہوا سراٹھانے کے لیے اس کے چہرے کو اوپر کیا اور اس کے منہ پر بجے ہوئے بارہ دیکھ کر فحش پڑی اور وہ بھی میرے ساتھ ہی ہنسنے لگا۔



ہمارے پاسپورٹ بن کے آگئے تھے۔ بلکہ نصیر احمد کے آفس میں جمع بھی ہو گئے تھے۔ اب نصیر احمد کو ایک بے تابی لگ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت ساری جگہیں تھیں۔ سب سے پہلے تو سوئٹزرلینڈ، پھر ملائیشیا اور تھائی لینڈ وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ میرا دل اور میرے خیالات بالکل کورے تھے۔ اس طرف سوچنے کو میرا دل ہی نہیں کرتا تھا بلکہ سچ کہوں تو نصیر احمد کے ساتھ تھا اتنی دور جاتے ہوئے مجھے الجھن سی ہو رہی تھی اور نا چاہتے ہوئے بھی وجہ کے ساتھ گھومی ہوئی وادی سوات میرے حواسوں پر چھانے لگتی تھی۔ میری آنکھوں کے کونے آج کل گیلے ہی رہتے تھے۔ میرا دل بھی اداس سا تھا۔

”عصمہ بیٹی۔“ شام کو میں اور خالہ باہر باغیچے میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں جب انہوں نے مجھے کہا۔

”بتی خالہ جان۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”مجھے لگتا ہے آج کل تم کچھ اداس سی ہو چاہو تو دو چار روز کے لیے اپنی ماما کے پاس چلی جاؤ۔“ انہوں نے یقیناً میرے چہرے پر میرا دل دیکھ لیا تھا۔

”جی وہ ماما کی طبیعت پتا نہیں کیسی ہوگی؟“ میں نے عجیب سا جواب دیا۔ حالانکہ ماما سے تو میری بلا ناغہ فون پر بات ہوتی تھی اور کئی بار میں اور نصیر احمد جا کے چائے بھی ساتھ پی آئے تھے۔

”تو ایسا کرو تم تیار ہو جاؤ، ویسے بھی نصیر احمد تو اب دو روز کے بعد ہی آئے گا تم یہ دو روز

اپنی ماما کے ساتھ رہ آؤ جا کر۔“ وہ مجھے گم سم دیکھ کر مسکرائیں، نصیر احمد دراصل آج صبح ہی اپنی کسی آئیٹل کانفرنس کے لیے بھورین گئے تھے۔ اس لیے میں بھی تھاتی۔

”بلکہ چلو ہم دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔ مجھے بھی کئی دن ہو گئے، نفیسہ بیگم سے ملے ہوئے۔“ خالہ جان بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

”جی بہتر ہے۔“ میں بغیر کسی حیل و حجت کے تیار ہو گئی۔ نسیم باجی جا کر رکشالے آئیں۔ حالانکہ اب مجھے ڈرائیونگ آتی تھی اور نصیر احمد کی گاڑی بھی گمرہ میں کھڑی تھی۔ مگر میں نے رکشا پر جانا مناسب سمجھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے دو جوڑے ایک ہینڈ بیگ میں ڈالے اور ہم دونوں کچھ ہی دیر میں ماما کے پاس پہنچ گئیں۔

ماما ہمیں یوں اچانک اور ایک ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور نورائیں ماما کا چہرہ تو مارے خوشی کے دکنے لگا۔

”ارے بیٹا! سچ کہیں تو آج ہم نے آپ کو خواب میں بھی دیکھا تھا۔ بالکل اسی طرح سے خاتون خالہ کے ساتھ۔“ وہ میرا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں۔

”ارے ماما آپ تو انہیں خالہ نہ کہا کریں۔“ مجھے آج ان کا نصیر کی والدہ کو خالہ کہنا اچھا نہ لگا۔

”اُدھو تو یہ بات ہے۔“ وہ مجھے سر سے پاؤں تک معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرائیں۔  
”دیکھا نفیسہ بیگم۔ دیکھا آپ تو خواہ مخواہ بیٹا کی فکر کرتی رہتی ہیں حالانکہ بیٹا تو خاصی سمجھ دار ہو گئی ہیں۔“ انہوں نے ماما کو دیکھ کر بھی میری طرف اسی شرارت سے اشارہ کیا۔

”تو ٹھیک ہے نا نورائیں ماما! اگر وہ ان کی عزت اور رتبے کی فکر نہیں کرے گی تو کون کرے گا۔“ میں نے دیکھا میری ماما کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ تب مجھے اپنی ماما پر ٹوٹ کر پیار آیا اور میں ان کے پاس آ کر انکے کندھے سے لگ کے بیٹھ گئی۔



”موصمہ بیٹی! تم خوش تو ہونا؟“ رات کو کھانے کے بعد جب میں ماما کے کندھے دبای رہی تھی تو انہوں نے اچانک ہی مجھ سے پوچھ لیا۔

”جی..... جی ماما۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا۔ مگر جانے کیوں میرے ہاتھوں میں

لرزش سی آگئی تھی۔

”عصمہ! نصیر احمد بہت نفیس انسان ہے اس کی قدر کرنا اور کبھی اس کا دل نہ دکھانا اب جو کچھ بھی تمہارے سامنے ہے اور جو کچھ بعد میں ہونا چاہیے وہ اس نصیر احمد سے ہی متصل ہونا چاہیے۔“ ماما نے میرے ہاتھ تمام کے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا۔

”جی ماما۔“ میں نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”عصمہ! جو لڑکیاں اپنے ماضی اپنے حال کو ساتھ رکھ کے جیتی ہیں وہ کبھی بھی اپنے اصل فرائض منصبی ایمانداری سے ادا نہیں کر سکتیں۔“ وہ میرے چہرے کو اپنی طرف اٹھاتے ہوئے نرمی سے بولیں۔

”تم میری بات کو سمجھ رہی ہونا عصمہ؟“ وہ مجھ سے اقرار ہی نہیں بلکہ یقین دہانی کی خواہاں تھیں۔

”جی ماما۔“ میرے لبوں سے بار بار صرف یہی الفاظ نکل رہے تھے۔

”مجھے تمہاری زندگی کا اطمینان نہیں بلکہ تمہاری ازدواجی زندگی کا اطمینان چاہیے نصیر احمد تمہارا شوہر ہے اور وہ ایک مرد ہونے کی تمام تر جبلت سے بھرپور انسان بھی۔ اسے زیادہ دیر تک آزمائش میں نہ ڈالنا کہ وہ رب العالمین تم سے پھر خفا ہو جائے اس نے تمہیں جی جان سے اپنایا ہے عصمہ! تم بھی اپنے اندر اس کی محبت کو اسی شدت سے محسوس کرو۔“ وہ نرمی سے مجھے سمجھا رہی تھیں اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ آکر یہ مائیں بیٹیوں کے اندر اتنی گہرائی سے کیسے جھانک لیتی ہیں کہ ان سے بیٹیوں کے خواب و خیال تک بھی چھپے نہیں رہتے۔

”جاؤ اب جا کر آرام کرو اللہ تمہارے نصیب میں وہ سارے سکھ اور خوشیاں لکھ دے جو وہ اپنی پسندیدہ بندویوں کے لیے چاہتا ہے۔“ تب میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

”آمین، آمین، آمین۔“

✱ ✱ ✱

رات کو سونے کے لیے اپنے کمرے میں لیٹی تو مجھے عجیب سی وحشت ہونے لگی، اکیلی تو میں برسوں سے اس کمرے میں پہلے بھی سویا کرتی تھی۔ میرا یہ کمرہ وجیہ کے ساتھ شادی سے پہلے جس طرح آراستہ تھا آج بھی بالکل اسی طرح سے تھا اور اب وجیہ کے بعد یہ ہی کمرہ میری پناہ گاہ

میرا مسکن رہا تھا۔ یہاں مجھے کبھی خوف نہیں آیا تھا مگر آج عجیب ہی محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے عشاء کی نماز کے بعد کے اذکار وغیرہ کیے اور بستر پر آگئی۔ چاہا کہ نیند آجائے مگر آنکھیں تو سونے سے صاف انکاری تھیں۔

”کیا کروں؟“ میں نے اپنے اللہ نے والے بے شمار خیالات سے راہ فرار کے لیے سوچا اور اٹھ کر اپنی بک فیلف کی طرف آگئی۔ میری بک فیلف بے شمار ادب پاروں سے آراستہ تھی اور اس میں کئی نامور شعراء کے شعری کے مجموعے بھی تھیں کیوں کی طرح دک رہے تھے۔ مگر کچھ بھی دل نہ بھار رہا تھا۔ شاید میرے اندر اداسی کی ایک دبیز تہ آہستہ آہستہ سے میرے حواسوں کو جکڑ رہی تھی۔ پتا نہیں مجھے کون یاد آ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو موند لیا اور ایڑی چیخڑ پر دیرے دیرے جھولنے لگی۔

”وجیہ!“ وہ چہم سے میری پلکوں تلے اتر آیا۔  
”کیا بات ہے دلنشین! تم اس قدر اداس کیوں ہو کہ تمہارے چہرے کی چمک ماند پڑ کے اس پر زردی چھا رہی ہے۔“ وہ میری ٹھوڑی کو اوپر اٹھائے میری چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”میرا دل پریشان ہے وجیہ!“ میں نے اسے بتایا۔  
”کس بات کی پریشانی؟“ وہ ذرا مسکرایا۔  
”وجیہ! میں اب بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔“ میں نے اپنا حال دل کہنے کی کوشش کی۔

”وجیہ! میں کیا کروں! میں تو ہل صراط پہ کھڑی ہوں۔“ مجھ سے اب اپنی اور بے بسی برداشت نہ ہوتی تھی۔  
”ہل صراط“ وہ لمحہ بھر کو کسی سوچ میں ڈوبا، چند لکیریں ٹھکر کی اس پیشانی پر ابھریں جو جلد ہی زائل ہو گئیں۔

”ہل صراط ہی تو دراصل وہ راستہ ہے جس کے بعد ہر انسان کو منزل نصیب ہو جاتی ہے۔  
دائمی منزل ہمیشہ کا ٹھکانہ۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”مگر اس پر چلنا بہت دشوار ہے یہ راستہ تو تلوار کی دھار جیسا ہے۔“ مجھے لگا کوئی دھار میرے وجود کو چیرتی میری شہ رگ تک آگئی ہو۔  
”یہ تلوار کی دھار دکھائی دیتی ہے، مگر ہے نہیں، تم ذرا حوصلے سے قدم تو بڑھاؤ۔“ اس

نے مجھے آگے کو قدم بڑھانے کی تحریک دیتے ہوئے کہا۔  
 ”میرے پاؤں کے تلوے کٹ جائیں گے۔ میں نہیں چل پاؤں گی۔“ مجھے وہ چمکتی  
 ہوئی دھار خوف زدہ کیے دے رہی تھی۔  
 ”تم آؤ نا میرے ساتھ۔ پلیز میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے ذرا سہارا دو۔“ میں نے اپنا ہاتھ  
 وجیہ کی طرف بڑھایا۔

”مم..... مم..... میں؟“ وجیہ پریشان ہو کر کئی قدم پیچھے کو ہو گیا۔  
 ”کیا ہوا وجیہ! آؤ نا؟“ مجھے اس کے پیچھے ہٹنے پر کوفت ہوئی۔  
 ”میں تمہارے ساتھ اس راستے پر نہیں چل سکتا؟“ وہ اپنی نظریں جھکائے کھڑا تھا۔  
 ”لیکن کیوں وجیہ! تم نے تو کہا تھا ہم جہنم سے مرگ تک کے ساتھی ہیں۔“ میں نے  
 اسے یاد کرانا چاہا۔

”کہا تھا۔ مگر میں عہد پر قائم نہیں رہ پایا“ لہذا اب میں تمہارا ہم سفر نہیں ہوں یہ..... یہ  
 بل صراط تو تمہیں تنہا ہی عبور کرنا ہوگا۔“ وہ ایک وجود سے ہولے میں تبدیل ہونے لگا۔  
 ”لیکن وجیہ! میں تمہارے بغیر؟“ میں نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا تو میرے قدم ہی اپنی  
 جگہ سے نہ ہلے۔

”میرے پاؤں! میرے پاؤں؟“ میں پریشان ہو کر رونے لگی۔ اتنے میں میرے  
 سامنے وجیہ کا ہیولا دھویں میں تحلیل ہونے لگا۔ وہ دیرے دیرے مٹ رہا تھا۔ لیکن اس لمحے مجھے  
 وجیہ کے ہولے سے زیادہ اپنے پاؤں کی فکر تھی۔ میں اپنے پاؤں کو جانے کے صدمے سے بڑھ چلا  
 تھی اور تڑپ رہی تھی کہ میرے پاؤں مجھے واپس مل جائیں۔ وجیہ کہاں غائب ہو گیا۔ دھواں ہو کر  
 ہوا میں پھیل گیا یا آسمان کو پرواز کر گیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ میں تو اگر کوہ کنان تھی تو اسی پر کہ اب  
 میرا کیا ہوگا۔ کیونکہ میرے ارد گرد اک الاؤ تھا جو دہکنے لگا تھا اور سامنے وہی تلوار کی دھار کی طرح  
 چمکتا ہوا ہل۔

”یا اللہ! مجھ پر کرم کر یا الہی! میرے پاؤں لو نا دے تاکہ میں چل سکوں۔“ میں آسمان کی  
 طرف چہرہ اٹھائے گڑ گڑانے لگی تھی اور میرا وجود میرے ٹخنوں پر ڈولنے لگا تھا۔



یہ ایک عجیب ہولناک خواب تھا، جو میں نے جاگتے میں دیکھا تھا۔ یہ خواب اتنا شفاف تھا کہ حقیقت سے بھی نمایاں تھا۔ مجھے اپنے وجود کے ہر ریشے میں سے پسینہ بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں ایسی کیفیت سے دو چار تھی۔ جیسے ابھی ابھی مجھے پر وہ سب پتا ہو، پھر میرا خوف اتنا بڑھا کہ میں رات کے دو بجے اپنے کمرے سے نکل کے ماما کے پاس آ گئی۔

”کیا ہوا، میری جان! خیر تو ہے۔“ جب میں چپکے سے ان کے ساتھ لیٹ رہی تھی تو ایسے جاگ گئیں جیسے سوئی ہی نہ ہوں۔

”ماما! مجھے ڈر لگ رہا ہے؟“ میں نے ان کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔  
 ”لگتا ہے تم نے کوئی برا خواب دیکھا ہے؟“ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر اپنے بازو میرے گرد حائل کرتے ہوئے کہا۔

”جی ماما! میرا الجھاب بھی کانپ رہا تھا۔“  
 ”اچھا تم آنکھیں بند کرو میں آئیہ الکر سی پڑھ کے پھونکتی ہوں۔“ ماما پیار سے بولیں ماما نے مجھ پر کیا کیا پڑھ کے پھونکا مجھے یاد نہیں مگر اس کے بعد فوراً ہی مجھے گہری نیند آ گئی تھی۔  
 ”عصمہ!“ صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو ماما نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔  
 ”جی ماما!“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”آج اپنے ہاتھ سے کوئی صدقہ دو! اور بہتر ہے نصیر احمد کے واپس آنے تک تم اپنا محاسبہ کرو اپنے خوابوں اور خیالوں کا جائزہ لو۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ تب میں بھی اقرار میں سر ہلا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

”ماما! کیا میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں۔ وہ نصیر آئے گا اور میں گھر نہیں ہوں گی تو؟“  
 کچھ ہی دیر کے بعد میں ماما سے پوچھ رہی تھی۔ میری بات سن کر انہوں نے اک گہری سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا، پھر بولیں۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم نے ایسا سوچا، کوئی بیوی اگر اپنے ذہن میں اس سوچ کو بسا کر رکھے کہ جب اس کا شوہر گھر واپس آئے تو وہ خوشدلی سے اس کا استقبال کرے تو یقین کرو اس کے شوہر کے دل میں اس کی محبت اور قدردانیت کو بوجھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے مجھے سمجھا رہی تھیں۔

”اچھا رکھو میں تمہارے لیے کچھ کھانا بنوادوں تاکہ تمہیں جا کر نہ بنانا پڑے۔“ انہوں

نے پیار سے کہا اور نوران مامی کے ساتھ مل کر میرے لیے خود کھانا بنانے لگیں۔

ماما نے بہت ساری چیزیں بنا دی تھیں۔ نصیر احمد کی پسند کے کباب، بریانی اور چنے کی دال کا حلوہ۔ میری ماما نے صرف بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں بلکہ بے حد جلدی بھی بنا لیتی تھیں۔ جبکہ مجھ سے کچن کا کام بہت تیزی سے نہ ہوتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ابا جان مجھے خود چھوڑنے جا رہے تھے۔ وہ بھی بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ جب میں آری تھی تو میری ماما نے مجھے نرمی سے سمجھایا تھا۔

”عصمہ! نصیر احمد کو بے تکلفی کے بجائے دلی محبت اور احترام سے پکارا کرو، اچھا لگتا ہے اور تہذیب یافتہ بھی۔“



شام کو میں نے بڑے اہتمام سے غسل کیا اور اپنی الماری میں سے سب سے اچھا لباس نکال کے زیب تن کیا۔

ہاف دائٹ شلوار، قمیص پر سرخ اور سیاہ بروشیا کا بڑا سا دوپٹہ، یہ جوڑا ابھی میری بری کا جوڑا تھا اور نصیر احمد نے اپنی پسند سے خریدا تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ کر کے میں نے بہت دنوں کے بعد اپنا لیوٹ پر فیم بھی لگا لیا تھا۔ پہلے میں نے اپنے بالوں کو کھلا چھوڑنے کا سوچا، مگر پھر کسی خیال کے آتے ہی میں نے انہیں ہلکی سی چوٹی میں باندھ لیا۔ میں بالکل تیار تھی اور بہت دنوں کے بعد مجھے اپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے کئی بار آنیڈو دیکھا اور ہر بار آنیڈو دیکھتے ہوئے مجھے حیا سی آگئی۔

نصیر احمد اپنے بتائے وقت پر آگئے تھے۔ اتنے لمبے سفر سے آنے کے باوجود ان کے چہرے پر ہنسی تھی اور کچھ وہ مجھے یوں تازہ دم دیکھ کر بھی فریٹ ہو گئے تھے۔ آج تو خالہ جان بھی بہت خوش تھیں اور مجھے کئی بار کہہ چکی تھیں۔

”عصمہ! اسی طرح سے تیار ہو کر رہا کرو، سہاگنیں بنی سنوری ہی اچھی لگتی ہیں۔“ انہوں نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کے مجھے بہت سی دعائیں بھی دی تھیں۔ نصیر احمد آئے تو ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا، بعد میں نسیم باجی قبوہ بنا کر لے آئیں۔

”بیٹا! اب تم لوگ یہ قبوہ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھو، میں بھی اپنے کمرے میں جاؤں گی۔ آج ذرا طبیعت بوجھل سی ہے، میں جلد عشاء کی نماز پڑھ کر سونا چاہتی ہوں۔“ خالہ جان نے کہا تو

نصیر پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا؟“ اماں آپ کو کیا ہو گیا۔ طبیعت کیوں بوجھل ہے؟“ وہ انہیں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”ارے بیٹا کچھ نہیں ہوا مجھے، صرف بڑھا پا ہے، سو بیماریوں کی ایک بیماری“ ایسے میں کبھی طبیعت بوجھل رہتی ہے تو کبھی جسم میں درد، تم میری نگر نہ کرو اور جا کر آرام کرو، اتنا سفر کر کے آئے ہو۔“ انہوں نے بیٹے کے گال محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔



”ہاں تو کیا ہوتا رہا میرے بعد؟“ کمرے میں آ کر نصیر نے مجھے کندھوں سے تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

”سچ بتاؤ یا روایتی بیویوں والا جھوٹ؟“ میں نے قہوے والی پیالیوں کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کے ان کی طرف دیکھا۔

”بیویوں والا جھوٹ کیوں۔ جبکہ ہم تو اچھے دوست ہیں، صرف دوست؟“ نصیر احمد نے تو سادگی ہی سے کہا تھا، مگر جانے کیوں مجھے وہ لفظ دوست اپنے اندر جھنجھکا ہوا محسوس ہوا۔

”بتاؤ نا کیا سوچے لگیں؟“ وہ بیڈ پر بیٹھ کر قہوہ پینے لگے۔

”نصیر! آپ بہت اچھے ہیں۔“ مجھے اور کچھ بھائی نہ دیا تو میں نے ان کی تعریف کر دی۔

”یہ آپ؟“ جناب کہاں سے آ گئے ہماری سچ؟ خیریت تو ہے نا؟“ وہ مجھے کچھ حیرت سے دیکھنے لگے۔

”نصیر! آپ میرے دوست بھی ہیں، مگر.....“ مجھے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اپنے جذبات کی وضاحت کس طرح سے کروں۔

”مگر آپ میرے شوہر ہیں اور بیویوں کو بے تکلف ہونے سے زیادہ اپنے شوہروں کے ساتھ دلی محبت اور احترام کا رویہ بھی اپنانا چاہیے۔“ میں نے ماما کے کہے ہوئے الفاظ کو ہو بہو کہہ دیا۔ وہ چند لمحوں تو سنجیدہ سی شکل کے ساتھ مجھے دیکھتے رہے، پھر زور سے ہنس پڑے۔

”یہ..... یہ تمہیں خالہ جان نے سمجھایا ہوگا؟“ وہ میری طرف اپنی انگلی کیے ہنس رہے تھے۔  
 ”ہاں۔“ میں نے سادگی سے کہا اور پھر چند لمحوں کے بعد میں بھی نصیر احمد کے ساتھ مل کر ہنس رہی تھی۔



میں ناشتا بنا کر ٹرے کمرے میں ہی لے آئی۔ خالہ جان تو نماز فجر کے بعد چائے کے ساتھ رس لیا کرتی تھیں اور پھر ناشتا نہیں کرتی تھیں اس لیے میں اور نصیر ناشتا اکثر کمرے میں کیا کرتے تھے۔

”نصیر! نصیر!“ میں نے ٹرے رکھ کر ہاتھ روم کے دروازے پر ڈر اسٹک دی۔  
 ”نصیر! ناشتا تیار ہے ٹھنڈا ہو جائے گا آپ شیو بعد میں کر لیں پہلے ناشتا کر لیں آکر۔“  
 مجھے واقعی چائے اور اسٹک کے ٹھنڈا ہو جانے کی فکر تھی۔  
 ”اچھا جناب! جو حکم آپ کا۔ وہ فوراً ہی باہر آگئے۔“

”ارے آپ تو شیو بھی کر چکے۔ میں گجی آپ شیو کر رہے ہوں گے۔“ میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ تازہ تازہ شیو کے بعد وہ بے حد اچھے لگ رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ ہی کئی لمحوں تک انہیں غور سے دیکھا تو وہ میری آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے شرارت سے بولے۔

”اور زوجہ محترمہ! کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“ اور میں شرمندہ ہونے کے بجائے اعتماد سے بولی۔

”جس نظر میں محبت کے ساتھ ساتھ دعا بھی ہو وہ لگ کر فائدہ ہی دیتی ہے۔“

”اچھا جی۔ بہت باتیں آگئی ہیں۔“ میری بات سن کر وہ مجھے گھورنے لگے۔

”آپ ہی سے سیکھی ہیں؟“ میں نے مسکرا کر کہا اور چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ناشتا کیا۔ پھر نصیر تیار ہونے لگے میں آگے بڑھی اور وارڈروب میں سے ایک لیگنر تار کے ان کے سامنے کر دیا۔

”آج آپ یہ پہنیں۔“ میرے ہاتھ میں اپنی پسند کی شرٹ تھی۔

”یہ.....“ ڈائٹ اور بلیک لائٹنگ والی شرٹ کو وہ دیکھ کر سوچنے لگے۔ نصیر احمد کو زیادہ تر سفید یا پھر لائٹ کلرز کی پلین شرٹس پسند تھیں۔

”ہاں آپ یہ ہی پہنیں گے۔“ میں نے آگے بڑھ کر ان کے بازو سیدھے کیے۔ اور شرٹ انہیں پہنا کر بٹن بند کر دیے۔

”اب دیکھیں؟“ میں نے انہیں کندھوں سے تمام کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کر دیا۔

”دیکھیں! آپ کتنے اسمارٹ اور ڈیشنگ لگ رہے ہیں۔“ میں نے انہیں تعریفی نظروں سے دیکھا۔

”اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے تو سو فیصد ہی ایسا لگ رہا ہوں گا۔“ انہوں نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

”اچھا اب اگر مجھے موزے بھی مل جائیں تو۔“ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔

”لیس جی‘ موزے۔“ میں نے جھٹ سے دراز میں سے موزے نکال کر انہیں دیے۔ پھر ان کے بوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھے اور جاتے ہوئے انہیں پر فحوم بھی لگایا۔

”میں جی..... یہ آپ کا آفس بیک اور اب آپ جائیں۔“ میں نے ان کا بیک ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

”عصمہ!“ وہ جانے کی بجائے میرا رخ اپنی طرف کر کے کھڑے ہو گئے۔

”جی.....“ وہ مجھے جن نظروں سے دیکھ رہے تھے میری نظریں جھکنے لگیں۔

”تم واقعی بہت اچھی ہو۔“ انہوں نے میرے گال کو ہولے سے اپنے ہاتھ سے چھوا اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

”میں..... اچھی!“ میں نصیر احمد کے پیچھے پورچ تک جانے کی بجائے وہیں بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔

”میں اچھی ہوں۔“ یہ میرا خود سے سوال تھا۔ ”لیکن میں اچھی کیا ہوں؟“ یہ میرے سوال کا پہلا جز تھا۔

”اچھی عورت؟ اچھی دوست؟ یا پھر اچھی بیوی؟“ میرے سوال کے چوتھے جز کی نوک

پر بہت سے کانٹے تھے۔ جو سارے کے سارے میرے دل و دماغ میں اتر گئے۔ اور میں اپنے دونوں پیرد کو دیکھنے لگی کہ ”کیا میرے ٹخنوں کے نیچے میرے پیر سلامت ہیں؟“

✱ ✱ ✱

”نصیر!“ رات کو میں ان سے پوچھ رہی تھی۔

”نصیر وہ ہمارے پاسپورٹس کا کیا بنا؟ کیا ادھر سے ابھی تک کوئی جاب نہیں آیا؟ اچانک ہی مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھ لیا۔

”پاسپورٹ!“ وہ اپنے لیپ ٹاپ پر جھکے کچھ کام کرنے میں مصروف تھے، سر اٹھا کر بولے۔

”ہاں یار! تم نے اچھا یاد کر لیا، ہمارے تو پاسپورٹ گئے ہوئے ہیں اور میں بھول ہی گیا“ انہوں نے لیپ ٹاپ کو بند کیا میری طرف مکمل متوجہ ہو گئے۔

”وہ ہمارے پاس نے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ لگتا ہے وہ بھی بھول گئے ہیں؟ صبح میں ان سے پوچھوں گا۔“ نصیر احمد کو فنی مون یاد آ گیا اور وہ سنجیدہ ہو گئے۔

”اچھا چھوڑو پاسپورٹس کا ذکر اگر کہیں جانا ہو گا تو چلے جائیں گے، تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہم مری چلیں۔“ وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

”مری؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں مری نہیں۔ مری مجھے بہت زیادہ پسند نہیں۔ یہ اتنا سا مری ہے۔“ میں نے ہمیشہ

کی طرح مری سے صرف نظر کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو پھر سوات چلیں۔ سچ سوات کی بات ہے۔ میں ایک بار اپنے کالج ٹرپ کے ساتھ گیا تھا۔“ وہ مجھے بتانے لگے۔

”سوات؟“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور میری رگ و پے میں دریاے سوات کا

پانی جاری ہو گیا۔ تیز بہاؤ کے ساتھ میرے اندر اک سیلاب سا آ گیا۔

”بتاؤ نا سوات چلیں؟“ نصیر احمد مجھے پوچھ رہے تھے اور میں نے۔

”نہیں۔“ کہہ کر اپنی آنکھیں جھکا لیں تاکہ ان کے کناروں سے چھلکتے ہوئے ریلے

میرا کوئی پرنا راز نہ کھول دیں۔

”چلو کوئی بات نہیں، اگر سوات بھی تمہیں پسند نہیں تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ خوابوں کی حسین وادیوں میں چلتے ہیں، جہاں جانے کے لیے کسی پاسپورٹ پر لگے ویزے کی ضرورت ہے اور نہ ہی آفس سے لمبی چھٹی کی۔ اگر ضرورت ہے تو بس نرم نکیوں پر سر رکھ کے آنکھیں موند کے سہانی اور گداز سوچوں کی۔“ نصیر احمد نے مجھے کھینچ کے نیچے پر گرایا اور اپنی ہتھیلیوں کو میری آنکھوں پر رکھ دیا، بڑی ہی نرمی اور محبت سے وہ ہولے ہولے سے کچھ گنگنا رہے تھے۔

تم سے گر دوستی نہیں ہوتی  
زندگی زندگی نہیں ہوتی  
تم تبسم ہو میرے ہونٹوں کا  
بن تمہارے ہنسی نہیں ہوتی  
تیری چاہت میں عبادت ہے  
عشق میں دل لگی نہیں ہوتی

وہ اپنا حال دل سنا رہے تھے اور میرے اندر کے سیلاب پر بند بندھ گئے تھے۔ اب اگر کچھ لہریں دل میں اندر ہی تھیں تو وہ خود تشنہ تھیں۔ جانے کیوں میرے اندر کی طغیانوں کو اب نصیر احمد کی ذات کے کنارے درکار تھے۔ نصیر احمد نے اپنے ہاتھوں کو میری آنکھوں سے ہٹایا۔ اور میرا بازو سیدھا کر کے اس پر سر رکھ کے پرسکون ہو گئے۔

”نصیر!“ میں چند لمحوں کے انتظار کے بعد اٹھی۔

”نصیر!“ میں نے ہولے سے اپنی آنکھیں کھولیں تو دیکھا نصیر احمد کے لیوں پر اک دھیمی سی مسکان تھی اور چہرے پر بلا کا سکون، وہ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی مانند سو رہے تھے۔

”نصیر احمد کو بہت جلد نیند آ جاتی تھی۔“ آج جانے کیوں مجھے ان کی نیند پر غصہ آ گیا۔

جی چاہا کہ انہیں جھنجھوڑ کے اٹھا دوں۔

مگر مجھے ان کے چہرے کا سکون اس وقت اپنے اندر کے تلاطم سے زیادہ عزیز تھا۔ سو میں نے اپنے آپ کو سر زلزل کی اور آنکھوں کو زور سے میچ لیا۔

✱ ✱ ✱

”نصیر! نصیر احمد اپنے آفس کے مقررہ وقت کے ختم ہونے سے قبل ہی آگئے تھے اور مجھے آوازیں دیتے آرہے تھے۔“

”نصیر! ان کی آواز میں ایک عجیب سی لرزش تھی جیسے خوشی کی انتہا کی بدولت انسان اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکے تو آواز رندھ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح سے وہ مجھے لرزتی ہوئی آواز میں بلارہے تھے۔“

”جی نصیر! میں یہاں ہوں؟“ میں جو کچن میں تھی باہر آتے ہوئے بولی۔  
 ”نصیر! میں کتنا خوش ہوں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“ انہوں نے مجھے کندھوں سے تھام کے اپنے سامنے کر لیا۔ انہوں نے آج مجھے ذرا سختی سے پکڑا تھا ان کی انگلیاں میرے کندھوں میں کچھ دھنسی گئی تھیں۔ اور آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ جیسے بہت سارے آنسوؤں کے ہوئے ہوں۔ ”خیر تو ہے نصیر۔“ مجھے ان کے یوں خوش ہونے سے بھی ڈر ہی لگا۔  
 ”نصیر! ہمارے پاسپورٹ پر ویزے لگ کر آگئے ہیں۔“ وہ اپنے جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولے۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ مجھے ان کی خوشی کی سمجھ آگئی تو میں ہنس دی۔  
 ”ہاں۔ ہم جا رہے ہیں؟“ وہ بت بنے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ ”کہاں۔ کیا سوئٹزرلینڈ؟“ مجھے لگا وہ سوئٹزرلینڈ کو بہت آئیڈیل کر رہے تھے ہنسی مون کے لیے تو وہیں کا ویزا لگ جانے پر اتنے جذباتی ہو رہے ہیں۔

”یہ لو خود دیکھو!“ نصیر نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور اپنے کوٹ کی جیب سے پاسپورٹ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ ”کیا ہے نصیر؟“ مجھے ان کے چہرے پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں نے پریشان کر دیا۔ میں نے پاسپورٹ ان کے ہاتھ سے لیے اور کھول کر دیکھنے لگی۔

”عمرے کا ویزا.... وہ بھی براستہ مدینہ۔“ ایک ٹھنڈی سی لکیر میرے سر سے پاؤں تک یوں سرایت کرتی چلی گئی جیسے ہل صراط کی تلوار کی وہ چمکیلی اور تیز دھار۔  
 ’ہائے میرے پاؤں؟‘ میں نے کراہتے ہوئے نصیر احمد کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیے اور میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

”نصیر احمد میرے تو پاؤں ہی نہیں ہیں۔ میں وہاں پر کیسے جاؤں گی۔“



اس رات میں نماز عشاء پڑھ کر مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی تو میرا وجود مجھے ایک بے جان پتھر کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ کسی بھی طرح کے جذبات اور احساسات سے عاری۔

مدینہ منورہ جانے کی وہ آرزو جو بچپن سے میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی کہ کاش میں بھی مدینہ جاؤں اور ان گلیوں اور راستوں کو دیکھوں جہاں میرے پیارے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جالیوں کو اپنی پلکوں سے صاف کروں، میری خواہش تو یہ تھی کہ میری آنکھیں جب ہار گاہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں تو پتھر ہو جائیں، اس نظارے کے بعد کچھ اور نہ دیکھیں، لیکن مدینہ تو ابھی دور تھا۔ میں تو یہیں پر پتھر ہو گئی تھی۔ میرے سینے میں دھڑکتا دل، میرے دماغ میں سنسناتا شعور..... میری رگوں میں بہتا بلوہ، کچھ بھی تو مجھے میرے ہونے کا حس نہیں دلا رہا تھا اور میرے پتھر ہوئے وجود کو اٹھانے والے پاؤں، وہ تو تھے ہی نہیں۔ میرے پاؤں تو پہل صراط کی تلواریں دھار کی اس چمک سے ہی کٹ گئے تھے جو مجھے گزشتہ رات کے خواب میں دکھائی دی تھی۔ میرے سر پر میری بد اعمالیوں کا ایک گھنٹہ تھا۔ جس کے بوجھ سے میری اکثری رہنے والی گردن میرے سینے میں دھنس گئی تھی۔

”موصمہ!“ میں جائے نماز پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی جب نصیر احمد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے بلایا۔

”آؤ اب لیٹ جاؤ، تھک جاؤ گی، پچھلے ڈیڑھ گھنٹی سے تم یوں ہی بیٹھی ہو۔“ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھانا چاہا۔

”میں..... میں دعا تو مانگ لوں، میں نے تو ابھی دعا بھی نہیں مانگی؟“ میں نے بے بسی سے نصیر احمد کو دیکھا۔

”پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے تمہارے آنسو دعا کو ہی تو تھے۔“ انہوں نے میری آنکھیں اپنی

ہتھیلیوں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”کیا میں رو رہی تھی؟“ مجھے حیرت ہوئی کہ میں رو رہی تھی اور مجھے خود اس کا احساس نہ

تھا۔

”آتش عشق ایسی ہی ہوتی ہے، ہمارے باقی سب محسوسات کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے، ہم سے ہمارا اپنا آپ جھین لیتی ہے۔ پھر نہ کوئی آرزو رہتی ہے نہ طلب۔ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو بس اپنے محبوب کی دید کی چاہ، اسے دیکھ لینے کی تڑپ، ہم عجیب ہو جاتے ہیں، اگر ہمیں عشق ہو جائے تو ہمارا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے۔ ہمارا دل، ہماری روح ایک جگہ پر آ جاتی ہیں، یہ دونوں ہماری آنکھوں میں جذب ہو کر صرف آتش بن جاتے ہیں، ایسی آتش جو دیدار یار سے ہی ٹھنڈے پڑتی ہے۔“ وہ میرا ہاتھ تھامے مجھے بیڈ پر لے آئے۔

”چلو اب تم سو جاؤ۔“ انہوں نے میرا سر ہٹکے پر رکھا۔

”نصیر احمد!“ میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”ہاں کہو..... بلکہ اچھا ہے آج تم اپنے دل کی بات مجھ سے کرو۔“ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئے اور ہولے ہولے میرا سر دبائے لگے۔

”نصیر! میں مدینہ منورہ کیسے جاؤں گی۔“ میری آنکھوں میں واقعی شعلے بھڑکنے لگے۔

”میرے تو پاؤں.....“ میں نے اپنے پیروں کی طرف دیکھنا چاہا، ہاتھ نہیں کیوں مجھے

میرے ٹخنوں کے ساتھ پاؤں دکھائی نہ دیے تھے۔

”یہ تمہارا احساسِ ندامت ہے عصمہ اور کچھ نہیں، پاؤں ہیں تمہارے پاس بس اس عظیم سر زمین کو چھونے کی قابلیت نہیں پاری ہو تم..... یہ تمہارا احساسِ گناہ ہے اور سنو! جسے یہ احساس میرا آ جائے اس سے زیادہ خوش بخت کون ہو گا؟“ نصیر احمد نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے، ان کی آنکھیں ختم تھیں۔ میرے اندر شرمندگی کا احساس اور بھی بڑھ گیا۔ میں ان سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ بہت ساری باتیں، بہت سارے اقرار، جن میں یہ اقرار بھی شامل تھا کہ میں ان کی مجرم ہوں۔ بہت بڑی منافق ہوں، میں نے میں نے انہیں.....؟

میں ان سے کہنا چاہتی ہوں، مگر میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ہونٹ، نہ آواز میرا تو پورا وجود ہی اس وقت آکھ بن گیا..... جلتی برقی آنکھیں، اور میں نے نصیر احمد کے چہرے کو اپنی ان آنکھوں میں سمو لیا۔ تب مجھے لگا میرے اندر او لے برسنے لگے ہوں اور میرے

وجود کی آگ ٹھنڈی پڑنے لگی ہو۔ اگلی عمر میری دوسری ازدواجی زندگی کی پہلی مگر حسین عمر تھی۔

❖ ❖ ❖

سعودیہ ایئر لائن کے بونٹک نے ابھی پرنس محمد بن عبدالعزیز ایئر پورٹ کے رن وے کو نہیں چھوا تھا۔ پائلٹ باری باری جہاز کے پروں کو دائیں بائیں جھکا اور اٹھارہ اٹھارہ میٹر شہر جانناں کے چاروں طرف بکھرے چھوٹے بڑے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ”سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک نگاہیں ان میں سے کسی ناکسی پہاڑ پر تو ضرور پڑی ہوں گی۔ ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے گزرے بھی ہوں اور ان پتھروں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم پوسی کا اعزاز بھی حاصل ہوا ہو۔“ میرا ذہن چودہ سو سال پہلے کے مخطروں سے چھلکنے لگا۔ اتنے میں اعلان ہونے لگا۔

”اتر تے وقت اپنا دقتی سامان ساتھ لے جانا نہ بھولیں۔“

”کیا مدینہ آ گیا؟“ میں نے اپنے سینے کے بائیں جانب ہاتھ رکھ کر اپنا دل ٹٹولا۔ وہ بدستور عائب تھا اور میرے سر میں بھی دماغ کی خالی جگہ سائیں سائیں کر رہی تھی اور اس وقت جو کچھ بھی تھا میری آنکھیں ہی تھیں۔

”نصیر احمد!“ میں نے مارے پریشانی کے نصیر احمد کا ہاتھ پکڑ لیا جو ہمارے دقتی بیک سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اپنے بیروں کو دیکھے بغیر درود شریف پڑھتی ہوئی کھڑی ہو جاؤ۔“ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھے جھکی دی۔

”میرا ہاتھ مت چھوڑنا نصیر احمد..... ورنہ میں گر پڑوں گی۔“ مجھے اپنی ٹانگوں میں بے حد نقاہت اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور مجھے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہ مل رہی تھی۔

”تم میرا ہاتھ پکڑے رکھنے کی خواہش کو زندہ رکھنا۔ میں تو اپنے عہد میں کمر اہوں۔“

نصیر احمد نے ذومعنی انداز میں کہا۔ مگر مجھے اس وقت ان کی کسی بات کا مفہوم سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میری سمجھ، میری دانش تو اس لمحے ویسے بھی میرے پاس نہ تھی۔ اگلے چند منٹوں میں ہم محمد بن عبدالعزیز ایئر پورٹ کے شان دار لاناؤنج میں کھڑے تھے۔ اور پھر جلد ہی ایک ٹیکسی میں سوار مدینہ منورہ کی سڑکوں پر دواں دواں تھے۔

”دیکھا اتم مدینے میں آگئی ہو، تم ایسے ہی کہتی رہتی تھیں کہ میں اس لائق کہاں کہ کبھی مدینہ جاؤں۔ میں کیسے جاؤں گی، میرے تو پاؤں ہی نہیں۔“ نصیر احمد مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے سمجھا رہے تھے کہ وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اگر رحمت اللعالمین تھے تو کس طرح۔

”بھئی! کیا تمہیں وہ نعت یاد نہیں؟“ نصیر احمد بڑی ہی عقیدت سے نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے لگے۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے

یہ بڑے نصیب کی بات ہے

میری آنکھیں بھرا آئیں اور ضبط کے باوجود ٹپ ٹپ میرے آنسو گرنے لگے۔ اور میرا دل چل چل کے گواہی دینے لگا کہ یہ بلاوا مجھ جیسی خطا کار کو اللہ ہی کے کرم سے آیا ہے۔ وہ واقعی میری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ جس نے میرے ڈرے سبے دل کی غمی سی آرزو کو اتنی جلدی پورا کر دیا تھا کہ مدینے کو یوں میرے قریب کر دیا تھا۔

مجھے یقین آ گیا تھا کہ مدینہ بھی کسی کلمہ گو سے ہرگز دور نہیں۔ بلکہ اتنا قریب ہے کہ اپنے چاہنے والوں کی سسکیاں اور ہچکیاں رات کے پچھلے پہر سن ہی لیتا ہے۔ میرے آنسو تھے کہ تمہنے میں نہ آ رہے تھے۔ نصیر احمد نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا اور وہ میرے کان میں ہولے سے بولے۔

”اس وقت ان آنسوؤں سے بڑھ کر کوئی نعت نہیں۔ یہ تو کسی کسی کو عطا ہوتے ہیں عصمہ! یہ آنسو نہیں، تمہارا عداوت بھرا دل ہے جو قطرہ قطرہ پکھل رہا ہے۔“ یکا یک پھر مجھے میرا دل یاد آ گیا اور میں ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، جہاں پر لگائے اڑتا ہوا میرا دل مسجد نبوی صلی اللہ علی وسلم کے آس پاس کے گلی کوچوں کو چھنے نکل چکا تھا۔ وہ گلی کوچے جہاں میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطہر و مبارک قدم آیا جایا کرتے تھے اور جہاں کی فضا میں آج بھی میرے پیارے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حبریں پسینے سے مٹک بو تھیں۔

※ ※ ※

ویسے تو ہم مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اذان فجر سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ عقیدت مندوں کے ریلے رنگ و نور کے سیلاب میں لہریں اٹھا رہے تھے۔ محنور بنا رہے تھے اور آخر شب کی

ان سعید ساعتوں میں ساری کائنات اس کے دالان میں سمٹ آئی تھی۔ نصیر احمد مردانہ سائیلز پر اور میں خواتین والی طرف حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کھلنے کے منتظر تھے۔ فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر تک میں بیٹھی حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازوں کو دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتی رہی اور جب حرم کے اندر داخل ہونے کی نوید ملی تو پھر میں فوراً ہی نہ اٹھ سکی۔

میرے گھٹنے، میرے غٹھے اور ہاتھ ہر سب کے سب محن حرم کے ساتھ یوں جڑ چکے تھے جیسے وہ اندر جانے سے روک رہے ہوں اور کہتے ہوں۔

”تم ایک غلاظت کی پوٹ ہو اور وہاں اندر تو پاک صاف، ہاد و ضوابط کو جانے کی اجازت ہے۔ مت جاؤ، تمہارے اندر کی بدیو، تمہارے اعمال کی سڑائد، اندر کے مہکتے اور پاکیزہ ماحول کے قابل نہیں ہے اور پھر تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤ گی۔ کیا کبھی صحابیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اور اعمال صالحہ کو پڑھا تھا تم نے اور کیا تم جانتی بھی ہو کہ ایک مسلمان عورت کی معنی کیا ہیں، تم نے عورت کے کسی بھی روپ میں خود کو کبھی سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینے میں سنوارنے کی کوشش نہیں کی اور چلی ہو روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کرنے۔ اس دربار عالی شان اور اس محبوب خدا کے سامنے جانے کی قابل بھی ہو؟

میرے اک اک مسام سے میرا رواں رواں کھینچنے لگا۔ مجھے کچھ کے لگانے لگا۔ میری آنکھوں میں مزید مریچیں بھر گئیں اور میں ان خواتین کو حسرت سے کھٹکے لگی جواک دوسرے سے آگے بڑھ کر حرم میں داخل ہونے کی کوشش میں مچل رہی تھیں۔ ایک دم سے یہ اتنی ڈیر ساری خواتین جانے کہاں سے آگئی تھیں۔ میں تو وہیں پڑ میر ہو گئی۔

”بیٹی اشو! تم کیوں یہاں بیٹھی ہو، چلو اندر چلو۔“ میرے ساتھ آ کر کھڑی ایک بزرگ خاتون نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے یوں اٹھالیا جیسے میں اپنے وزن پر تھی ہی ہیں، میرا ہوا جیسا ہلکا وجود لمحہ بھر میں ان کے ساتھ بھی ہولیا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔

”جی..... وہ میں؟“ حرم نبوی کے دروازے پر صحن اندر داخل ہونے کے وقت میرے

پیر پھر پتھر کے ہو گئے۔

”گلتا ہے پہلی بار آئی ہو، آ جاؤ، آ جاؤ جگہ گومت۔ یہاں سب برابر ہیں۔ یہ اس نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم..... اس رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے جہاں آنے والوں کے ظاہری رتبے میں کوئی فرق نہیں، البتہ کون، کیا ہے؟ وہ اس مالک کو خبر ہوگی جو ذو الجلال ہے اور

جس کا گھر مکہ میں ہے۔ یہ تو..... آؤ تا تم پریشان کیوں ہو۔“ وہ خاتون جو عمر میں میری ماں کی بھی ماں کے برابر تھیں مجھ سے زیادہ توانا اور چست تھیں وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچ کر اندر لے گئیں اور میں اپنے آپ کو اپنے ہی اندر چھپاتی ان کے ساتھ چلتی گئی۔



وہ بزرگ خاتون میرا ہاتھ پکڑے مجھے کھینچنے لیے جارہی تھیں۔ میری پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اندرونی فرش کو عقیدت سے چومے چلی جارہی تھیں جس پر بھلے اب قیمتی سنگ مرمر جڑا تھا اور دبیز قالین پڑے تھے۔ مگر اس کے نیچے جو مٹی تھی وہ تو وہی مبارک مٹی تھی جس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک پڑتے رہے تھے۔ میں تو بس اسی نسبت سے حرم نبوی کے فرش کو اپنی پلکوں سے صاف کرتی، نگاہوں سے چومتی چلی جارہی تھی، ہوش سے بے گانہ، خرد سے عاری، اپنے آپ میں گمن، درود پاک کا ورد کرتی میں ان مہربان ہستی کے ہمراہ ایک بڑی ہال سے ہوتی ہوئی ایک صحن میں آئی اور پھر ہرے ستونوں کی چھت تلے میں منبر رسول رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑی تھی۔

جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تو مجھے یوں لگا کہ یہاں تو میں صدیوں سے مقیم ہوں، ڈگر گاتے قدموں پر قابو پاتی، کچھ ڈلتی، کچھ کانپتی منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزر کر میں جب روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اوٹ کے سامنے آئی جس کے پار میرے پیارے حبیب احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری آرام گاہ تھی، وہاں آ کر میرے پاؤں پھر میرے نہ رہے اور میں وہیں پر ڈھس سی گئی۔ اپنے اطراف سے بے گانہ جہاں خواتین عقیدت مندوں کے غول ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ رو رہے تھے، ہچکیاں لے رہے تھے۔ سلام پیش کر رہے تھے۔ بے شمار خواتین کے ہاتھوں میں تو جھوٹی جھوٹی کتابیں بھی تھیں جن میں سے دیکھ دیکھ کر وہ دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ میں کھٹی، ناکارہ، تو بس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عقیدت پیش کر کے اور کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ مجھے تو یہ احساس شرمندگی ہی مارے جا رہا تھا کہ میرے دامن میں سوائے گناہوں کے اور کچھ تھا ہی نہیں، میں تو، میں تو اس وقت ایسی حقیر تھی اپنی نظر میں کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت اور عقیدت کا بھی کوئی دعویٰ سچ نہ لگ رہا تھا۔ میں تو اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش میں ایک ستون سے لپک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہاں پر بس میں تھی اور میری کم مائیگی۔

میری نگاہیں مارے شرم کے زمین میں گڑی جارہی تھیں اور میرا آنچل انھوں سے تر ہوا جارہا تھا۔

میں باوجود اپنے اعصاب کی تمام تر قوت کو مجتمع کرنے کے بھی اپنے پونے لے اور پرکونہ اٹھا پارہی تھی۔ اس وقت مجھے عربی کی کوئی بھی دعا یاد نہ تھی جنہیں ماما اور نصیر احمد نے خاص ہدایات کے ساتھ مجھے یاد کروایا تھا۔

میرے لب بھی پتھر کی سلوں کی طرح اک دو بے پر پڑے تھے۔ اور میرا دل میری آنکھوں میں لرزتا ہوا بس درود پاک کا ورد کرتا جارہا تھا اور کبھی کبھی اک لمحے کوچ میں ایک ہنگام لے کر روتے ہوئے معصوم بچے کی طرح کہتا۔

”مجھے اپنی آغوش رحمت میں لیجئے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔  
میری گزشتہ زندگی کے ایام پر نگاہ نہ لیجئے گا سرکار عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔  
بس میری آئندہ زندگی کے شب و روز پر نظر کرم کر دیجیے۔“

میری سفارش، اے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میری سفارش اس رب ذوالجلال کے حضور کر دیجیے گا۔ اور میرے پاس اس وقت نہ کوئی لغت تھی، نہ لفظ، نہ جملے اور نہ ہی اسلوب گفتار، نہ پیرایہ اظہار، بس ایک گہرے سکوت کے بھاری غلاف میں لپٹی کوئی بے نام سی التجا تھی۔ بالکل ماں کی نرم و گرم آغوش میں پڑے بچے کی فوں فوں سے بنتی کہانیوں جیسی۔

✱ ✱ ✱

تقریباً تین گھنٹوں کے بعد میں اور نصیر مسجد نبویؐ کے مین گیٹ پر ملے۔ میں نے دیکھا نصیر احمد کی آنکھیں بھی متورم اور سرخ تھیں۔ وہ بھی تو پہلی بار مدینہ آئے تھے۔  
”آؤ اب کچھ کھالیں۔“ مسجد نبویؐ سے باہر آ کر نصیر احمد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔  
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ میں نے ہنسنے کہا۔

”وہ تو مجھے بھی نہیں ہے، لیکن کیا ہم ان فضاؤں، یہاں کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہوں، بھلے ہمارے شکم کوئی خاص طلب نہیں رکھتے، لیکن کیا ہماری رگوں میں بہتے لہو میں مدینہ منورہ کی سرزمین کی اجناس اور پھل اس کی لالی میں اضافہ کا باعث نہ بنیں۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں مجھے کھانے کی طرف راغب کر رہے تھے۔ میں مسکرا دی، پھر ہم نے ایک قریبی ہوٹل میں ناشتا کیا اور

اپنے ہوٹل آگئے جہاں رات ہم نے صرف اپنا سامان ہی رکھا تھا۔

”چلو اب کچھ دیر آرام کرلو، پھر نماز ظہر سے پہلے پہلے ہم نے حرم واپس جانا ہے۔“  
نصیر احمد نے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”آرام.....!“ میں نے وہاں موجود ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے  
زیر لب کہا، میں اپنے آپ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میں عصمہ احمد..... آج کتنی عام سی عورت لگ رہی تھی۔ نہ میرے رخساروں پر وہ  
قدرتی گلابی چین تھا جس کی بدولت میری سفید رنگت اور بھی حسین دکھائی دیا کرتی تھی۔ نہ میرے  
لیوں پر نرم و ملائم گداز..... نہ آنکھوں میں ہیروں کی سی چمک اور نہ ہی صراحی دار گردن میں تناؤ،  
بلکہ میری گردن تو کندھوں میں دھنسی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور ہونٹوں پر زرد  
چڑیاں..... یہ میرے وجود پر کس کا چہرہ تھا۔ میں اپنے چہرے کو انگلیوں سے چھونے لگی۔ جیسے  
میرے حواس گم ہوں۔ مجھ پر کسی دیوانگی کا دورہ پڑ رہا ہو۔“ نصیر احمد بھی شاید میری کیفیت دیکھ رہے  
تھے۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئے۔

”پریشان کیوں ہو؟“ وہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر مجھے آئینے میں دیکھنے لگے۔ پھر خود  
ہی بولے۔

”یہاں آ کر ہم وہ نہیں رہتے جو ہم خود کو سمجھ رہے ہوتے ہیں، بلکہ ہم وہ ہو جاتے ہیں  
جو ہم درحقیقت ہوتے ہیں۔“

”یعنی.....؟“ میں نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے لگا ہی نصیر احمد کے چہرے پر جما

دیں۔

”یعنی یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں میں سچ اور حق کی تعلیمات، تذریس اور تلقین کی  
تاثیر ابدیک کے لیے بس چکی ہے۔ لہذا یہاں ہم جیسے منافقوں اور دو مونہوں کی اصلیت خود بخود  
ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور بندہ اپنے اندر کو خود بخود داگل دیتا ہے۔“ نصیر احمد نے مجھے آئینے کے سامنے  
سے ہٹا کر بیڈ پر بٹھایا۔ اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرائے۔

”سوچو ذرا..... جب کبھی ہمارا عمدہ اضافی غذا سے بو محمل ہو جاتا ہے۔ تو ہماری طبیعت  
پر کیسی مٹلی سی طاری رہتی ہے اور جب تے ہو جائے تو کچھ ہی دیر میں ہم خود کو کیسے ہلکے پھلکے محسوس  
کرنے لگتے ہیں۔“ انہوں نے ایک بہت ہی سادہ سی مثال سے مجھے بہت گہری بات سمجھا دی۔



یعنی ہماری روح پر جب ہماری بد اعمالیوں، ہمارے جھوٹ اور ملع سازی کا بوجھ بڑھ جائے تو پھر اس کی سیاحتی ہمارے چہروں کو بد نما کر دیتی ہے اور ہمارے اندر کے رنگ باہر پھٹکنے لگتے ہیں۔ میں نے نصیر احمد کی نظروں سے اپنی نظریں چرائیں اور نہانے کا بہانہ کر کے ہاتھ روم میں کھس گئی۔

پھر میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دوبارہ نہ دیکھا۔ بلکہ میری نگاہیں مسلسل میرے اندر پر ٹپک گئیں۔ میں اپنے آپ سے ادب رعیت تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے میرا اندر ہلکا ہو جائے۔  
”نصیر.....“ دوبارہ مسجد نبویؐ جانے کی تیاری کر کے میں نے نصیر احمد کو مخاطب کیا۔

”ہوں..... کہو۔“ وہ یقیناً درد و پاک پڑھ رہے تھے۔ مختصر ایلے۔

”نصیر! یہ رکھ لیں۔“ میں نے اپنی پشت پر چھپایا ہوا ہاتھ ان کے سامنے کر دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ میرے ہاتھ میں ایک ڈائری دیکھ کر کچھ حیران ہوئے۔

”اس میں میرا اصل ہے۔ میری حقیقت ہے۔ میرے اندر کا سارا بوجھ ہے۔“ میں نے

لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

”اچھا! تو میں اس کا کیا کروں گا۔“ نصیر احمد نے اس ڈائری کو نظر انداز کر کے کہا۔

”میں اپنا بوجھ آپ کے ساتھ بانٹنا چاہتی ہوں اور آپ کو اپنا اصل چہرہ دکھانا چاہتی

ہوں۔ آپ یہ ڈائری حرم کے صحن میں بیٹھ کر پڑھنا۔“ میں نے وہ ڈائری زبردستی ان کے ہاتھ میں تھمادی۔

”اور اگر میں کہوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس کے اندر کے اوراق میں کیا ہے تو؟“ وہ

ڈائری کو دوبارہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولے۔

”کک..... کیا..... کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں ایک ہی لمحے میں عرش سے فرش پر آ

گئی۔

”آپ نے یہ ڈائری کب پڑھی اور کیسے؟ یہ تو میں نے بہت سنبھال کر رکھی تھی۔“

مارے شرمندگی کے میرے لبوں سے پورے الفاظ بھی نہ نکل رہے تھے۔

”ہر روز..... ہر لمحہ..... جب بھی تمہاری آنکھوں سے میری آنکھیں ٹکرائیں، تمہارا

اندر لفظ بہ لفظ میرے سامنے آتا رہا۔ تم نے عصمہ! اس ڈائری کو تو بہت سنبھال کے رکھا۔ مگر کاش!

اپنی آنکھوں پر بھی کوئی پردہ گرا لیتیں۔“ نصیر سنجیدہ تھے۔ بے حد سنجیدہ، ان کا لہجہ سرد تھا۔ برف کی

مانند۔

”چلو دیر ہو رہی ہے۔“ پھر وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر چل دیے۔ میں نے ڈائری کو وہیں بیڈ پر رکھا اور ان کے ساتھ چل پڑی۔ مگر اس وقت اتنے تیز قدم تھے کہ میں ان کے ہم قدم نہ ہو سکی۔ پتا نہیں میں کیوں شرمندہ تھی۔ حالانکہ آج تو میں نے خود چاہا تھا کہ وہ مجھے جان لیں۔ ہم حرم میں داخل ہوئے تو نصیر احمد نے لمحہ بھر کورک کے مجھے دیکھا اور پھر بولے۔

”ہماری ملاقات اب بعد از نماز عشاء ہوگی۔ اس سارے وقت میں ہم دونوں سوچیں گے اور حرم پاک سے جب انھیں گے تو کچھ نا کچھ فیصلہ کر کے انھیں گے۔ یہ دہری زندگی اب میں بھی شاید زیادہ دیر نہ گزار سکوں۔“

”معصمہ! ہم رات کو اپنا اپنا حال دل بھی اک دو بے سے کہیں گے اور آرزوئے دل بھی۔“ انہوں نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اتنا کہا اور پھر تیزی سے مردانہ طرف سے حرم کے اندرونی دروازوں کی طرف بڑھ گئے۔



نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد میں ریاض الجنۃ میں آ گئی۔ اور ایک ستون سے لگ کر بیٹھ گئی۔ آج پھر لگا ہیں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مرکوز تھیں اور میں شفقت، محبت، اپنائیت اور لطافت میں گندمی اس فضا میں اپنے پرسکون دل کے ساتھ یہ سوچ رہی تھی کہ حضرت عائشہؓ سے جو روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

”اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ سے بھی زیادہ کر دے۔“ یقیناً یہ اسی دعا کا ثمر ہے کہ ہر مکہ کو مسلمان مدینہ کے خواب دیکھتا ہے۔ مدینہ کی آرزو کرتا ہے اور مدینہ کے لیے زوارہ جوڑتا اور مدینہ کی تمنائے بے تاب سے سرشار رہتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں جھانکا اور اپنا جائزہ لیا کہ کیا میرے دل میں بھی یہاں کی ایسی تڑپ ہے۔ سامنے اس بزرگندہ والے صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے کے سبز تھلیں پردوں پر (وہ اوٹ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوابگاہ اور جالیوں پر خواتین کے حصے کی طرف کر دی گئی ہے اور ایسا اس لیے کیا گیا کہ بعض خواتین عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ادب و احترام کے تقاضوں کو بھول کر بدعات پر اتر آتی تھیں) نگاہ پڑی تو مجھے لگا میرے دل میں اک زلزلہ برپا ہو گیا ہو اور میرا بند بندہ ٹپٹنے لگا ہو۔ میرا دماغ ہمک سے اڑا اور اس فضاے مبارکہ میں کہیں تحلیل ہو گیا۔ میں نے شدت جذبات سے اپنا سر خدائے بزرگ و برتر کے

حضور مجاہدے میں جھکا دیا۔ جس نے مجھے سعادت بخشی تھی کہ آج میں سرکارِ مدینہ کے گھر میں موجود تھی۔

مجھے کچھ یاد نہ رہا تھا کہ صبح میرے اور نصیر احمد کے بیچ کیا طے پایا تھا اور مجھے اپنے ہارے میں کیا فیصلہ کرنا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میں دراصل کیا چاہتی ہوں۔ میں تو بس ریاض الجنۃ میں بیٹھے بیٹھے بہت دور کل گئی تھی۔ میرے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر ہے۔ یقیناً یہ وہ نہیں ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مقدس میں تھا، لیکن اس کی علامتی حیثیت ضرور ہے۔ یہ منبر پورے ایک عہد کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ میں اپنے حواس سے کل کر اپنے خیال میں بہت پیچھے چلی گئی تھی۔

میں عصمہ نصیر احمد جواب تک اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی، اتنی بے قرار ہوئی اس منبر و محراب کو دیکھتے دیکھتے سکنے لگی۔ میرے اندر سلگتی ہوئی کڑیوں سی جلن ابھی اور میری آنکھیں ان کڑیوں کے دھوئیں کے باعث غم ہونے لگیں اور میں جنت سے اتارے گئے اس زمین کے کھڑے ”ریاض الجنۃ“ پر پھر سے مجھ پر ریز ہو گئی۔ میں نے لمحوں میں صدیوں کا جو سفر طے کیا تھا اس نے مجھے ہکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت میں لفظوں کو چننا چاہتی تھی۔ مگر لفظ مجھ سے گریزاں تھے۔

تب آسودگی اور سکون سے لدا خوشبو بھرا ہوا کا ایک جھولکا کہیں سے اندر آیا اور اس منبر کو چومتا ہوا آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ تب میری زبان سے درود و سلام کے جمرے پھوٹ نکلے اور میرا دیراندہ دل ایک مشک بوگونج سے معمور ہو گیا۔

صلو علیہ وآلہ.....

صلو علیہ وآلہ.....

اور ایک سیدھا و شفاف راستہ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے چمکتا دکھائی دیا۔  
بعد از نماز عشاء جب میں حرم سے باہر آئی تو نصیر مجھے بیرونی دروازے کے پاس ہی مل گئے۔ ان کے چہرے پر گواہ بھی سنجیدگی طاری تھی، مگر ان کے لب ایک نرم سی مسکان سے بھی مزین تھے۔

ان کے ہاتھ میں ایک بڑا شاہر تھا۔ جس میں کھانا اور کوئلہ ڈرکس کے ٹن تھے۔ میں سمجھ گئی کہ نصیر ہوٹل جانا چاہتے ہیں، اس لیے وہ کھانا پہلے سے ہی لے آئے ہیں۔ صبح بھی انہوں نے مجھے اسی طرح سے ایک شاہر تھا دیا تھا۔ جس میں بہت سی چیزیں میرے دن بھر کے کھانے کے لیے

موجود تھیں۔ چپس، نمکو، سینڈوچ، چاکلیٹ اور اورنج جس کے ٹن یہ ساری چیزیں میری پسندیدہ چیزیں تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پہلے سے موجود اس شاپر کو دیکھا۔ جو اسی طرح پھولا ہوا تھا۔ نصیر احمد نے بھی صبح والا شاپر میرے ہاتھ میں دیکھا تو پوچھنے لگے۔

”کیا آج تم نے کچھ بھی نہیں کھایا؟“ ان کے انداز میں میرے لیے فکرتھی۔

”میں نے جس بھی پیا تھا اور چپس بھی کھائی تھی۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا، وہ خاموش ہو گئے اور ہم دونوں پھر راستہ بھر کچھ نہ بولے اور اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔

”نصیر احمد! چائے پیئیں گے۔“ میں نے دسترخوان کو پلیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ نصیر احمد بھی کھانے کے بعد چائے پینے کے عادی تھے اور مجھے بھی اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

”ہاں منگوا لو۔“ وہ بگلیہ فولڈر کے بیڈ کی لمک سے سیدھے ہو گئے، میں نے انٹرکام پر دو کپ چائے لانے کو کہا اور پھر نصیر احمد سے اپنے وہ جذبات شیئر کرنے لگی جو آج مجھے دن بھر میں حرم میں محسوس ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی ہی دلچسپی سے میری ساری باتیں سنیں۔

”اور وہ بات جو ہم نے اس وقت کرنے کا طے کیا تھا؟“ نصیر احمد نے اچانک ہی میرے دونوں ہاتھ تمام کے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ انہیں میرا حال دل جاننے کی بہت بے قراری تھی۔

”خود ہی جان لو، میری آنکھیں حاضر ہیں۔ دیکھو کہ میں نے ان اوراق میں اپنے دل کی کون سی بات لکھی ہے؟“ میں نے شرارت سے مسکرا کر کہا اور اپنی آنکھیں اور بھی ان کے سامنے پھیلا دیں۔

”آج نہیں..... آج تم اپنا حال دل خود کہو، یہ میرا دل چاہتا ہے۔“ وہ جذبات سے معمور آواز میں بولے۔

”میرا دل.....؟“ میں نے ان کا ہاتھ تھاما اور اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل پر رکھ دیا۔

”سنو میرا دل کیا کہہ رہا ہے؟“

”گواہی دے رہا ہے کہ میرے اندر ایک آرزو پوری سچائی اور شدت سے بھل رہی ہے اور چاہتی ہے کہ..... نصیر احمد اس کا ہو جائے۔ پورے کا پورا..... اور اپنے دل کا سارا میل اور وہم

صاف کر کے میری پچھلی خطاؤں کو معاف کر کے۔“ میں نے بغیر کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھ کر کہا۔  
 بغیر روئے اور نصیر احمد کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے کے..... حالانکہ میرا جرم بے حد سنگین تھا۔ پھر بھی  
 میں نے نصیر احمد سے کوئی التجا نہ کی تھی۔

”اچھا..... اور وہ وجہ الدین.....؟“ نصیر احمد مسکرائے، ان کی نرم مسکراہٹ بھی مجھے  
 سنگسار کر رہی تھی۔

”وہ میرا ماضی تھا۔“ میں نے نصیر احمد سے نظریں چرائے بغیر کہا۔

”لیکن تمہارے حال میں پیوست تمہارے ماضی ابھی تک۔“

”سب کچھ تھا، اور ضرور تھا، مگر یہاں پر آنے سے قبل تھا۔ اس سرزمین پاک کو چھوئے  
 سے پہلے ہی میرے وہ میرے ٹخنوں سے کٹ گئے تھے۔ جو صرف اور صرف وجہ کی طرف لوٹ  
 جانے کی چاہ رکھتے تھے۔“ میں نے اپنے اندر اعتماد بھرتے ہوئے کہا۔ مگر اب میری آواز میں  
 کپکپاہٹ اور آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

”مگر اب میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہارے اندر وہ نہیں ہے جو تمہارے لہو کے سارے  
 سرخ و سپید جڑوئوں میں شامل تھا۔ جو تمہارے بند بند کی حرارت اور ہر دھڑکن کے ہونے کی وجہ  
 تھا۔“ نصیر احمد کی آواز ٹوٹنے لگی اور ان کا چہرہ ٹھیک میرے چہرے کی طرح زردی مائل سیاہ ہونے  
 لگا۔ ان کے نقوش بھی دبے دبے بھدے ہونے لگے اور وہ ایک مر جھائے ہوئے پتے کی طرح  
 اپنے ہی وجود پر لٹک گئے۔

”نصیر احمد! آپ بھی؟“ میں نے حیران و پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں  
 کندھے تمام کے جھنجھوڑنے لگی۔

”نصیر احمد! کیا آپ بھی میری ہی مانند منافق اور دہرے چہرے کے مالک تھے؟ اور کیا  
 آپ کی وہ محبت اور توجہ بھی جھوٹی تھی جس کا اظہار آپ ہر لمحہ مجھ سے کیا کرتے تھے۔“ مارے دکھ  
 کے میری سانس بند ہونے لگی۔

”تم سے محبت۔“ نصیر احمد نے میری طرف گہری اداس نظروں سے دیکھا۔

”تم سے محبت تو میں اپنے لڑکپن بلکہ بچپن سے کرتا ہوں۔ میری محبت میں کہیں کھوٹ  
 نہیں۔ لیکن میرے عشق کو تمہاری طرف سے ملنے والی منافقت نے حسد کی آتش کے نذر کر دیا تو پھر  
 میں دھوئیں میں بٹ گیا۔ مجھے اپنے چہرے پر چہرہ لگانا پڑا۔“

میں کیا کرتا عصمہ! میں کیا کرتا، میں بھی تو انسان ہی ہوں اور پھر ایک مرد جس کی فطرت میں اپنی عورت پر شراکت کا مطلب ہے، دوسرے کو جان سے مار کے پھانسی چڑھ جانا، مجھ جیسے مرد تو اکثر نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں اور اپنی عورت کو ہی مار ڈالتے ہیں۔

جانتی ہو جب مجھے یہ احساس ہوا کہ تم نے مجھ سے شادی محض اس لیے کی ہے کہ تم وجیہ کو دوبارہ پاسکو۔ تو اس روز میں ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ میرا دل تم سے نفرت پر آمادہ تھا۔ چاہتا تھا کہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں اور اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لوں۔ مگر پھر میری وہ محبت آڑے آ گئی جو مجھے تم سے تھی اور اسی نے مجھے ضبط کا حوصلہ دیا۔ مجھے آس بندھائی کہ شاید میری محبت تمہیں میری طرف دل سے مائل کر دے۔ لیکن تم..... آہ! تم مجھے کھلوتا سمجھتی رہیں۔ نصیر احمد کی آواز ٹوٹنے لگی وہ فرط غم سے رونے لگے، جبکہ میں مارے غیرت کے ان کے سامنے آنکھیں نہ اٹھا پار ہی تھی۔ اور میرے پاس اس وقت اقرار جرم کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔

”میں بھی کیا کرتی نصیر احمد! میرے پاس بھی تو کوئی اور راستہ نہ تھا۔ میں وجیہ کو کھوکھری نہ پار ہی تھی اور اس کی طلب نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔“

”تم سچ کہتی ہو عصمہ! کہ محبت چیز ہی ایسی ہے جسے ہو جائے اسے خود سے بے گانہ بنا دیتی ہے۔ مگر تم نے میرا انتخاب محض اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے کر کے مجھ پر ظلم کیا، بہت سنگین ظلم، تم نے تو مجھے جیتے جی مار دیا۔“

”عصمہ.....!“ نصیر احمد میرے ہاتھوں کی پشت اپنی آنکھوں سے لگا کر رو دیے، سسکیاں لینے لگے۔

”نصیر احمد! میں واقعی بہت بری ہوں۔ میں نے تمہیں دھوکہ دیا۔ مجھے اقرار ہے کہ میں نے وجیہ کو پانے کے لیے تمہارا سہارا لیا اور تمہارے جذبات کو اپنی کھوکھلی محبت کی اداکاری سے پامال کیا۔ میں نے تم سے شادی وجیہ کے مشورے پر کی تھی۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ تم جلد ہی مجھے چھوڑ دو گے جب جانو گے کہ میں ان بھی وجیہ ہی سے محبت کرتی ہوں اور اسے پانا چاہتی ہوں۔“

میں ایک ہٹنا ناز کی طرح اپنے اندر کی غلی باتیں بھی کہے جا رہی تھی۔

”اور میں..... میں تمہیں اپنے ساتھ باندھنے کے بہانے تلاش کرتا رہا، تمہارے سامنے اچھا، اور اچھا بظاہر، تاکہ تمہارے دل سے وجیہ کی تصویر ہٹا کر اپنی لگا سکوں، وجیہ کے ساتھ حسد نے مجھے تمہارا اور بھی گرویدہ بنا دیا۔ تمہیں دوبارہ کھودینے کا احساس مجھے پاگل بنا دیتا تھا اور

میں تمہیں اپنے مزید قریب کرنے کے جتن کرنے لگتا تھا۔“ وہ بھی میرے جیسی کیفیت سے ہی دوچار تھے۔ خود بخود اپنے راز عیال کر رہے تھے۔

”ہم نے اک دوسرے کے ساتھ بہت منافقت کی۔ اک دوسرے کے جذبات کو دھوکہ دیا، ہم دونوں ہی مجرم ہیں۔ سزاوار ہیں اپنے کیے کے۔“ میں نے بہت دیر کے بعد اپنی بیگلی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ بھی اس لمحے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور پلٹنا بھول گئیں۔ ”اور ہماری سزا اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ہم اپنی اپنی محبت ہی کے ہاتھوں مارے جائیں۔“

”یعنی.....؟“ میری اداس اور ویران آنکھیں اسکے سامنے سراپا سوال تھیں۔  
 ”ایسا نہ کہو نصیر..... میں! میں اب کچھ بھی کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ اور تمہیں، تمہیں کھو کر تو میں.....؟“ لفظ میرے ہونٹوں پر ہی پھرانے لگے اور میں زور، زور سے رونے لگی۔  
 ”اب ہمیں سوچنا ہوگا..... اور اپنے اپنے طرف کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ محبت کو، انتظار کی اذیت ناک سولی سے اتارنا ہوگا۔ قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکتی یہ محبت کب تک ہمارے دلوں میں رہے گی۔ اور ہمارے دل بھی آخر کب تک زندہ رہیں گے۔ خود اذیتی کے اس عذاب سے اب ہمیں خود کو نکالنا ہی ہوگا۔

”نصیر! تمہیں لوٹ کر جانا ہی ہوگا۔ وجیہ کی سزا پوری ہو چکی۔“ نصیر احمد نے گہرے اداس لہجے میں کہا اور پھر اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔

”نصیر! میں واپسی کا راستہ بھول گئی ہوں۔ مجھے کہیں اور نہیں جانا۔ وجیہ کی سزا کو مجھے اس کی طرف لوٹا کر جزا امت بدل لو نصیر! ورنہ..... ورنہ میں برزخ سے نکل کر سیدھی جہنم میں جا پڑوں گی۔ میرا حساب کتاب رہنے دو۔ اگرچہ میرا نامہ محبت میری نیت کی کالی سیاہی سے لکھا ہے۔ پھر بھی تم اسے میرے بانیں ہاتھ میں مت دو۔“ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیروں پر رکھ دیے۔

”توبہ کے معنی اور اس کا شعور ابھی تو مجھے نصیب ہوئے ہیں۔ ابھی تو میری معافی اک در کھلا ہے، مجھے اپنی دعائیں آزما لینے دو۔“ میرا جی چاہا میں اپنا سر بھی اس کے قدموں میں رکھ دوں اور اتار دوں اتار دوں کہ میرے دل کی سطح شفاف ہو جائے اور نصیر کو اس میں اپنا چہرہ صاف دکھائی دینے لگے۔

”دعائیں ہی تو آزمانے آیا ہوں یہاں۔ عرضیاں ہی تو پیش کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ رب اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میرے اندر اس آگ کو شعلہ کر دے۔ جس کا نام حسد ہے اور جس نے میری محبت کھلسا کر رکھ دیا۔ التجائیں ہی کر رہا ہوں صبح دشام نبی آخری الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کے توسط سے کہ وہ مہربان، مجھ پر نظر کرم کر دے اور میرے دو چہروں میں سے ایک کو بھسم کر دے..... کہ میں ان دو چہروں کا بار اپنی ایک روح پر محاذ نہیں ڈال سکتا۔“ نصیر احمد نے اپنے پاؤں سیٹھے اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر مجھے اٹھایا اور میرے چہرے پر اپنی زخم زخم رستی ہوئی آنکھوں کو جما کر بولا۔

”عصمہ! میں بھولتا جا رہا ہوں کہ میرا اصل چہرہ کون سا ہے۔ اور مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آتی کہ تمہارا اصل چہرہ کون سا ہے۔ سب کچھ گنڈ ہو گیا ہے۔ سب کچھ۔“ اس کی آواز میں ایک عجیب سا سناٹا اور آنکھوں میں دھشت تھی۔ میں اس وقت اس سے بری طرح ڈر گئی اور میں نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔



اگلے روز مسجد نبوی مکی تو روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہیں ایک ستون سے لگ کر بیٹھ گئی۔ آج میرا دل بہت غم زدہ تھا۔ وہ دل جو کل تک بڑا خوش فہم تھا کہ نصیر سے میں جب کہوں گی کہ میں سچ سچ ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں تو وہ میری ہر خطا کو معاف کر کے مجھے سینے سے لگا لے گا۔ مجھے یہ زعم تھا کہ مجھے پانے کے لیے نصیر میرا ہر جرم، ہر گناہ معاف کر دے گا اور یہ کہ وہ مجھے جس شدت سے چاہتا ہے اس میں اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ بھی تو نہیں کہ مجھے اپنا لے اور اپنائے رکھے، جواب میں میری محبت..... یہ تو اس کی خوش بختی ہوگی۔ کیسا غرور، کتنا تکبر تھا مجھے اپنے آپ پر..... اور اسی تکبر میں مجھے یہ بھول گیا تھا کہ نصیر احمد بھی ایک خوددار انسان ہے۔ غیرت مندی اس کا بھی تو وصف ہے..... اور پھر میں نے اس کی تذلیل میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔ میں وجیہ کے نام کی مالا اپنی سانس سانس میں چپتی رہی اور وہ پھر بھی مجھے معاف کر دے۔

نصیر احمد نے مجھے صاف صاف کہہ دیا۔ اپنا اندر پوری طرح سے مجھے کھول کر دکھا دیا تھا اور اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے طلاق دینے کو تیار ہے۔



جب میں چاہوں، چاہوں تو یہیں پر ہی..... اور چاہوں تو یہیں پر ہی..... اور چاہوں تو  
واپس جا کر، مگر وہ مجھے وجہ کی طرح طلاق نہ دے گا۔ وہ کہتا تھا عورت کو یوں ایک بار میں ہی تین  
طلاقیں دینا اس کی تذلیل ہے اور حکم خداوندی کی سخت نافرمانی بھی۔

وہ مجھے تین طہروں میں طلاق دینا چاہتا تھا، تاکہ اس کے درمیانی وقت میں ہم دونوں  
کے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت ہو اور کیا معلوم کہ ہمیں ہدایت کی راہ دکھائی دے جائے۔ مگر میں نے  
اسے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ میں ایسا نہیں چاہتی۔ پہلے وہ واپس جا کر عمر بھر مجھ سے دور رہے۔ مگر  
مجھے اپنے نام کے ساتھ جزار بنے دے۔

نصیر احمد کی شرافت اور عظمت کہ اس نے مجھ جیسی سیاہ کار کی بات مان لی تھی۔ میں مسجد  
نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ستون سے لپٹ گئی۔ مجھے اس لمحے عرفان صدیقی کی خوب صورت  
نعت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جو میرے حسب حال ہی تھی۔ میرے لب ہولے ہولے ان اشعار کو  
پڑھنے لگے۔

یہ داغ داغ جبیں اور یہ تیری دلیز  
تیرے کرم کے کرشمے تری نظر کا فسوں

ایک بندہ ناچیز راندہ درگاہ  
فلکتہ پا غریب و فقادہ و محو دل

خواب و بے کس و بے چارہ و تہی داماں  
فلکتہ حال و نحیف و نزار و خوار و زباں

میری بیاض عمل نامہ سیاہ کی طرح  
مرے گناہ شمار و حساب سے افزوں

یہ چاہتا ہوں کہ پہنچوں قریب تر لیکن  
قدم اٹھاؤں تو سو بار ڈمک جاؤں

میں کس خیال سے لپٹوں تیرے ستونوں سے  
میں کس طرح تیرے روئے کی جالیاں چوموں

میرے لب میری دھڑکنوں کے ساتھ ملتے رہے اور میں اس ستون سے بھی ذرا دور ہو  
کے بیٹھ گئی۔ مجھے اپنا آپ اس قابل بھی نہ لگ رہا تھا کہ میں یہاں کی کسی دیوار تک کو بھی  
چھوؤں..... مارے شرمندگی و عداوت کے میں وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ جب ایک بے حد  
نجیف و نزار سے خاتون نے آکر میرا کندھا ہلا دیا۔

”بیٹی! مجھے اندر لے چل..... زیارتِ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کروادے۔ میں کب  
سے اپنی نواسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ جانے کہاں ہے..... دیکھ پاکستانیوں کو زیارت کے لیے آواز  
پڑ رہی ہے۔ چل جلدی کر مجھے بھی لے چل، کہیں آج بھی میں محروم نہ رہ جاؤں، کل بھی مجھے  
زیارت نصیب نہ ہو سکی، چل..... اٹھ جانا، جلدی کر۔“ وہ خاتون مجھے اپنے ہاتھ سے اٹھا رہی تھیں۔  
میں اٹھی اور ان کے ساتھ چل دی۔ ڈگمگاتے قدموں اور جھکی چٹکوں کے ساتھ اور پھر جیسے ہی میں  
اندر پہنچی منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو ایک ستون سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔

میرے اندر راک آتش بھڑک رہی تھی اور میں موم کی طرح پگھلتی اور مشقِ خاک کی  
طرح بکھرتی جا رہی تھی۔ وہاں میں ہی کیا میرے ارد گرد ہر ایک کی یہی حالت تھی۔ بلکہ وہ بزرگ  
خاتون جو میرے ساتھ آئی تھیں۔ وہ مجھ سے ذرا آگے ریاض الجنۃ میں سجدہ ریز ہوئی، ہچکیاں لے  
رہی تھیں۔ میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نکٹی۔ جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے کے سامنے  
ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو لفظ ہی نہ ملیں  
یہ سوچتا ہوں کہ مانگوں تو کس طرح مانگوں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم! رحمت کون و مکاں ہے آپ کا نام  
ہر اک درخت کا سایہ، ہر ایک چھت کا ستون

ہر ایک درد کا درماں، ہر ایک غم کی دوا  
ہر ایک آنکھ کی ٹھنک، ہر ایک دل کا سکون

تیرے دامنِ رحمت سے بعید کہ میں  
تیری گلی سے قہی دست لوٹ کر جاؤں

وہ جس کو ساقی کوثر کہا ہے قرآن نے  
میں اس کے شہر میں آ کر بھی تشنہ لب لوٹوں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دہلیز پہ کھڑی ہوں میں  
جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہوں حال دل تو کس سے کہوں؟

حضور بارگہ فیض سے عطا ہو مجھے  
وہ کیف و درد کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

وہ آگ دے کہ پگھل جاؤں موم کی صورت  
حریم دل کو اجالوں مثال شمع جلوں

نگاہ و قلب کی گہرائیاں ملیں مجھ کو  
کہ دل پہ چوٹ بھی کھاؤں تو آہ تک بھی نہ بھروں

مرے دجود کی قاشیں بکھر بکھر جائیں  
میں تیرے شہر کی گلیوں کی دھول بن جاؤں

”اٹھو! اٹھو! آؤ مجھے واپس لے چلو..... وہ دیکھو ساری پاکستانی خواتین چلی گئی ہیں اور ڈیوٹی پر موجودہ عورتیں مجھے بار بار ڈانٹ رہی ہیں، کہتی ہیں جاؤ دیدارِ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کر لیا۔ اب جاؤ تاکہ دوسری خواتین کی بھی باری آئے۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ دو یونیدس ہونٹوں سے لگا لینے سے کبھی صدیوں کی پیاس بجھتی ہے۔ وقت مقرر کر دیا ہے، بھلا عشق بھی جلدی جلدی کیا جاتا ہے۔ نفل تک تو آرام سے پڑھنے نہیں دیتیں۔ اری! پیارے حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار سے بھی ڈانٹ ڈانٹ کر نکالتی ہیں۔ تمہارے سینے میں کیا دل نہیں ہے۔ خود تو ڈیوٹی کے نام پر سردنیراب ہوتی ہیں دیدار کی بہریں اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھواریں لیتی ہیں اور ہم جیسوں کو زور دیر کی خوش بختی بھی سیٹھنے نہیں دیتیں۔

چل اٹھ میری بچی! آ پھر وہیں چل کر بیٹھیں۔ ہمارا حال دل تو پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک وہاں سے بھی پہنچ جائے گا۔ اور ہمارے درود پاک کی آواز تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے بھی سن لیں گے۔“

اماں جی نے پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ٹھیک اس انداز میں واپس مسجد نبویؐ لے آئیں جیسے کچھ دیر پہلے وہاں سے اندر میری حاضری لگوانے لے گئی تھیں۔ میں ان کا ہاتھ تھامے حسرت بھری نگاہوں سے دربارِ نبیؐ سے جدا ہو رہی تھی، کیونکہ کل صبح نماز فجر کے بعد ہم نے مکہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔



اگلی صبح مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز فجر ادا کرنے کے بعد اور رحمتِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ ناز میں الوداعی سلام پیش کرنے کے بعد جب ہم احرام باندھ کر مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے ایئر کنڈیشنڈ بس کی سیٹ کالیورڈ ہاکے اسے کچھ اور آگے کیا، تاکہ کھڑکی سے باہر باآسانی دیکھتی رہوں تو میرے دل نے ہو لے سے کہا۔

کچھ اندازہ بھی ہے کہ وہ سفر کیسا ہوگا؟ اور کچھ خبر بھی ہے کہ ان دونوں موسموں کی شدت کا کیا عالم ہوگا، جب چودہ سو سال پہلے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا کارواں ان پہاڑوں اور گھاٹیوں میں نکلا ہوگا اور ان تھریلی پکٹھڑیوں اور صحرا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاررواں کے پاس کیسا سامان اور زوراء ہوگا؟“

میں نے کھڑکی سے باہر خاکی رنگ کے خشک پہاڑوں کو دیکھا جو اس وقت تیز دھوپ سے تپ کر تانبے جیسے ہو رہے تھے تو ان آسمان کو چھوتے پہاڑوں کی گرمی مجھے اس فل ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بھی پسینہ پسینہ کر گئی۔

اور یہ سوچتے ہوئے کہ ”کیسے میرے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کٹھن راستوں کو عبور کر کے اور جانے کتنی کڑی راتیں اور سخت دن گزار کے مدینے پہنچے ہوں گے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت دو جہاں جھکن سے چور ہو کر کسی جگہ پڑاؤ کرتے ہوں گے تو جانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجوریں اور ستویس سر بھی آتے ہوں گے یا نہیں۔“

”لو عصمہ ایہ سب کھا لو! اور یہ جوس بھی لے لو۔“ نصیر احمد نے جب ایک سرخ تر تازہ سیب اور بخ جوس کا ٹن میری طرف بڑھایا تو میں نے انتہائی شرمساری سے اپنی نگاہیں ان جلتے پتے سے پہاڑوں سے چرا کر اندر موجود لوگوں پر گاڑ دیں جو اپنی سیٹوں کو آرام دہ بنا کر نیم دراز تھے اور اکثر ہماری طرح کھانے پینے میں جت پکے تھے۔

میں نے نصیر احمد کا دیا ہوا سیب اور جوس اس وقت تو اپنے شولڈر بیگ میں ڈالا اور چند لمحوں کے بعد ہی میری نگاہیں مدینہ منور کے گرد احاطہ کیے مقدس پہاڑوں کا بوسہ لے رہی تھیں اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ان سب کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر ساتھ لے جاؤں اور اپنے اندر سمو لوں۔ تاکہ وہاں جا کر جب چاہے بلکیں نیچی کروں اور اپنی دل میں موجود ان نظاروں سے اپنی روح کو تازہ کر لیا کروں، لیکن ایسا کہاں ممکن تھا۔

وہ بھی مجھ جیسی کھکی اور تالاق کا دل..... جہاں دنیا کی ہزار اور محبتوں کے نظارے تھے جو میں نے ایسے ہی خیال کے ساتھ قید کر رکھے تھے۔ سو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ان میں موجود آنسوؤں کو بہنے دیا۔

جگر خراش ہے کچھ اس قدر حدیث و دواع  
یہ سوچتی ہوں چھڑنے کی بات ہی نہ کروں

تری گلی سے جو ٹکلی تو یوں لگا مجھ کو  
کہ عمر بھر کے لیے اپنے گھر سے جاتی رہوں

ہر ایک گام پہ لپکے میرے جگر کا لہو  
ہر ایک موڑ کو اشکوں کے ہار پہناؤں

عطا ہو دولت عرفان و آگہی مجھ کو  
ہزار کوس پہ جا کر بھی تیرے پاس رہوں

”آمین.....ثم آمین۔“ میرا ریشہ ریشہ لرز رہا تھا اور لرزتا ہوا یہی کہہ رہا تھا۔

مدینہ منورہ سے یہ جدائی مجھے دنیا کی ہر محبت کے جدا ہو جانے سے زیادہ اداس اور غم زدہ کیے جا رہی تھی۔ اور میرا روم روم گواہی دیتا جا رہا تھا کہ مجھے اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں اور ان پر یقیناً والدین اور میری اولاد اور میری ہر محبت قربان ہے۔

اگرچہ میں پہلی بار عمرہ کی سعادت کے لیے آئی تھی اور مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی جانب بھی میرا یہ سفر پہلی بار ہی تھا۔ پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان راستوں کے ساتھ تو میرا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ تب ہی تو مکہ سے دو چار کلومیٹر دور ہی جب میری نگاہ بلند پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر پڑی جہاں شہر مکہ کے آثار دکھائی دینے شروع ہو گئے تھے تو ان عام سے رہائشی گھروں کو دیکھ کر ہی میرا ذہن صدیوں پیچھے چلا گیا تھا اور تاریخ کے بے شمار اوراق میرے خیالات پر پلٹنے لگے تھے اور جب تاریخ کا وہ سنہری ورق میرے ذہن کی روح کو چھوتا ہوا میرے سامنے پھیلا جب محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مبارکہ ہوئی تھی تو میں خود خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپانے لگی۔

واقعی اللہ جل شانہ نے اس شہر کو کیسے عظیم اعزاز سے نوازا تھا کہ اسے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت کے لیے منتخب کیا تھا۔ میرے دماغ کی اسکرین پر وہ فلم چلنے لگی جو بچپن سے میری آنکھوں کو دکھائی اور کانوں کو سنائی گئی تھی۔ پہلی جماعت کے اردو کے قاعدے سے لے کر بی اے تک میں نے اسلامیات کو ہی اپنا پسندیدہ مضمون صرف اس لیے رکھا تھا کہ یہ میرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی سیرت سے مزین تھا۔ اس وقت میرا ذہن بہت سے معصوم اور حسین سوالات سے معطر تھا کہ حضرت عبدالمطلبؑ نے کس طرح اپنے پوتے کو ہاتھوں میں اٹھایا ہوگا اور وہ کس طرح سے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے ہوں گے؟

جب انہوں نے آپ کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا ہوگا تو ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک روز یہ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ساہ دو جہاں ہوں گے۔ اور اس روز کا سورج

کس آب و تاب سے نکلا ہوگا اور اس رات کے چاند نے ریگ زار عرب میں اپنے سے لاکھوں گنا حسین چاند کا چہرہ مبارک دیکھ کر کیا محسوس کیا ہوگا؟ خیالات کی رو بہتی گئی اور اس لمحے کا تصور کر کے میرا دل بھرا آیا جس لمحے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دادا کی شفقت سے محروم ہوئے اور پھر نہ ماں، نہ باپ، نہ دادا اور پھر مجھے حضرت ابوطالب کی شفیق، مگر بے خوف اور بڑی شخصیت کا خیال آیا اور میرا دماغ ماضی کی گھنٹہ گریوں پر زمانی اور ترتیب کے بغیر بھٹکتا رہا۔ غار حراء، ابراہیمؑ کا لشکر جبار، حضرت عبدالمطلبؑ کے اونٹ، ابابیلوں کے جھنڈ، کھایا ہوا بکسر، قریش کے مظالم، ابی طالب کی گھائی، صفا کا پہاڑ، مکہ میری نظروں کے سامنے تاریخ میں ڈھلنا رہا اور میں نے دیکھا کھڑکی کے باہر کے مناظر چودہ سو سال پہلے والے نہ رہے تھے۔ بلند و بالا آسمان کو چھوتی جدید طرز تعمیر کے شاہکار، وہ عمارتیں جو اب میری نگاہوں کے سامنے تھیں، انہیں دیکھ کر میرا جی پریشان ہونے لگا اور میں نے بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔

لبیک اللہم لبیک۔

کچھ ہی دیر کے بعد جب ہم حرم کعبہ میں داخل ہو رہے تھے تو میرے سر سے میرا دماغ بھک کر کے نکل چکا تھا اور وہ ساری دعائیں بھی جنہیں میں حج و عمرہ کی کتابوں سے یاد کر کے آئی تھی اور جن کے بارے میں ماما نے بھی خاص تلقین کی تھی کہ جب کعبہ پر پہلی نگاہ پڑے تو یہ دعا پڑھنا۔ اب کعبہ میری نگاہوں کے سامنے تھا اور میں نصیر احمد کا بازو سختی سے پکڑے ہوئے صرف اسے دیکھ رہی تھی۔

میرے سامنے سیاہ قبا میں ملبوس خانہ کعبہ میں موجود تھا اور گواہی دے رہا تھا کہ دنیا بھر میں اس سے عظیم، اس سے حسین اور اس سے عجیب کوئی اور گھر نہیں ہو سکتا۔ وہ گھر جسے اس کے جس بھی دروازے سے اور جس بھی زاویے سے کوئی دیکھے اس کا تمام تر جلال و جمال ایک سادہ کھائی دیتا ہے اور جسے دیکھنے کے لیے کسی شعوری کوشش یا پلاننگ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ تقسی سے سلگتی آنکھیں کسی مقناطیسی کشش کے تحت خود بخود اس کی طرف مڑ جاتی ہیں اور پھر اس کا حصہ بن جاتی ہیں۔

نصیر احمد نے اپنا بازو مجھ سے چھڑا کے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور مجھے خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے جم غفیر کے اندر لے گئے تھے۔

جہاں اگلے چند لمحوں میں ہم بھی اس انسانی ریلے کا حصہ بن کر خانہ کعبہ کے گرد چکر کاٹ

رہے تھے جو یقیناً مدیوں سے یوں اس مدار کے گرد گھوم رہا تھا اور جسے یقیناً دنیا کے ختم ہونے تک یہ سلسلہ جاری رکھنے کا حکم تھا۔



حرم میں خاما ہجوم تھا۔ پھر بھی ہمیں طوافِ وسیعی میں ڈیڑھ گھنٹے سے کم وقت لگا۔ سعی کے دوران بھی میرا ذہن بہت دور کے مناظروں میں کھو گیا تھا۔ جب روتے بلکتے اسماعیل علیہ السلام کو ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے لٹا کر پانی کی تلاش میں حضرت ہاجرہ قریبی پہاڑی صفا تک پہنچیں اور ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی ذی روح پر نظر پڑ جائے جس سے وہ مدد لے سکیں۔ اور شاید کہیں پر پانی نظر آ جائے۔ مگر ان کی نظریں باپوس لوٹیں تو وہ بے تاب ہو کر نیچے اتریں، بے کلی سے اپنی قمیص کا ایک کنارہ پکڑ کر اندوہ و غم کی تصویر بنی دوسری قریبی پہاڑی مردہ پر پہنچیں۔ وہاں بھی خشکی اور دیرانی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اسی بے قراری و بے کلی کی حالت میں انہوں نے سات چکر لگائے۔ ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی کی طرف جب بھی وہ آتیں تو روتا بلکتا بچہ لگا ہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ وہ یہ فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرتیں، تاکہ ان کی نظریں جلدی سے بچے کو دوبارہ دیکھ سکیں۔ ساتویں چکر پر جب وہ مردہ کی پہاڑی پر پہنچیں تو ایک آواز سنائی دی۔ رک کر غور سے سننے کی کوشش کی۔ آواز پھر گونجی، ہاجرہ بے تابی سے بولیں، ”بولنے والے بول، میں نے تیری آواز سن لی ہے۔ اور سن!“

”اگر تو میری کچھ مدد کر سکتا ہے تو کر۔“

فورا ہی ایک نورانی چہرے والا فرشتہ ظاہر ہوا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس کھڑا تھا۔ اسماعیل علیہ السلام پیاس کی شدت سے اپنی نرم و نازک ایڑیوں کو زمین پر رگڑ رہے تھے۔ دیکھا تو وہاں سے ایک پانی کا چشمہ اگلنے لگا تھا۔

ہاجرہ دوڑی دوڑی آئیں اور پانی کے گرد مینڈھ سی بنانے لگیں اور پھر چلو بھر بھر کے مشکیزہ بھرنے لگیں۔ پانی کا چشمہ جوش سے ابل رہا تھا۔ جسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پلایا، تب فرشتے نے کہا۔

”یہ سامنے جو اللہ کا گھر ہے اسے ایک دن یہ بچہ اور اس کا باپ دوبارہ تعمیر کریں گے، کیونکہ اللہ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کرتا۔“



میں صدیوں قبل کے خیالی راستوں سے ملتی تو سعی کا ساتواں چکر پورا ہو جانے کے بعد باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ حالانکہ آج حرم کے ان عالی شان ستونوں کے درمیان ہموار فرش والے راستے پر سعی کرنا کچھ صعوبت کا کام نہیں، مگر پھر بھی میری سانسیں پھول گئی تھیں اور میرا دل اعتراف کر رہا تھا حضرت ہاجرہؑ کی سعی کو اگر اللہ نے یہ عظیم درجہ دے ڈالا کہ اس رسم کو نبھائے بغیر عمرہ و حج کے فرائض پورے نہیں ہوتے تو واقعی ان کی سعی کا یہ ہی درجہ تھا۔ آخر وہ ایک ماں کی تڑپ تھی اور بے قرار دل کی ایک خاموش دعا، ماؤں کی دعائیں کیا مقام درجات رکھتی ہیں مجھے سمجھ آگئی اور ایسے میں مجھے میری ماماشدت سے یاد آ گئیں۔ اور میرے آنسو نکل آئے۔ جب کعبہ کو نگاہوں میں سمو کر اور آب زم زم پیتے ہوئے مقام ابراہیم پر لو اغل کی ادائیگی کے بعد میں نے اپنی ماما اور نصیر کی اماں کے لیے بہت سی دعائیں کیں۔ تب وہ دلوں ہستیاں نور کے ہالوں کی طرح مجھے اپنے آس پاس ہی محسوس ہوئیں۔



دعائیں تو میں نے غلاف کعبہ سے لپٹ کر..... ہجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے اور حلیم میں سجدہ ریز ہو کر بھی بہت کی تھیں۔ بہت روئی تھی، بہت مچلی تھی۔  
 ”میں عصمہ نصیر! اللہ جل شانہ کے سامنے صرف روی سکتی تھی اور کر بھی کیا سکتی تھی میرے پاس تھا ہی کیا۔ اک یہ ہی آنکھوں کا پانی ہی تو تھا جو میری تمام تر آرزوؤں اور خواہشوں کی زبان بنا ہوا تھا اس وقت۔“

”چلو کچھ دیر کے لیے وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ نصیر احمد نے رکن یمانی کے پاس فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا اور ہم دونوں وہاں آ کر بیٹھ گئے۔  
 ”تم نے محسوس کیا کہ عصمہ! کہ کعبہ اللہ میں اک عجیب طرح کا کھوکھوہ ہے۔“ نصیر احمد نے خانہ کعبہ پر اپنی نگاہیں عقیدت و محبت سے جما کر مجھ سے پوچھا۔  
 ”ہاں..... سیاہ مٹلیں لباس میں لپٹی یہ عمارت ایک مرکز ثقل ہے۔ ایک ایسا مرکز ثقل جس کی طرف ساری دنیا کے مسلمان کھینچے چلے آتے ہیں۔“

میں نے دیس دیس سے آئے ہوئے بے حساب مسلمانوں کی طرف دیکھا اس وقت خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے والوں کا خاصا رُش تھا اور اسی طرح سے لاقعدا لوگ وہ بھی تھے جو حرم

میں بیٹھے اک وارنگی سے خانہ کعبہ کو تک رہے تھے۔

”نصیر!“ میں نے بھی اس چوکور سیاہ عمارت پر نگاہیں جمائے جمائے کہا جس کا نام کعبہ اگر تھا تو بالکل درست تھا اور یہ نام دنیا کی کسی اور عمارت کا نہیں تھا۔ نہ ہی ہو سکتا تھا۔

”ہوں۔“ نصیر کی حالت بھی میری حالت سے جدا نہ تھی وہ بھی صرف اور صرف کعبے کو

ہی نگے جارہے تھے۔

”اس پر نگاہ پڑتے ہی روح میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے اور بندگی کا احساس لہو کی ایک ایک بوند میں کسمانے لگتا ہے..... ہے نا؟“

میں نے نصیر کی طرف دیکھے بغیر نصیر سے پوچھا..... یہاں آ کر ہر مسلمان میری طرح سے اور کسی بھی جانب نہیں دیکھ سکتا۔ کعبہ کسی کو بھی اپنے سوا کچھ اور نہیں دیکھنے دیتا۔

”ہاں صنم آ شنادل رکھنے والوں کی جبینوں میں ہی ہزاروں بجدوں کی آرزو مچلے لگتی ہے اور بڑے بڑے تاجروں کے سر خود بخود خم ہونے لگتے ہیں۔“ وہ بھی اس کے سحر میں کھوئے کھوئے سے بولے۔

ہم دونوں دیکھ رہے تھے اور ہماری طرح لاتعداد، بے حساب لوگ دیکھے جارہے تھے..... روشنیوں سے نہائے ہوئے محن حرم کے پتھروں پہنچ اللہ کے سیاہ پوش گھر کا جاہ و جلال ہولے ہولے شفقت، دلیری اور دلداری میں بدلنے لگا تھا اس کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی تھی ہمت بندھا رہی تھی حوصلہ بخش رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رب کریم کا دست عطا پھیلا ہوا ہے اور میزاب رحمت سے پکاراٹھ رہی ہے۔

”ماجک! تجھے کیا مانگتا ہے؟“

”ہنا! تیری حاجت کیا ہے؟“

اور بول کہ میں تجھے دنیا و آخرت کی کن نعمتوں سے مالا مال کر دوں۔“

اور ایسے میں میرا کم حیثیت غریب و نادار دل میرے سینے میں گل گل کے رونے لگا تھا

کہنے لگا تھا۔

”ارے رب کریم! میں تجھ سے کیا مانگوں؟“

کیا کہوں مجھے تو مانگنا نہیں آتا میرے مالک! تو جانتا ہے میری ساری حالتوں سے تو واقف ہے۔ میری سب حاجتوں کی تجھے خبر ہے اور تیرے سوا بھلا کون جانتا ہے کہ میں تو دعا مانگنے کا

حوصلہ اور سلیقہ دونوں ہی گنوا رہی ہوں۔ میں کم مطلقاً گننے کے آداب سے بھی نا آشنا ہوں۔  
لیکن تو تو دلوں لے رہا ہوتا ہے۔ ہماری دھڑکنوں میں بسی تمناؤں سے بھی واقف ہے  
وہ تمناؤں جو لفظوں میں اعلیٰ لے قابل ہی نہیں کہیں اپنے آپ کو تو نے بلایا تھا۔ ہم آگئے ہیں  
یارب!

اب تو جان اور میری رہیں گھٹتے ہیں اس کا بلین ہے کہ میرے در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں  
جاتا۔

اے بن کہے سننے والے اس نے میری دھڑکنوں کی اڑائی کیا ہے۔  
میں اپنی مرضیوں کی پٹلیاں کھول کر کیا کروں گی تو تو جانتا ہے ان پٹلیوں میں کیا ہے  
بس ان پٹلیوں سے میری دعاؤں اور التجاؤں کا بوجھ ہلکا کر دے۔  
اور اپنی رحمتوں اور عنایتوں سے میرا دامن بھر دے  
”وہ جو میرا نہیں ہے اسے میرا کر دے۔“

اس اونچے سیاہ شیلے والے کو جتنے تکتے تھے میں نے نصیر احمد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔  
میں کب سے حطیم میں کھڑی اور انتظار میں تھی کہ نیچے سجدوں میں گزر گزرتے ہوئے  
لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اٹھے تو میں اپنی جبین وہاں رکھ دوں آج حطیم میں کچھ زیادہ ہی رش تھا  
تل دھرنے کی جگہ بھی نہ تھی اندر تو میں جیسے تیسے کر کے کس ہی گلی تھی مگر لٹل پڑھنے کا موقع نہ مل رہا  
تھا..... جہاں میں کھڑی تھی وہیں پر مجھ جیسی کوئی گناہ گار پڑی جانے کب سے سسک رہی تھی۔ میں  
اس کے ہچکولے لیتے وجود کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ اگر یہ اب یہاں سے اٹھے گی تو میں اس کی جگہ  
پر فوراً ہی جھک جاؤں گی..... ادھر میں نے ابھی سوچا ہی تھا کہ اس کے بالکل ساتھ والی خاتون نے  
سجدے سے سر اٹھایا اور مجھے خود پکڑ کر اپنی جگہ پر کھینچ لیا۔ اور میں اس کالی کیلے والے پر صدمہ  
واری جاتی ہوئی سجدے میں جھک گئی۔ وہ واقعی انسان کی شدہ رنگ سے بھی قریب ہے اور دلوں کے  
بہید جانتا ہے اور پھر یہاں پر تو واقعی وہ سانس سانس کے ساتھ سنتا اور جواب دیتا تھا اپنے ہونے کا  
یقین دلاتا تھا۔

دو لٹل پڑھ کر میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو وہ خاتون وہیں حطیم میں ہی ایک کونے  
میں سر دیئے بیٹھی تھی..... میری ایک نظر اس پر پڑی پٹی اور پھر پڑی تو پلٹتا بھول گئی۔ قریب تھا کہ  
میں حیرت سے وہیں پر بے ہوش ہی ہو جاتی کہ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور آ کر مجھ سے لپٹ

مہمی۔

”ولنئیں بی بی۔“ وہ مجھے اپنے سینے کے ساتھ بھیچے ہوئے سسک رہی تھی اور اس کے لیوں سے ایک ہی بات باری باری کھل رہی تھی۔

”قربان جاؤں میں اپنے سوہنے کے۔ جس نے میری دعا کو اتنی جلدی سن لیا مجھ خطا کار کی منت کو رازِ نگاہ نہیں کیا۔ میں ڈار ہو جاؤں اپنے مالک کے اپنے خالق کے جو میری ہر سانس کا غماز کھل ہے۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے تھی جب انسانوں کے اس ریلے نے ہلچل کی اور ہم دونوں ایک ہی دھکے کے ساتھ حطیم سے باہر آ گئیں۔ یقیناً وہ دعا پوری ہو چکی تھی جس کی قبولیت کے نتیجے میں ہم دونوں اس وقت حطیم میں اکٹھی ہوئی تھیں۔

اس کے وقت میرے سامنے شموں تھی مارے خوشی اور حیرانی اس کا برا حال تھا اس کے لب کپکپاتے..... وہ میرا نام لیتی اور پھر خانہ کعبہ کے غلاف کو چومنے لگتی..... اور میں اس سے زیادہ حیران فقط اپنے لرزتے وجود کو سنبھالے کبھی اسے دیکھتی اور کبھی مہربان گھر کو..... جو میری طرف دیکھ مسکرا کر دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

”میرے لیے چمڑے ہوؤں کو ملانا کیا مشکل ہے۔ بے شک میں ہی جدا کرتا ہوں اور پھر میں ہی ملا دیتا ہوں..... کس کو کب اور کیوں؟ یہ میری مرضی؟“ کعبہ اپنی شان و شوکت کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا اور میں اس کے پرسکون سائے میں کھڑی شموں کو دیکھ رہی تھی..... شموں! جو اس وقت اپنی متورم اور حلقوں والی آنکھوں کے باوجود بے حد پرکشش اور حسین دکھائی دے رہی تھی سفید احرام کے ہالے میں اس کا چہرہ بالکل نور کے ہالے میں مسکراتے ہوئے چاند جیسا دکھائی دے رہا تھا۔

※ ※ ※

کچھ دیر کے بعد میں، شموں، نصیر اور فضل بھاجی حرم کے اوپری حصے میں بیٹھے تھے۔ فضل بھاجی نے دائرہ رکھ لی تھی ان کا چہرہ اور بھی شفیق نظر آتا تھا وہ چہرے پر ہلکی ہلکی مسکان لیے حرم کو نکلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”یہ سب اسی کلمے والے کی کرم نوازی ہے۔ یہیں پر میں نے اپنا دل اس سوہنے سرکار

کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا میں اپنا دل اپنی نوک زبان پر نہ بھی لاتا تب بھی رب سچے نے جان ہی لیتا تھا۔

بس یہ میرے آقا ہی کی محبت ہے۔ اسی کا کرم ہے کہ میری بات بن گئی شموں کی خواہش میرے لیے بس ایک دعا بن کر رہ گئی تھی..... میں نے تو ڈھنگ سے مانگا بھی نہ تھا۔ بس اس رحمتوں والی سرکار نے پھر بھی مجھے نوازا دیا۔“

فضل بھابی کی آنکھوں سے نذرانہ عقیدت کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے اور شموں کے ہونٹ تھر تھراتے ہوئے سسکیاں چھوڑ رہے تھے۔

”میں نے شموں کے سامنے اپنا دامن نہیں پھیلایا تھا کیوں شموں۔“ وہ لمحہ بھر کو اپنی نگاہ کعبہ سے ہٹا کر شموں پر ڈالتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”مجھے کچھ خبر نہیں دلشیں بی بی! میرے ساتھ کیا ہوا؟ میں تو کسی اور کی طلب میں بھٹک رہی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا من اور تن سب کسی اور کا ہے اور میں سوائے اس کے کسی کے نام کا سرخ جوڑا نہ پہنوں گی..... لیکن کب میری محبت کا مدار بدل گیا کب میری نگاہوں کے زاویے فضل پر مرکوز ہو گئے مجھے کچھ خبر نہیں یہ سحر تھا یا کوئی مگھڑا عمل میرا جی لاڈی سائیں سے ہٹ کر فضل کا مداح ہو گیا لبالب بھر گیا اس کی محبت سے اور اتنا بے کل ہو گیا کہ ایک روز میں اس کے قدموں میں جھک گئی میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ میں اسے کہتی..... مجھے اپنا لو..... میں تو اس کے بغیر اتنی اداس ایسی تھی اور ادھوری ہو گئی تھی کہ میرا سارا وجود دیمک لگی لکڑی جیسا بے وزن اور کھوکھلا ہو کر رہ گیا تھا۔“

شموں نے فضل کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اس کی نظروں میں اس وقت جو محبت تھی وہ عقیدت اور ادب کی نمی سے لدی پھندی تھی جیسے وہ فضل کی محبوبہ نہیں بلکہ مرید ہو میری عقل، میری دانش اور میرا دل حیرانی سے اسے تکتے ہوئے انگشت بدنداں تھے وہ میرے سامنے اک معجزے کی طرح بدلی ہوئی بیٹھی تھی یہ کیا تھا کیا صرف فضل کی دعا کی گہرائی اور شدت تھی یا اس کے دل میں لگی آتش کا سینک جس نے شموں کا دل موم کی طرح پگھلا کر اس میں رکھے ہوئے معبدوں کی صورت بدل ڈالی تھی۔

”اور وجہ؟ وجہ کیا ہوا؟“ نادانستہ ہی میرے لبوں سے نکل گیا۔

”وجہ سائیں کی حالت تو ہم سے بھی بری ہو گئی تھی وہ تو کھلے ہوئے تھے ملک بن گئے

تھے یہاں، یہاں پڑے رہتے تھے دن رات۔“  
 فضل نے ذرا قاصدے پر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے ایک ستون کی نشاندہی کی میں نے  
 دیکھا وہاں پر اب بھی ایک دیوانہ بیٹھا وارثی شوق سے کبچہ کو تک رہا تھا..... ہوش سے بے گانہ اور  
 خرد سے عاری۔

”سائیں تو بس روتے رہتے تھے ان کی ہچکیاں کسی ہل نہ رکھتی تھیں۔ وہ اپنے سینے کو اکثر  
 اپنے ناخنوں سے کھرچتے اور کہتے تھے..... فضل! میرے اندر بڑی آگ ہے میرا کلیجہ جلتا ہے مجھے  
 قرار نہیں ہے میری جان کو بڑی اذیت ہے میں کیا کروں؟“ فضل کی آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی  
 میں اور بھی روانی آگئی۔

”وہ یہاں سے اٹھتے تو خلاف کعبہ سے جا لپٹتے..... بس اور کہیں تو وہ جاتے ہی نہ تھے نہ  
 انہیں بھوک لگتی تھی نہ پیاس۔ میں کھانا کھلاتا جو سلاٹا مگر سب کچھ پڑا کا پڑا رہتا..... اگر کبھی منہ میں  
 کچھ ڈالتے تو دو تین کجوریں اور جا کر وہاں مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر آب زم زم پیتے اور  
 دعا کرتے میرے اللہ! میرے سینے کو ٹھنڈا کر دے..... پھر اٹھتے اور وہاں سعی کے مقام پر کھڑے ہو  
 کر کعبہ رخ نکلتے جاتے اور روتے جاتے تھے کہتے جاتے یا حی یا قیوم میری پیاس کو بھی بجھا دے اسی  
 طرح جیسے کہ تو نے اسماعیل کی پیاس بجھائی تھی۔“ اور پھر مجھ سے لپٹ کر سکنے لگتے۔

”فضل! اسماعیل کی عظیم ماں نے تو اپنے بچے کی پیاس سے تڑپ کر یہاں سات چکر  
 کاٹے تھے مگر میری ماں؟ کتنا بد نصیب ہوں میں کہ میرے ماں کو تو کبھی میری محبت نے اتنا بھی نہیں  
 تڑپایا کہ وہ میری خاطر کبھی دو نفل نماز پڑھ کر دعا کرتی ہو ماؤں کے بہت سے فرائض ہوتے ہیں  
 بہت ذمہ داریاں ہوتی ہیں اپنی اولاد کے لیے کاش میں بھی ایک سچی مسلمان ماں کا بیٹا ہوتا۔ کاش  
 میری ماں نے بھی میری بھوک مٹانے کے لیے ہادو ہو کر مجھے اپنا دودھ پلایا ہوتا کاش! ایسا ہوتا تو  
 میں کبھی کسی اور چیز کو تو منہ نہ لگاتا۔“ وہ اپنی ماں کا گلہ مجھ سے کرتے اور پھر اپنے گناہوں کی معافی  
 مانگتے مانگتے بے حال ہو جاتے۔ وہ قابل رحم اور قابل عبرت بن کر رہ گئے تھے۔

فیض بتا رہا تھا اور میرا کلیجہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹتا جا رہا تھا اس لیے نہیں کہ اس  
 وقت مجھے وجہ کی یاد آ رہی تھی اور اس کی حالت مجھے تڑپا رہی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ اس وقت مجھے  
 اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا مجھے تو اپنے مجذوب ہو جانے کا خوف لرزا رہا تھا خود میرا سینہ بھانبر  
 دینے لگا۔

”اور پھر.....؟“ میں نے کانپتے ہوئے لبوں سے پوچھا۔

”پھر ایک رات وہ وہاں حلیم میں پڑے رہے..... بالکل خاموش اور خشک آنکھوں سے  
”میزاب رحمت“ کو کھتے ہوئے۔ اس رات وہ بے قرار بھی نہ تھے اور اپنا سینہ بھی بار بار نہ مل رہے  
• تھے۔ نماز فجر کے بعد وہ وہاں سے اٹھے اور مجھے کہنے لگے۔ مدینہ منورہ جانے کا انتظام کرو۔

میں نے فوراً ایک ٹیکسی کرائے پر حاصل کی اور ہم مدینہ منورہ آ گئے۔

”اور پھر..... پھر کیا ہوا؟“ اب کی بار نصیر نے پوچھا تھا..... ان کی بار یک سی آواز لگتا تھا

کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی ہو۔

”پھر وہ درود فر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جالیوں کے سامنے جا کر بیٹھ گئے..... میں دیکھتا  
تھا اب ان کے لبوں پر صرف درود پاک کا درود ہوتا اور آنکھوں میں اک التجائسا نسو۔ نہنگی نہ ہی کوئی  
درد، وہ ادب و احترام سے وہاں بیٹھے رہے ہم مدینہ منورہ ویسے بھی پہلی بار نہ گئے تھے بلکہ وہ ہماری  
کوئی پانچویں چھٹی حاضری تھی سرکار مدینہ کے حضور وہ رات ہم دونوں نے ہی اسی حالت میں وہاں  
گزاری..... اور اگلی صبح جب ہم دونوں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلے تو ہماری منزلیں ہمارے  
سامنے روشن تھیں..... میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جی میں شموں کے نام سے اک حیرت خیز پھر سے  
پھیلتی جا رہی تھی اور وہ صنوبی بی بی کا نام لے لے کر کہہ رہے تھے..... میں صنوبی کے لہو کا حساب  
کروں تو وہ خالق آگے میرے حساب آسان کر دے گا۔

ان کے چہرے پر ایک پرسکون و پرکیف مسکراہٹ تھی..... ہم وہیں سے پاکستان چلے  
گئے لاڈی سائیں نے جا کر صنوبی بی بی کے قتل کا اقبال جرم کیا اور خود کو قانون کے حوالے کر دیا اور  
میں جب گھر لوٹا تو شموں میری راہ تک رہی تھی۔

”یعنی..... اس رحمن و رحیم نے تم دونوں پر اپنا کرم کر دیا تھا۔“ نصیر احمد کی فرط جذبات

سے لرزتی ہوئی آواز آئی۔

”ہاں وہ مالک کائنات اور غفور و رحیم اور متین اور قادر اور وہی جانتا ہے کہ ہم سب کے  
لیے کیا بہتر ہے..... ہمارے دلوں پر بھی کل اختیار اسی کا ہے اور کب کس کے دل کی حالتیں بدل  
دے ہم کچھ نہیں جانتے..... ہم جسے اپنا محبوب و معبود مجازی تصور کیے۔ اپنا سب کچھ اس کے نام  
کے بیٹھے ہوتے ہیں وہ تو ہمارا ہے یا نہیں یہ بھی اس کہے کے مالک کو پتا ہوتا ہے۔“ شموں قالین  
سے اٹھی اور جا کر سامنے کی گرل پر جھک گئی۔ سامنے کھڑے اس رعب دار گھر کے حلال کو دیکھنے لگی

”اور ہمارے وہ جذبے وہ ہماری محبتیں جنہیں ہم اپنا اصل اور آخر تصور کیے بیٹھے ہوتے ہیں وہ کب بھر بھری مٹی کی طرح ہمارے دلوں سے بھڑ جائیں، ہم نہیں جانتے۔“ میں بھی اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی اور سامنے کھڑے اس سیاہ چامے میں ملیں عمارت کو دیکھنے لگی جس کی نظریں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور مجھے اپنی طرف بلاتی تھیں اور وہ آگ جو ہمارے سینوں کو جلا جلا کر بھسم کرتی رہتی ہے ہم اسے عشق کے نام سے منسوب کر کے خود کو اپنے سچے عاشق ہونے کی خود فریبی میں جلا کیے کیسے حکمران رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اس لازوال جذبے کے وارث ہیں جو پہلے محبت..... اور پھر عشق کے نام سے منسوب ہوتا ہے..... حالانکہ وہ جذبے تو اکثر بے حد سطحی اور کچے ہوتے ہیں حسد اور بغض کے چند ہی شعلوں سے راکھ ہو جانے والے۔“ نصیر احمد بھی میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

”اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی محبت ہے تو بس یہی ہے جو اس وقت ہم سب کے دلوں میں ہے اور اگر کوئی خوش بخت عاشقوں کی صفوں میں آ جاتا ہے تو اسی سچے سائیں کے کرم سے آتا ہے اور پھر ہم تم جیسا بالکل ایک نکلا اور ناکارہ سا بندہ بھی اتنا خاص اتنا اہم ہو جاتا ہے عشق جیسی نعمت اسے مل جاتی ہے اور وہ..... وہ لاڈلی سائیں جیسا بن جاتا ہے جس کا سینہ جب آتش عشق سے جلا ہے تو پھر اس کے اندر باقی سب بھسم ہو جاتا ہے اگر کچھ رہتا ہے تو فقط اس کا نام اور اسی کی یاد اور پھر ایک شہزادہ اپنے غمیں بستروں سے لکل کر دھوپ اور چھاؤں کی پردا کیے بنا دن اور رات کے تصور کے بغیر بس چکر ہی کاٹتا رہتا ہے اور اسی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔“ فضل بھاجی نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کیا ”اور جب امان پاتا ہے تو جا کر شفقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سائے تلے جا کر پاتا ہے۔“ فضل بھاجی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”سبحان اللہ۔“ شموں کی بلند آواز خانہ کعبہ کے غلاف کو چھونے کے لیے لپکی..... نصیر احمد میرے کچھ اور قریب ہو گئے اور انہوں نے میرے گرد اپنا بازو حائل کر کے میری طرف ایک مٹھی سی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بلاشبہ ہم جیسے کم ظرف کم حوصلہ اور تنگ دل لوگوں کو عشق جیسا اہمzol جذبہ عطا نہیں ہو سکتا ہم تو بس اپنی دنیاوی زندگی کے چار دلوں کے ساتھی کو ہی اپنا محبوب تصور کر لیں اور اس سے کچھ اخلاص کے ساتھ محبت کر لیں تو یہی بڑی بات ہے کسی کو ہم اور کوئی ہمیں معاف کر دے اور ایک عام سا انسان خطا کا پتلا جان کر ہماری خطاؤں سے درگزر کر دے تو بھی ہم باقی ماندہ زندگیوں میں محبت کے



”گوشہ عافیت میں بتا سکتے ہیں۔“

وہ میری طرف معذرت اور محبت کے طے چلے جذبات سے لبریز آنکھیں لیے دیکھ رہے تھے تب میں نے اس مدارِ عشق کو اپنی نگاہوں میں سو کر نصیر احمد کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا جس کے گرد اس وقت دنیا کے کوئے کوئے سے آئے ہوئے مسلمان کسی انوکھی ہی کشش سے بندھے چکر لگا رہے تھے اور جو دنیا بھر کے پرہیزگاروں، عصیاں کاروں، گناہ کاروں، نیکو کاروں، فقیر و بے لواء، غنی و تاجدار سب کے لیے باعثِ رحمت تھا سب کا گوشہ عافیت تھا میں نے اپنا سر نصیر احمد کے کندھے سے لگا کر اس مہربان گھر کو دیکھا تب میرے پرسکون دل نے بے ساختہ کہا

نہ کہیں جہاں میں پناہ ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے غمِ بندہ نواز میں

✱ ✱ ✱

مجھے کتنی اچھی طرح سے یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ وہ جو ہماری تقدیروں کو لکھنے والا ہے وہ اس میں اچھے اور برے وقت کو اگر لکھتا ہے تو اس میں کیا محکمتیں ہوتی ہیں۔ میری زندگی کی کڑی سے کڑی ملتی جا رہی تھی نصیر احمد کے رشتے کو ٹھکرا کر میرا وجہ سے شادی کرنا اور پھر وجہ کے ہاتھوں صوبہ کا قتل اور مجھے اس کا طلاق دے دینا۔ ان میں کیسا مضبوط ربط تھا اور جہاں اس سب کے دوران ہم سب نے کڑے دکھ اٹھائے تھے۔ وہیں پر اس مہربان نے ہم سب کے لیے راحت بھی رکھ دی تھی وجہ کو راہِ ہدایت مل گئی تھی۔ صوبہ قتل ہو کے امر ہو گئی تھی اور مراد جیسے منافق سے بچ گئی تھی۔ شموں کو اللہ نے فضل کی محبت سے فیضِ یاب کرنا تھا اور میں اور نصیر۔

ہم دونوں کو اللہ نے یہ بات اچھی طرح سے باور کرائی تھی کہ ہم دونوں ہی انسان ہیں خطا کے پتلے دونوں میں کیا ان ہیں..... اور دونوں ہی کی محبت کامل نہ تھی جس پر ہم فخر یا تکبر کرتے اور یہ کہ ہم انسان ہیں فرشتے نہیں کسی کی غلطی کو اس کی ذلت بنا کر خود کو عزت و دار تصور کرنا ہماری اوقات نہیں۔ البتہ ہم دونوں کا نصیب ہمارا جوڑا اس نے ہی بنایا تھا اور بے شک بڑا بہترین بنایا تھا اور صد شکر اس کریم کا کہ اس نے ہم دونوں کے دلوں میں اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھر کے پھر اک دو بچ کی محبت میں ڈال دی تھی اور اسی محبت نے مجھے نصیر کے لیے اور نصیر کو میرے لیے بے حد اہم اور معتبر بنا دالا تھا اب ہمارے دل اور ہمارے وجود اک دوسرے کے لیے

گوشہ عافیت تھے۔

”الحمد للہ کہ ہمیں اس ذات باری تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا اور اپنے گھر بلا کر ہدایت سے سرفراز کر دیا تھا۔ بے شک وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔“

مجھے وادی سوات میں موجود لکڑی کی وہ مسجد شہرت سے یاد آئے گی جس کے چٹالوں سے بہنے والے پانی نے میرے اندر کی غلاظتوں کو دھو کر اتنا غلاف کر دیا تھا کہ مجھے اپنے اندر کا چہرہ اب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پرنا لے اب بھی میرے لہو کے ساتھ میری رگوں میں جھرجھریہ رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر حطیم میں نوافل ادا کئے اور غلاف کعبہ کو چوم کے میزاب رحمت کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھا۔

(تمت بالخیر)